استفسارات
و
جوابات

نیاز فتحپوری

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	اصحاب کہف	۳	۱۴	قارون اور اس کی دولت	۱۳۴
۲	کرامات غوث الاعظم	۵	۱۵	مسئلہ معاد	۱۳۸
۳	معجزہ و کرامات سے انکار	۷	۱۶	تفکر فی القرآن	۱۶۹
۴	معجزہ و کرامات	۹	۱۷	سامری	۱۸۶
۵	انسان مجبور ہے یا مختار	۲۵	۱۸	علم غیب	۱۹۳
۶	مذہب و عقل	۳۲	۱۹	حقوق اللہ و حقوق العباد	۲۰۱
۷	طوفان نوح	۴۰	۲۰	وحی کی حقیقت	۲۰۹
۸	خضر علیہ السلام	۴۱	۲۱	تعدد ازواج	۲۱۵
۹	حضرت عیسیٰ علیہ السلام	۵۲	۲۲	دعا اور توبہ	۲۲۰
۱۰	یونس علیہ السلام	۸۸	۲۲	نفس و روح	۲۲۴
۱۱	قرآن اور اس کا جغرافیہ	۹۴	۲۴	مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں	۲۲۴
۱۲	حسنِ یوسفی	۱۰۰	۲۵	لقمان	۲۶۵
۱۳	وہی یوسف وہی افسانۂ حسن	۱۱۳	۲۶	عالمِ برزخ	۲۰۴

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۲۷	یاجوج ماجوج، ذوالقرنین	۲۹۵	۳۶	سیرۃ نبوی	۳۷۱
۲۸	ہاروت ماروت	۳۱۸	۳۷	آدم اور شجر ممنوعہ	۳۷۹
۲۹	کوثر	۳۲۸	۳۸	عقل و مذہب	۳۸۴
۳۰	مسیح کا دوبارہ زندہ ہونا	۳۳۱	۳۹	کیا ہندوستان میں زکوٰۃ ادا کیا جانا واجب ہے	۳۹۴
۳۱	حدیث پر تاریخی و فنی گفتگو	۳۳۷			
۳۲	مذہب و مذہبیات	۳۵۰	۴۰	علامہ مشرقی اور قبلہ کا رخ	۳۹۹
۳۳	امام مہدی	۳۵۷	۴۱	آتش نمرود	۴۰۴
۳۴	نور محمدی اور پل صراط	۳۶۱	۴۲	قرآن و حدیث کی زبان کا فرق	۴۱۲
۳۵	لفظ اُمّی کا صحیح مفہوم	۳۶۶	۴۳	اسلام اور کنیزیں	۴۱۷

٣

اصحاب کہف

بجواب استفسار جناب محمد بخش صاحب۔ آگرہ

اصحاب کہف کی تعداد میں اختلاف ہے بعض کا خیال ہے کہ تین ۳ تھے۔ صاحب معالم التنزیل نے نو ۹ بتائے ہیں لیکن غالب رائے یہی ہے کہ وہ تعداد میں سات تھے۔ بیضاوی میں حضرت علی سے جو روایت اس باب میں نقل کی گئی ہے اس کے الفاظ بھی یہی ہیں کہ "ہم سبعۃ وثامنہم کلبہم" (وہ سات تھے اور آٹھواں اُن کا کتا تھا) تاریخ طبری اور معجم البلدان میں بھی یہی تعداد ظاہر کی گئی ہے۔

اصحاب کہف کے نام بھی تمام تاریخ کی کتابوں میں درج کئے گئے ہیں اور ادنیٰ اختلاف کے ساتھ جس کا تعلق غالباً لب ولہجہ کے اختلاف سے ہے سب نے یہی نام لکھے ہیں۔ نکسلمینا، مرطوس یلیخا۔ دبرنوس مشلینا۔ شاذنوس یلیخا۔ کتے کا نام قطمیر تھا۔

اب رہا یہ سوال کہ اس پہاڑ یا غار کا نام کیا ہے جس میں اصحاب کہف نے پناہ لی تھی۔ اس کے متعلق سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئیے کہ یہ حضرات کس شہر کے رہنے والے تھے۔

یاقوت حموی نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ "الرقیم اسم القریۃ اللتی کانوفیہا

وقیل انہ اسم الجبل اللذی فیہ الکھف۔" (یعنی رقیم اس مقام کا نام ہے جہاں اصحاب کہف رہتے تھے، کہا جاتا ہے کہ رقیم نام اس پہاڑ کا ہے جس کے کہف یا غار میں انھوں نے پناہ لی تھی)۔

آثار البلاد قزوینی میں لکھا ہے:۔ "افسوس مدینۃ مشہورۃ بارض الروم وہی مدینۃ دقیانوس الجبار اللذی ہرب منہ اصحاب الکھف وبین الکھف والمدینۃ مقدار فرسخین والکھف مستقبل بنات النعش لا تدخلہ الشمس۔" (افسوس ارض روم کا مشہور مقام ہے۔ جہاں کے ظالم بادشاہ دقیانوس کے ظلم سے گھبرا کر اصحاب کہف نکل کھڑے ہوئے۔ شہر افسوس اور اس کے غار کے درمیان جہاں انھوں نے پناہ لی دو فرسخ کا فاصلہ تھا۔ یہ غار بنات النعش کے سامنے واقع تھا اور دھوپ اس میں نہ جا سکتی تھی)۔

بہرحال تحقیق سے یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ شہر کا نام افسوس تھا جو ۳۰ درجہ ۵۷ دقیقہ عرض شمالی اور ۲۷ درجہ ۲۱ دقیقہ طول شرقی پر دریائے ایجیین کے کنارے واقع تھا۔ اور اس پہاڑ کو جہاں یہ لوگ چھپے تھے بعد کو اس لحاظ سے کہ وہاں ان کے نام کندہ کر دئے گئے تھے "رقیم" کہنے لگے۔

عہد عتیق کا جغرافیہ جو قدیم تاریخی خریطہ (Ancient Historical Atlas) کے نام سے شائع ہوا ہے اس میں بحر ایجیین کے کنارے آپ کو ایک شہر ایفی سیس (Epiceas) کے نام سے ملے گا یہی وہ شہر ہے جسے افسوس کہتے تھے اور یہیں آپ کو پہاڑوں کا ایک سلسلہ نظر آئے گا جس میں اصحاب کہف چھپے

تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت اس سلسلۂ کوہ کا نام کیا ہے اور وہ مقام غار جہاں اصحاب کہف نے پناہ لی تھی اب بھی محفوظ ہے یا نہیں۔

کراماتِ غوث الاعظم

(جناب سبحان احمد صاحب۔ دہلی)

حضرت غوث الاعظم کے حالات میں ایک عربی کتاب میرے پاس موجود ہے جس میں ان کی کرامات کے عجیب و غریب واقعات لکھے ہیں۔ مثلاً مردہ کو زندہ کر دینا۔ لڑکی کو لڑکا بنا دینا وغیرہ وغیرہ آپ کی اس مسئلہ میں کیا رائے ہے؟

آپ نے جس کتاب میں یہ واقعات دیکھے ہیں وہ غالباً مناقب تاج الاولیاء ہوگی۔ آپ (جیسا کہ آپ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے) ابھی طالب علم ہیں اور آپکو ایسی کتابوں کے مطالعہ میں اپنا وقت ضائع کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس قسم کے تمام واقعات جو اولیاء کرام سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور یہ نتیجہ ہے اس جاہلانہ اعتقاد کا جس کی دنیا میں دور از عقل واقعات کا اظہار ہی بزرگی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ بے علم واعظین اور جاہل درویشوں کو ابلہ فریبی سے کام لے کر اپنے لئے معاش کی راہیں وسیع بنانا تھیں۔ اس لئے

انھوں نے اس قسم کی روایتوں کو رواج دیا اور انھیں میں اب تک رائج ہیں۔ اب کوئی ذی علم انسان ان مزخرفات و خرافیات پر اعتماد نہیں کر سکتا اور مذہب اسلام نے اس قسم کی شعبدہ بازی اور نظر بندی کو ہمیشہ ٹھکرایا ہے۔

جب کفار نے رسول اللہ کے متعلق یہ کہا کہ "لولا انزل علیہ آیات من ربہ" (کیوں نہیں اتاری گئیں اس پر معجزے یا نشانیاں) تو خدا کی طرف سے رسول اللہ کو ارشاد ہوا "قل انما الآیات عند اللہ و انما انا نذیر مبین" کہدو کہ نشانیاں یا معجزے تو خدا کے پاس ہیں میں تو تمہیں علانیہ طور پر ڈرانے کے لئے آیا ہوں ملاحظہ ہو سورۂ عنکبوت آیت ۴۹۔

اسی طرح سورۂ کہف، سورۂ اعراف اور سورۂ بنی اسرائیل میں بھی اس حقیقت کو ظاہر کیا گیا ہے کہ رسول اللہ معجزے دکھانے کے لئے نہیں آئے تھے۔

پھر جب خود بانیٔ اسلام کا یہ مسلک ہے تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ اولیاء کرام سے ایسی خلاف عقل باتیں منسوب کرکے کیوں انھیں رسوا کیا جاتا ہے

آپنے اسی کتاب میں ایک روایت یہ بھی دیکھی ہوگی کہ جب حضرت غوث الاعظم مدینہ منورہ پہونچے اور روضۂ اقدس پر دو شعر پڑھے (جن کو میں یہاں درج نہیں کرتا) تو رسول اللہ کا دستِ مبارک مزار سے باہر آگیا اور جناب غوث الاعظم نے اس کو بوسہ دیا۔ اسی طرح آپنے یہ بھی لکھا ہوا دیکھا ہوگا کہ جو شخص آپ کا نام بے وضو لیا کرتا تھا اس کی گردن قطع ہو جایا کرتی تھی۔ الغرض اس قسم کی لغو باتوں سے یہ کتاب بھری پڑی ہے۔ خدا کے لئے آپ ایسے کسی ابلہ فریب واعظ کو دیکھئے اور خود تحصیل علم میں مصروف رہئے تعلیم پوری ہونے کے بعد آپ خود فیصلہ کرنے کے اہل ہو جائیں گے اور کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہ رہے گی۔

معجزہ و کرامات سے انکار

(جناب محمد زبیر صاحب، مراد آباد)

استفسارات کے سلسلہ میں آپ کی بعض تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اولیاء کرام کی کرامات اور انبیا کے معجزوں سے انکار کرتے ہیں حالانکہ رسول اللہ نبی آخر الزماں کے بہت سے معجزے روایت کیے گئے ہیں اور اسی طرح اولیاء کرام سے خوارق عادات کا سرزد ہونا کتابوں سے ثابت ہے کیا آپ اس مسئلہ میں کوئی مفصل بحث کر سکتے ہیں

میرے نزدیک یہ مسئلہ بھی انھیں مسائل میں سے ہے جو بحث و مباحثہ سے طے نہیں ہو سکتے اور جب تک خود انسان کی عقل سلیم ہادی نہ بنے اس وقت تک کسی اور کی ہدایت کام نہیں دے سکتی۔

آپ نے یقیناً مجھ پر ظلم کیا ہے کہ مجھے کرامات و معجزے کا منکر قرار دیتے ہیں کیونکہ میں ان کا اسی طرح قائل ہوں جس طرح آپ یا کوئی اور البتہ تعبیر میں ضرور فرق ہے، آپ جن باتوں کو کرامات و معجزہ قرار دیتے ہیں وہ میرے نزدیک معمولی اُمور میں داخل ہیں اور میں جن واقعات کو معجزہ و کرامات سمجھتا ہوں وہ آپ کے نزدیک کچھ اہمیت نہیں رکھتے۔

مثلاً رسول اللہ کے ہاتھ میں سنگریزوں کا بولنا اور آپ کی رسالت کی شہادت

دینا آپ کے نزدیک کوئی بڑی بات ہوگی لیکن میں اس کو نہایت معمولی بات قرار دیتا ہوں۔ اسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ رسول اللہ کا سب سے بڑا معجزہ آپ کا اخلاق اور اسوۂ حسنہ تھا (جس کی مثالیں آپ کی زندگی کے ایک ایک واقعہ سے اخذ کی جاسکتی ہیں اور جس کا مثل انسانی زندگی میں نظر نہیں آسکتا) اور آپ سمجھتے ہیں کہ اس کو کوئی ایسی اہمیت حاصل نہیں۔

میرا اعتقاد یہ ہے کہ ایک رسول یا ولی محض اپنے اخلاق اور عملی زندگی کے مصلحانہ اور ہادیانہ واقعات وحالات کے لحاظ سے رسول یا ولی ہوا کرتا ہے۔ آپ کا ایمان یہ ہے کہ وہ جب تک کوئی شعبدہ نہ دکھائے اور جب تک کوئی ایسا محیرالعقول واقعہ ظہور میں نہ آئے، جو ظاہری اصولِ فطرت اور قوانین مادی کو توڑنے والا ہو اس وقت تک وہ بزرگ، ولی یا نبی ہو ہی نہیں سکتا۔

آپ رسول اللہ کو شاید صرف اس وجہ سے رسول سمجھتے ہوں گے کہ شق القمر کا وقوع آپ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ حالانکہ بہت سے اکابر علما نے اس سے انکار کیا ہے اور میں انھیں صرف اس بنا پر خدا کا پیامبر یقین کرتا ہوں کہ انھوں نے معجزہ پیش کرنے سے انکار کرتے ہوئے صرف یہ کہا ہے کہ "میں تو تمھاری طرح ایک انسان ہوں البتہ میرا کام تمھیں صرف اخلاق کی تعلیم دینا ہے"

اس لئے آپ مجھے کرامات ومعجزہ کا منکر نہ کہیے۔ زیادہ سے زیادہ تاویل کرنے والوں میں شمار کر لیجئے۔

۹

معجزہ و کرامت

(ابوالرضا مولوی ضیاء اللہ خاں صاحب، رام پوری)

آپ کی اس تحریر پر جو کہ دو بارہ معجزات و کرامات مارچ کے رسالہ میں شائع ہوئی تھی میں نے کچھ تنقید و تحقیق کی ہے جو کہ رسالہ "درویش" میں یکم مئی سے زیر اشاعت ہے۔ اب جبکہ مئی کے اواخر میں رسالہ "نگار" موصول ہوا تو آپ کے جوابات نے جو عنوانات "معجزہ و کرامات سے انکار" اور "صدور محال کا امکان" کے تحت درج ہیں مجھ کو عجیب خلجان اور چند شبہات میں ڈال دیا جن کو ترتیب وار عرض کر کے آپ ہی کو روانہ کرتا ہوں تاکہ آپ کو پھر اس شکایت کا موقعہ نہ رہے جو بوقت ملاقات رام پور آپ نے مجھ سے کی تھی کہ میں نے اپنے خیالات سابقہ کی آپ ہی کی وساطت سے اشاعت کیوں نہ کرائی۔ امید ہے کہ اب شبہات کو رفع فرما کر مجھ کو اور دیگر اصحاب کو بھی مطمئن فرما دیں گے۔ اگر اس بحث کو آپ ظاہر کر چکے ہیں تو صرف میری اس تحریر ہی کو شائع کر دیجئے۔ ورنہ فوراً واپس کر دیجئے۔

(۱) آپ کی تحریر مارچ اور مئی کے حدود ذیل مقامات سے صاف ظاہر ہے کہ آپ معجزات و کرامات کے کھلم کھلا منکر ہیں۔ (الف) اس قسم کے واقعات جو اولیاء کرام سے منسوب کئے جاتے ہیں ان کی

کوئی حقیقت نہیں۔ (ب) کوئی ذی علم انسان ان مزخرفات اور خرافیات پر اعتماد نہیں کرسکتا۔ (ج) اسلام نے شعبدہ بازی اور نظربندی کو ہمیشہ ٹھکرایا ہے۔ (د) معجزات کی عدم صدور پر آیہ سے استدلال (ہ) اور اسی کو رسالت آب صلعم کا مسلک قرار دینا۔ (و) اولیائے کرام سے خوارق منسوب کرنے کو ان کی رسوائی سے تعبیر کرنا۔ (ز) ناقلین خوارق کو (جن میں اولیائے کرام اور اکابر علماء و محدثین و صحا ح ستہ کے مؤلفین بھی داخل ہیں) بے علم، جاہل، فریبی، دنیا طلب وغیرہ خطابات سے نامزد کرنا۔ (ح) خوارق کو دور از عقل، پھر خلاف عقل کہیں خلاف قانون بنانا جن کے سبب سے وہ غیر ممکن الصدور ٹھہرائی جائیں (ط) نگارشات مطبوعہ مئی میں (بلا حوالہ سند) مطلقاً معجزات پیش کرنے پر جناب رسول اللہ کا انکار ظاہر کرنا (اگر ان آیات سے آپ انکار سمجھتے ہیں جن کا حوالہ آپ نے مارچ کے پرچہ میں دیا ہے تو ان پر ہمارے مضمون مطبوعہ "درویش" یکم مئی میں بحث ہو چکی ہے کہ ان سے یہ مدعا ثابت نہیں ہوتا) اب آپ خود ہی فرمائیں کہ بھلا کوئی شخص بھی تحریرات مذکورہ بالا کو پیش نظر رکھ کر ان سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ صاحب تحریر خوارق کا قائل و معتقد ہے کیا یہ سب آپ کے انکار صریحی پر دال نہیں خصوصاً ب، ج، د، ز، جو کہ حقارت سے بھی بھرے ہوئے ہیں پھر آپ کا رسالہ مئی میں بڑے زور سے دعویٰ کرنا

کہ آپ معجزات و کرامات کے ویسے ہی قائل ہیں جس طرح کوئی دوسرا اور آپ کی طرف ان کا انکار منسوب کرنے کو ظلم قرار دینا کہاں تک درست اور بجا ہے اور دونوں متضاد اقوال میں وجہ تطابق کیا ہے۔ ہم تو موٹی سمجھ کے جاہل انسان ہیں اور آپ (بوجہ ان مزخرفات و خرافات پر یقین نہ رکھنے کے) ذی علم طبقہ اور ائمہ ادب میں سے شمار ہوتے ہیں مگر اتنا تو بتا دیجیے کہ اگر آپ کی مذکورہ تحریرات سے آپ کا انکار ظاہر نہیں ہوتا بلکہ اس کے برخلاف آپ کے قائل و معتقد ہونے کا ثبوت ملتا ہے تو آیا یہ ثبوت عبارتاً ہے یا دلالتاً یا اشارتاً یا اقتضاءً یا کم از کم ان عبارات کے مفہوم مخالفت ہی سے ثابت کر دیجیے (حالانکہ بعض مستند علماء اس کو لائق استدلال نہیں سمجھتے ہیں، البتہ مفہوم مخالف کے معنی اگر آپ یہ سمجھ لیں کہ کسی حکم سلبی سے آپ ایجاب ایجابی سے سلب مراد لے لیں تو بے شک ہمارے اور آپ جیسے اور الزام انکار بر قطعاً ظلم ہوا) پھر براہِ مہربانی ہم کو یہ بھی بتائیے کہ ان تحریرات کا کونسا لفظ آپ کے قائل ہونے پر دلالت کرتا ہے اور وہ دلالت مطابقی ہے یا تضمنی یا التزامی اور یہ کہ اس لفظ کے حقیقی معنی مراد ہیں یا مجازی اور پھر یہ کہ وہ لفظ اپنے معنی میں صریحی ہے یا کنائی اور سب سے آخر میں وہ معنی ظاہر ہیں یا خفی، نص ہیں کہ مشکل مفسر ہیں یا مجمل، محکم ہیں یا متشابہ۔

(۲) جواب مندرجہ عنوان "محال کے صدور کا امکان" مطبوعہ مئی میں آپ نے محال عقلی اور محال عادی میں فرق کرکے ان خوارق کو جو محال عادی ہوں جائز الصدور اور ممکن الوقوع مانا ہے (اور ہم نے بھی اپنے مضمون میں جو رسالہ "درویش" میں بعنوان "ادلۂ عقلیہ سے معجزات و کرامات کا ثبوت" زیر اشاعت ہے یہی فرق ظاہر کیا ہے۔
پھر کیا وجہ کہ حکایات مندرجہ کو خصوصاً اور دیگر جمیع معجزات کو عموماً اس بنا پر کہ وہ دور از عقل ہیں بے اصل، حقائق باطلہ (مزخرف) یا حکایات موضوعہ یا لغو (خرافیات) قرار دیا ہے حالانکہ استبعادِ عقلی جو (ترجمہ ہے دور از عقل کا) اور محال عادی دونوں تمادی ہی ہیں اور دونوں کا مصداق ایک ہے۔ پھر تمثیلاً آپ نے مرد کا بچہ جننا اور بصفحہ ۱۷۲ ڈاکٹر کا مُردے کو زندہ کرلے میں کامیاب ہو جانا زمانۂ حاضرہ کے واقعات کو بوثوق لکھا ہے (اور کچھ زمانہ ہوا میں نے کسی پرچہ میں خود دیکھا تھا کہ فرانس کا کوئی ڈاکٹر مرد کو عورت اور اس کے برعکس عورت کو مرد بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے) جو کہ حکایت مندرجہ استفسار کے نظایر ہیں پھر کس بنا پر حکایات مذکورہ واجب الرد والانکار ٹھہریں اور کس وجہ سے واقعات جدیدہ قابل قبول والاعتبار۔
(۳) دور از عقل یا مستبعد العقل محال عادی ہے جو کہ جائز الصدور

اور ممکن الوقوع ہوتا ہے اور خلاف عقل جو کہ عقل سلیم کے نزدیک مسلم یا جائز نہ ہوا در یہی مفہوم ہے محال عقلی کا جو کہ غیر ممکن الوقوع اور غیر جائز الصدور ہے پھر آپ نے ان دونوں کے مفہوموں میں فرق مسلم رکھتے ہوئے خارق کو ایک جگہ پر جبہ ایج میں دور از عقل اور دوسری جگہ خلاف عقل ٹھہرایا ہے۔ یہ کیونکہ صحیح ہوا حالانکہ دونوں کے مفاہیم اور احکام میں تبائن کلی ہے۔

(۴) جبکہ صدور خوارق کے آپ صرف اسی قدر قائل ہیں کہ بہت سے بہت آپ کو ماولین میں سمجھا جائے۔ اس لئے آپ کا یہ لکھنا کہ آپ تو ان کے اسی طرح قائل ہیں جس طرح کوئی دوسرا، کہاں تک قابل اعتبار ہو سکتا ہے اور اگر بفرض ہم آپ کو ماولین میں سے بھی مان لیں تو آپ نے حکایات مندرجہ استفسار کی تاویل کیوں نہیں کی اور کیوں بے محابا تردید کرنی شروع کر دی حالانکہ ان کی تاویل ہو سکتی تھی (تاویل بھی وہ معتبر تاویل ہوتی جو کسی وجہ معتبرہ شرع کی بنار پر ہو ورنہ وہ معنی کی تحریف اور کلام کی تکذیب ہے)

(۵) کیا معجزات و کرامات کا انکار کرتے ہوئے ان کو شعبدہ بازی اور نظر بندی سے تعبیر کر کے انبیاء اور اولیا کو شعبدہ باز اور ساحر نہیں ٹھہرایا جیسا کہ اس زمانہ کے بھی کفار کہا کرتے تھے اور بصورت انکار، کیا آپ نے حقائق واقعیہ سے انکار اور خود اپنے قول کی مخالفت نہیں کی اور

کیا ان دونوں صورتوں میں آپ نے انبیاء اور اولیا پر ظلم نہیں کیا۔ اور اس طرح کیا یہ "اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ" کی وعید کے مستحق نہ ٹھہرے۔

(۶) کیا آپ نے ناقلین پر صراحتاً اور معتقدین خوارق پر کنایتاً جہالت بے علمی وغیرہ کے نہایت ذلیل اور شرمناک الزام نہیں لگائے حالانکہ آغاز اسلام سے لیکر اس وقت تک کافۂ مسلمین بلا استثنا سب معجزے کے قائل ہیں اور جن میں صحابۂ کبار، علما، اکابر، اولیائے کرام، صلحا، محدثین اور عقلا و حکما، اسلام بھی شامل ہیں اور کیا ایسی مقدس ہستیوں پر ظلم کرکے آپ "وَالَّذِیْن یؤذون المؤمنین والمؤمنات" کی مذمت و ملامت سے بچ سکتے ہیں۔

(۷) پھر معجزات انبیاء اور کرامات اولیاء کو شعبدہ بازی و نظر بندی سے تعبیر کرنا اور ان برگزیدہ اور مقدس ہستیوں کے روحانی تصرفات کے مقابلہ میں آج کل کے مادہ پرست اور ظلماتی دماغوں کے مادی اختراعات کو معجزے کا معزز اور اسلامی لقب دینا (نگار مطبوعہ مئی صفحہ ۴۷) اس کو شانِ اسلامی کہاں تک روا رکھتی ہے اور منکرین معجزات کو ذی علم طبقۂ انسانی میں بمقابلہ معتقدین کے شمار کرنا کہاں تک مناسب ہے۔

(۸) آپ کا یہ جواب کہ آپ معجزات و کرامات کو کچھ اہمیت نہیں دیتے بلکہ محض معمولی امر تصور کرتے ہیں جن پر نبی کی نبوت یا ولی کی ولایت

موقوف نہیں (یا کہ وہ نبوت یا ولایت کو ثابت نہیں کرتے) کہاں تک سوال سے مطابق ہے۔ کیونکہ سوال صرف دو باتوں سے تھا اول معجزات وکرامات کے وقوع سے۔ آپ نے قبل اس کے کہ سوالوں کے متعلق سائل کی تشفی صاف و صریحی عبارت سے کی ہو یہ بحث جو خارج از سوال ہے چھیڑ دی اور صریحی عبارت میں جو کہ شرعی استفسارات خصوصاً اعتقادیات میں لازم ہے جواب کیوں نہ دیا جس سے کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ رہتی۔

(۹) پھر جبکہ کلام ربانی نے معجزات کو کہیں آیات کہیں بینات کسی جگہ برہان کسی جگہ فرقان کسی مقام پر سلطان مبین کے معزز اور شاندار الفاظ سے تعبیر کیا ہو تو اس کے مقابلہ میں آپ کا ان کو معمولی اور واہم قرار دینا اور صاحب معجزات کے شرف یا نبوت پر دال نہ سمجھنا کیا قیمت رکھتا ہے۔ ہم اس بحث کو طول دینا نہیں چاہتے اگر ضرورت ہوئی تو آئندہ اس مضمون پر بھی بحث کریں گے (بحول اللہ وقوتہ) اور اگر بقول آپ کے یہ نہایت معمولی امر ہے تو آپ ہی اپنے اس مضمون کی تصدیق کے لئے کوئی ایسی خلاف عادت شہادت پیش کر دیجئے جس طرح رسول اللہ صلعم کی نبوت کی تصدیق سنگریزوں نے کی اور جس کو آپ نہایت معمولی امر قرار دیتے ہیں۔

(۱۰) نے یہ کیوں کر معلوم کر لیا کہ معتقدین معجزات وکرامات صرف خوارق

ہی کو نبوت یا ولایت کا مدار سمجھتے ہیں، اور ان کی اخلاقی اور دیانہ زندگی ان کی نظر میں وقیع نہیں، البتہ ان سے اُن امور کے ظہور کا جن کو آپ لوگ خلاف قانون فطرت سمجھتے ہوئے اعتقاد ضرور رکھتے ہیں اور ان کو بھی وقعت دیتے ہیں پھر کیا آپکا الزام ان پر ظلم نہیں
(۱۱) براہِ مہربانی ان اکابر علما کے نام بحوالۂ سند ہم کو بھی بتا دیجئے جو معجزۂ شق القمر سے منکر ہیں۔ ہم نے تو جہاں تک کتب متداولہ میں چھان بین کی تو بہت سے اکابر علما تو درکنار کسی ایک عالم دین کو بھی اس معجزے سے منکر نہ پایا، بلکہ بعض اکابر علما نے اس معجزے کو نص قرآنی سے ثابت مانا ہے اور بعض نے اجماع کو بھی تو تسلیم کیا ہے بعض نے اخبار مشہورہ سے اور بعض نے حدیث صحاح سے ثابت مانا ہے اور بعض کتب تواریخ سے بھی اس کا وقوع پایا جاتا ہے۔ اگر آپ کے ائمہ فلاسفہ ہیں جنکو آپ ذی علم انسان کا لقب دے چکے ہیں تو ایسے علما آپ کے نزدیک معتبر ہوں۔۔ مگر دنیائے اسلام اُن پر ہرگز وثوق نہیں رکھ سکتی جن صاحب کو اس معجزے کے متعلق تفصیل دیکھنی ہو تو جناب مولوی حکیم رشید الرحمن رامپوری کا رسالہ موسومہ اعجاز خیر البشر فی معجزۂ شق القمر، کا مطالعہ کریں۔ مؤلف نے بہت تحقیق و تفصیل سے اس کا ثبوت دیا ہے اور چند شبہات کا بھی بخوبی ازالہ کیا ہے اور چند علماء مستند کی تقاریظ سے آراستہ ہے)
(۱۲) آپ کے اس جملہ سے کہ بہت سے اکابر علما نے اس معجزۂ شق القمر

سے انکار کیا ہے۔ پتہ چلتا ہے کہ یہی علاوہ دیگر تمامی معجزات سے منکر نہیں بلکہ قائل ہیں پھر جبکہ آپ خود جناب رسول اللہ صلعم سے مطلقاً معجزات پیش کرنے کا انکار بوثوق و بلا انقیاد ثابت کر رہے ہیں پس یا تو حقیقت رسول اللہ سے یہ انکار ثابت نہیں جیسا آپ کا خیال ہے۔ ورنہ اکابر علما میں سے کوئی معجزات کا قائل نہ ہوتا۔ یا بفرض ان سے انکار ثابت ہو تو وہ علماء، علما راکابر او رمستند میں داخل نہیں ہو سکتے جیسا کہ آپ نے ان کو ایسا لکھا ہے کیونکہ اس صورت میں وہ مخالف قول رسول اللہ صلعم کے صدور معجزات کے منکر نہیں بلکہ قائل ہیں۔

یہ میرے چند شبہات ہیں جن کو میں بغرض اطمینانِ قلب آپ پر ظاہر کر دیا امید کہ تسلی بخش جواب عنایت فرما کر مطمئن فرما دیجئے گا۔"

آپ کے اعتراضات یا شبہات کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض نتیجہ ہیں صرف غلط فہمی کا، اور بعض کا تعلق ہے تعبیر ناقص سے (جسے میں اپنی طرف منسوب کروں گا۔) لیکن آپ کی ساری تحریر پڑھ لینے کے بعد میں یہ سمجھنے پر بھی مجبور رہوں کہ "معجزات و کرامت" کے مسئلہ میں میرے خیالات ضرور آپ سے مختلف ہیں اور اس حالت میں کہ آپکی طرف سے یہ "ایراد" پیش ہوا ہے میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اپنے معتقدات اس باب میں نہایت واضح طور پر بیان کر کے آپ سے "ارشاد و ہدایت" کی تمنا کروں کیونکہ میں ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ حق کی جستجو کیا کرتا ہوں اور ایک لمحہ کے لئے بھی میں "حقیقت و صداقت" سے

روگردانی کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتا، لیکن قبل اس کے کہ میں اصل مسئلہ کی طرف متوجہ ہوں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں آپ کے اعتراضات کے اُس حصہ سے فارغ ہو جاؤں جن کا تعلق میرے نزدیک غلط فہمی سے ہے۔

سب سے پہلے مارچ کے نگار میں ایک صاحب نے دریافت کیا کہ حضرت غوث الاعظم سے بعض عجیب وغریب واقعات منسوب کئے جاتے ہیں (مثلاً مُردے کو زندہ کرنا، لڑکی کو لڑکا بنانا وغیرہ) آپ کی اس مسئلہ میں کیا رائے ہے"۔ میں نے جواب دیا کہ "اس قسم کے واقعات (یعنی ایسے واقعات جن کا صدور عقلاً محال ہے) جو اولیاء کرام سے منسوب کئے جاتے ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے"

آپ کی تحریر سے جو "درویش" میں شائع ہوئی نیز تحریر زیر بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی صدور معجزات و کرامت کو صرف ان واقعات سے متعلق سمجھتے ہیں جو عقلاً محال نہیں ہیں یعنی وہ باتیں جن کے وقوع کو عقل محال سمجھتی ہے آپ کے نزدیک بھی احاطۂ معجزہ و کرامت سے باہر ہیں۔ اس لئے اگر میں نے مارچ کے نگار میں ایسے ہی واقعات کے متعلق یہ جواب دیا کہ "وہ سراسر مزخرفات (خرافیات) سے وابستہ ہیں یا یہ کہ اولیاء کرام سے ایسے واقعات کو منسوب کر کے انھیں ارباب عقول کے طبقہ میں رسوا کرنا ہے" تو کیا جرم کیا، کیا کسی بزرگ کے ساتھ ایسے واقعات کی نسبت دینا جو حقیقتاً وقوع میں نہیں آسکتے کسی اہلِ علم کا فعل ہو سکتا ہے اور کیا ایسا کرنے والے جاہل نہیں کہلائے جائیں گے۔

آپ کو شاید مجھ سے زیادہ اس بات کا علم ہوگا کہ آج کل پیشہ ور واعظ جنھیں علم دین سے بہت کم آگاہی ہے اور جو حقائق مذہب سے بالکل بیگانہ ہیں اس قسم کی خلاف عقل باتیں

اولیاء کرام سے منسوب کرکے طبقہ عوام کو متاثر کرتے ہیں اور چونکہ ان کا مقصود اس اثر ڈالنے سے صرف حصولِ زر ہوتا ہے اس لئے انہیں اس کی کیا پرواہ ہوسکتی ہے کہ وہ دین میں کیسا رخنہ پیدا کررہے ہیں اور ایسی روایات بیان کرکرکے جو صرف انہیں جیسے دنیادار اور زرپرست لوگوں کی وضع کی ہوئی ہیں اور جن پر کوئی ذی علم انسان اعتماد نہیں کرسکتا۔ وہ مذہب کو کس قدر رسوا کررہے ہیں۔ بہرحال اپریل کے نگار میں میرا روئے سخن ایسے ہی لوگوں کی طرف تھا اور اس باب میں شاید آپ کو بھی اتفاق ہوگا۔

اس کے بعد مئی کے رسالہ میں اتفاق سے دو استفسار اور آگئے جو "معجزہ وکرامات سے انکار" اور "صدور محال" کے عنوان سے درج کئے گئے ہیں) ان کا جواب اگر آپ غور سے ملاحظہ فرمائیں گے تو معلوم ہوگا کہ میں نے پھر اسی خیال کو بہ تبدیل الفاظ زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کردیا کہ جو باتیں عقلاً محال ہیں ان کا معجزہ وکرامات سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جو باتیں عادتاً محال ہیں وہ حقیقتاً امکان کے تحت میں آتی ہیں اور اس لئے ان کے وقوع سے اگر معجزہ وکرامات کو ثابت کیا جاسکتا ہے تو میں بھی اس کو تسلیم کرتا ہوں۔

میں نے اگر کسی جگہ یہ لکھا ہے کہ میں معجزہ وکرامات کا قائل ہوں تو اسی خیال کے ماتحت اور اگر انکار کیا ہے تو اسی اصول کی بنا پر، البتہ سلسلۂ تحریر میں ایک جگہ میں نے یہ ضرور ظاہر کیا ہے کہ شق القمر کو بعض اکابر علماء معجزہ تسلیم نہیں کرتے اور رسول اللہ نے بھی معجزہ پیش کرنے سے انکار کیا ہے اور یہیں سے میرے آپ کے درمیان اختلاف شروع ہوجاتا ہے اس لئے آپ کے شبہات کے جواب میں اب میرا فرض یہ رہ جاتا ہے کہ جو امور میرے آپ کے درمیان مابہ النزاع ہیں صاف کردوں لیکن قبل اس کے کہ میں اصل موضوع

پر آؤں چند ضمنی مباحث سے گزرنا لازمی ہے اور اگر تفصیل کا موقعہ نہ ہو تو بالاجمال ان کا ذکر لازم ہے۔

سب سے پہلے یہ امر غور طلب ہے کہ معجزہ کا اصطلاحی مفہوم کیا ہو سکتا ہے شرح مواقف میں معجزہ کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے کہ "المعجزۃ عندنا ما یقصد بہ تصدیق مدعی الرسالۃ وان لم یکن خارقا للعادۃ" یعنی علامہ سید شریف کے نزدیک معجزہ وہ چیز ہے جس سے مدعی رسالت کی تصدیق مقصود ہو لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ خارقِ عادت بھی ہو لیکن میں نہیں سمجھ سکتا کہ اگر خارق عادت کی شرط کو ضروری نہ قرار دیا جائے، تو اس میں اعجاز کی کونسی صورت باقی رہتی ہے اور ایسی بات کا صدور کیونکر تصدیق رسالت کے لئے مفید ہو سکتا ہے اس لئے تمام علمائے اسلام نے معجزہ کو خارق عادت ہونا ضروری قرار دیا ہے۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خارق عادت ہونے سے کیا مقصود ہے۔

اگر "خارق عادت" سے مراد کسی ایسے فعل کا ظہور ہے جو قانونِ قدرت کے مخالف ہو تو قابل تسلیم نہیں کیونکہ اس کی تردید خود نصوص قطعیہ سے ہوتی ہے۔ کلام اللہ میں متعدد مقامات پر اس حقیقت کو ظاہر کیا گیا ہے کہ جو چیز جس انداز پر پیدا کی گئی ہے، اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی مثلاً :-

"قل کل یعمل علی شاکلتہ" "فلن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا" "ولن تجد لسنۃ اللہ تحویلا" "خلق کل شئ فقدرہ تقدیرا" "کل شئ عندہ بمقدار" کی تفسیر میں امام رازی نے لکھا ہے کہ "اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز ایک مخصوص انداز پر ہے اور اس کی حالت یہ ہے کہ "لا یجاوزہ ولا ینقص عنہ"

مولانا شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی اسی سلسلہ میں ظاہر کیا ہے کہ:-

جرت عادۃ اللہ تعالےٰ ان لا تنفک الخواص عما جعلت خواص لہا (یعنی خدا کی عادت ہے کہ وہ اشیاء کے خواص کو نہیں بدلتا)

اس لئے خوارق عادت سے مراد ایسے افعال ہوں گے جو عادتاً ظہور میں نہیں آتے لیکن ان کا حدوث ممکن ہے اور چونکہ ایسے افعال کے حدوث کے لئے اسباب کا ہونا ضروری ہے۔ اس لئے ان میں کوئی کیفیت اعجاز پیدا نہیں ہوتی جب اسباب پیدا ہوجائیں گے ان کا ظہور ہو جائے گا۔ خواہ وہ اسباب کسی نبی کی دعا سے پیدا ہوں یا غیر نبی کی کاوش سے۔ اگر کوئی کہے کہ ان اسباب کا ظہور کسی غیر نبی کی کاوش سے نہیں ہوسکتا تو ہم اس کے ماننے کے لئے تیار نہیں کیونکہ اس طرح کی نادر الوقوع باتیں یوں بھی بغیر کسی نبی یا ولی کی دعا کے اسباب فراہم ہو جانے پر کبھی کبھی ظاہر ہو جاتی ہیں۔

اس بیان کا خلاصہ یہ ہوا کہ اگر معجزات کو محالات عقلیہ سے متعلق سمجھا جائے تو خود نصِ قطعی سے اس کی تردید ہوتی ہے اور اگر محالات عادی سے وابستہ کریں تو معجزہ کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی اور نہ اسے تصدیق رسالت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ مولانا شاہ ولی اللہ صاحب بھی تفہیمات الٰہیہ میں یہی لکھتے ہیں کہ: "انما المعجزات والکرامات امور اسبابیۃ ولم تترک الاسباب قط۔ ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔"

اس کے بعد یہ امر بحث طلب ہے کہ معجزہ مثبت نبوت ہے یا نہیں۔ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے بعض اسے مثبت نبوت کہتے ہیں اور بعض کو اس سے انکار ہے معلوم نہیں آپ کا خیال اس باب میں کیا ہے، اگر آپ مثبت نبوت نہیں کہتے، تو

اس کی اہمیت آپ کے نزدیک بھی ضعیف ہے اور اگر ثبت نبوت قرار دیں تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبوت اس کو مستلزم ہے یا نہیں۔ اگر صاحب حجۃ اللہ البالغہ کی طرح آپ بھی اسے لازم نہیں قرار دیتے تو نبوت سے خارج ہونا ظاہر ہے اور اگر ضروری قرار دیتے ہیں تو نصوص قطعیہ اس کے خلاف ہیں اور خود کلام مجید سے ثابت ہوتا ہے کہ باوجود کفار کے معجزہ طلب کرنے کے آپ نے معجزہ پیش کرنے سے انکار کر دیا، وہ آیات یہاں نقل کرتا ہوں :۔

وقالوا لن نؤمن لک حتی تفجر لنا من ارض ینبوعا او یکون لنا جنۃ من نخیل وعنب فتفجر الانہار خلالہا تفجرا او تسقط السما کما زعمت علینا کسفا او تی باللہ والملائکۃ قبیلا او یکون لک ترخیک حتی تنزل علینا کتابا نقراہ قل سوان ربی ہل کنت الا بشرا رسولا۔

(سورۃ بنی اسرائیل، آیات ۹۲-۹۵)

(کفار نے رسول اللہ سے) کہا کہ ہم تیرے اوپر ایمان نہ لائیں گے جب تک زمین سے ہمارے لئے چشمہ نہ جاری کر دے یا یہ کہ تیرے پاس کھجور اور انگور کا باغ ہو اور تو اس میں بہتی ہوئی نہریں نہ نکالے یا یہ کہ آسمان کے ٹکڑے کر ڈالے یا یہ کہ خدا اور فرشتوں کو اپنے ساتھ لے آئے یا یہ کہ تیرے لئے کوئی آراستہ مکان ہو یا یہ کہ تو آسمان پر چڑھ جائے اور ہم تیرے انسوں پر ایمان نہ لائیں گے جب تک کوئی ایسی کتاب ہم پر نازل نہ ہو جسے ہم پڑھ لیں (سوائے رسول) کہدے کہ پاک ہے میرا پروردگار میں تو کچھ بھی نہیں ہوں، مگر ایک انسان بھیجا ہوا

اگر معجزہ کا پیش کرنا داخل نبوت ہوتا یا نبوت مستلزم معجزہ ہوتی تو ایسی صورت میں کہ کفار آپ سے معجزہ طلب کر رہے تھے، یہ جواب ہرگز نہ دیتے کہ "سبحان ربی ہل کنت الا بشراً رسولا" بلکہ ان کے مطلوبہ معجزوں میں سے کسی نہ کسی معجزہ کو ضرور پیش کرتے۔

اگر آپ اس مسئلہ میں زیادہ تفصیل کی ضرورت خیال کریں تو قاضی ابولید محمد بن رشید کی مشہور کتاب "الکشف عن مناہج الدولہ فی عقائد الملتہ" ملاحظہ کیجیے جس میں قوی دلائل سے یہ امر ثابت کیا گیا ہے کہ معجزہ مثبت نبوت نہیں۔

مارچ کے نگار میں میں نے سورۂ عنکبوت کی اس آیت کو "قالوا لولا انزل علیہ آیات من ربہ قل انما الآیات عند اللہ وانما انا نذیر مبین" اس استدلال میں پیش کیا تھا کہ رسول نے معجزہ پیش کرنے سے انکار کر دیا اور اب پھر اسی کو پیش کر کے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا کفار کا یہ کہنا کہ ان پر (یعنی رسول اللہ پر) کیوں اللہ کی طرف سے نشانیاں یا معجزے نہیں اتارے گئے، اس بات کو ثابت نہیں کرتا کہ رسول اللہ نے اس سے قبل بھی کوئی معجزہ پیش نہیں کیا تھا اور کفار کا معجزہ طلب کرنا اور رسول کا اس کے جواب میں یہ فرمانا کہ "انما الآیات عند اللہ وانما انا نذیر مبین" (یعنی نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں میں تو صرف تمہیں علانیہ ڈرانے کے لیے آیا ہوں) اس امر کا ثبوت نہیں کہ آپ معجزہ پیش کرنے کے لیے مبعوث نہیں ہوئے تھے۔

یہ ضرور ہے کہ اس آیت سے مطلق معجزہ کی نفی نہیں ہوتی اور میں بھی یہ نہیں کہتا کہ معجزہ سرے سے کوئی چیز ہی نہیں ہے لیکن اس آیت سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے رسول نے کوئی معجزہ پیش نہیں کیا اور یہی میرا اصل مقصود تھا کہ جب ہمارے رسول کا مسلک یہ تھا

توپھر اولیاء کرام سے ایسی باتوں کو منسوب کرنا جو عقلاً محال ہیں کہاں تک درست ہو سکتا ہے
رسول اللہ کا اگر کوئی معجزہ تھا تو صرف قرآن پاک تھا (ورہے) جیسا کہ مندرجہ بالا
آیت کے بعد والی آیت سے ثابت ہوتا ہے۔

اولم یکفہم انا انزلنا علیک الکتاب یتلی علیہم ان فی ذالک لرحمۃ وذکری لقوم یومنون۔ کیا کفار کے لئے یہ کافی نشانی یا معجزہ نہیں ہے کہ ہم نے تجھ پر کتاب نازل کی جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے اور جس میں ایمان والوں کیلئے رحمت و نصیحت پائی جاتی ہے۔

اس ضمن میں لفظ آیت و آیات کی بحث بھی غور طلب ہے لیکن میں یہاں اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھتا کہ اصل موضوع سے اس کا زیادہ تعلق نہیں ہے لیکن یہ یقینی ہے کہ اس لفظ کا استعمال کلام مجید میں مختلف موقع و محل پر ہوا ہے اور اس مناسبت سے اس کا مفہوم بھی مختلف ہے کہیں اس سے مراد کہیں صرف علامت و نشانی ہے اور کہیں معجزہ مقصود ہے اور کہیں نصائح و مواعظ۔

مئی کے نگار میں ضمناً میں نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ بعض اکابر علماء کو معجزہ شق القمر سے انکار رہا ہے چنانچہ آپ کا ایک مطالبہ یہ بھی ہے کہ میں کسی ایک ہی عالم دین کے انکار کو ثابت کر دوں چنانچہ میں ایک ایسے عالم دین کا حوالہ دیتا ہوں جس کو آپ بھی میری طرح اکابر علماء میں شمار کرتے ہوں گے اور جس نے نہ صرف شق القمر سے انکار کیا ہے بلکہ یہ بھی صاف صاف ظاہر کر دیا ہے کہ کلام مجید میں اس نوع کے کسی ایک معجزہ کا بھی ذکر نہیں ہے۔

اگر مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کی تفہیمات الٰہیہ جناب کی نگاہ سے گزری ہوگی تو

آپ نے یہ عبارت بھی اس میں ملاحظہ فرمائی ہوگی۔

اما شق القمر فعندنا لیس من المعجزات، انما ہو من آیات القیامۃ کما قال اللہ تعالٰی اقتربت الساعۃ وانشق القمر ولکن صلی اللہ علیہ وسلم اخبر عنہ قبل وجودہ فکان معجزہ من ہذا السبیل ولم یذکر اللہ سبحانہ شیئاً من ہذا المعجزات فی کتابہ

یعنی شق القمر ہمارے نزدیک معجزات میں سے نہیں ہے بلکہ وہ قیامت کی ایک علامت ہے جیسا کہ خدا کا ارشاد ہے: اقتربت الساعۃ وانشق القمر لیکن رسول اللہ نے اس کی خبر بہت پہلے سے کر دی۔ اس لیے یہ پیشین گوئی کی حیثیت سے معجزہ ہو سکتا ہے اور خدا نے اپنی کتاب میں اس قسم کے معجزوں کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔

انسان مجبور ہے یا مختار

(استفسار جناب اظہر الحق صاحب ردولوی)

اس مسئلہ میں آپ کی کیا رائے ہے کہ آیا انسان مجبور محض ہے یا مختار کل۔ میں چند نصوص قرآنی ذیل میں لکھ رہا ہوں، امید ہے کہ آپ ان پر غور فرما کر نہایت وضاحت سے روشنی ڈالیں گے!

۱۔ ولا تتحرک ذرۃ الا باذن اللہ

۲۔ یفعل ما یشاء

آیات بالا سے انسان کے مجبور محض ہونے کا پتہ چلتا ہے

۳۔ فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ الخ

اس آیت سے شبہ ہوتا ہے کہ انسان کچھ قدرت بھی رکھتا ہے۔

۴۔ ان اللہ علیٰ کل شیئ قدیر

اس آیت سے نمبر ۱ و نمبر ۲ کے خیال کو تقویت پہونچتی ہے اور اپنی معذوریت کا یقین شروع ہو جاتا ہے

یہ نزاع کہ انسان مجبور ہے یا مختار نہایت قدیم ہے اور دفتر کے دفتر اس مسئلہ پر سیاہ ہو چکے ہیں لیکن آپ یقین کیجئے کہ اس باب میں ایک لمحہ کے لئے بھی کسی غیر معمولی پیچیدگی کا خیال میرے دل میں نہیں آیا۔ اور یہ مسئلہ مجھے نہایت صاف و روشن نظر آتا ہے۔

یقیناً قرآن حکیم میں ایسی آیات موجود ہیں جن میں باہم تناقض و تضاد نظر آتا ہے یعنی بعض آیات سے انسان کا مجبور ہونا اور بعض سے مختار ہونا ظاہر ہوتا ہے لیکن میرے نزدیک اگر ذرا غور سے کام لیا جائے تو یہ تضاد باقی نہیں رہتا اور حقیقت آشکار ہو جاتی ہے۔

آپ نے جو آیات مجبوری کے ثبوت میں پیش کئے ہیں ان کے علاوہ اور بھی متعدد آیات اسی مفہوم کی قرآن حکیم میں موجود ہیں مثلاً یضل اللہ من یشاء و یہدی من یشاء ۔ ۲۔ وما کان لنفس ان تومن الا باذن اللہ ۔ ۳۔ ولو شاء اللہ ما اشرکوا ۔ ۴۔ من یہدی اللہ فھو المھتد ومن یضلل فلن تجد لہ ولیاً مرشداً ۔ ۵۔ فمنھم من ہدی اللہ ومنھم من حقت علیہ الضلالۃ

وغیرہ وغیرہ۔

لیکن اسی کے ساتھ قرآن حکیم میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ "لا یرضٰی بعبادہ الکفر" اور "واتبعوا ما اسخط اللّٰہ وکرہوا رضوانہ فاحبط اعمالہم" جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کو اختیار دیا گیا ہے۔ جس وقت فطرت انسانی پر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان جمادات کی طرح بے حس نہیں پیدا کیا گیا۔ بلکہ وہ ارادہ کرتا ہے، ارادہ کے تحت اپنے جوارح سے کام لیتا ہے جس کام کو چاہتا ہے کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے نہیں کرتا لیکن سوال یہ ہے کہ یہ قوت ارادی کس نے عطا کی؟ ظاہر ہے کہ خدا نے اس کی فطرت و پیدائش میں یہ صلاحیت یا قوت رکھدی ہے اور وہ اسی قوت سے کام لے کر ایک ارادہ کرتا ہے اور اس سے باز رہ سکتا ہے۔ اس طرح انسان میں دو متضاد خواہشوں کے پیدا ہونے کا مادہ ودیعت کیا گیا ہے اور انھیں خواہشوں کے مطابق وہ کبھی اچھے کام کی طرف مائل ہوتا ہے اور کبھی بُرے کاموں کی طرف، چنانچہ خدا خود ارشاد فرماتا ہے "قد افلح من زکاہا وقد خاب من دساہا" یعنی کامیاب ہوا وہ جس نے نفس کو پاک کیا اور خسارہ میں رہا جس نے اُسے آلودہ کیا۔

پھر چونکہ ان قوتوں کا پیدا کرنے والا خدا ہے اس لئے اگر وہ تمام درمیانی واسطوں اور اسباب کو قطع نظر کر کے یوں کہے کہ جو کچھ چاہتا ہوں میں ہی کرتا ہوں یا بغیر میرے ارادہ واذن کے کچھ نہیں ہو سکتا تو غلط نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر وہ ہمارے اندر کسی کام کی قوت پیدا نہ کرتا تو ہم سے وہ کام کسی طرح نہ ہو سکتا تھا۔

اس مسئلہ میں سب سے بڑی غلطی یہ کی جاتی ہے کہ تقدیر کے مفہوم پر غور نہیں

کیا جاتا۔ عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ ہر کام، ہر واقعہ اور ہر حادثہ اور ہر ہر بات کے لئے جداگانہ مشیت ہوا کرتی ہے یعنی اگر اس وقت ہم اٹھ کے کہیں جاتے ہیں تو اس وقت خدا کی مشیت ایسی ہوتی ہے یا یہ کہ خدا نے پہلے سے معین کر دیا ہے کہ فلاں فلاں بات فلاں وقت فلاں انسان سے سرزد ہوگی لیکن ایسا سمجھنا درست نہیں۔

مشیت ایزدی کا ظہور حقیقتاً اس فطرت میں ہوتا ہے جس پر انسان یا دیگر موجودات عالم پیدا کئے گئے ہیں جس طرح پتھر کا بھاری ہونا، مقناطیس کا جذب، لوہے کا انجذاب، یہ سب مقدراتِ الٰہیہ ہیں۔ اسی طرح ارادۂ انسانی بھی ایک مقدر ہے جس کی بنا پر ہم ایک کام کو کرتے ہیں اور دوسرے سے بچتے ہیں۔ ہاں اللہ کو اس کا علم ضرور ہے کہ اس کے بندوں سے یہ حرکات سرزد ہوں گی لیکن اس کا علم مجبور کرنے والا نہیں۔

اس باب میں جناب عبداللہ بن عمرؓ کا قول قابل غور ہے۔ ملل و نحل میں لکھا ہے کہ: "ایک شخص عبداللہ بن عمرؓ کے پاس آیا اور کہا کہ اے ابو عبدالرحمٰن بعض لوگ زنا کرتے ہیں، شراب پیتے ہیں، چوری کرتے ہیں، قتل کے مرتکب ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ خدا کے علم میں تھا، ہم اس پر مجبور تھے۔ آپ یہ سن کر برہم ہوئے اور فرمایا کہ سبحان اللہ العظیم قد کان ذلک فی علمہ انہم یفعلونہا ولم یحملہم علم اللہ علیٰ فعلہا۔ یعنی بے شک خدا کے علم میں تھا کہ وہ ایسا کام کریں گے لیکن خدا کے اس علم نے انھیں ان کاموں کے کرنے پر مجبور تو نہیں کیا۔" اس کے بعد آپ نے بروایت حضرت عمرؓ رسول اللہ کی یہ حدیث پڑھی: مثل علم اللہ فیکم کمثل السماء التی اظلتکم والارض الذی حملتکم فکما لا تستطیعون الخروج من السماء والارض کذلک لا تستطیعون الخروج من علم اللہ وکما لا تحملکم الارض والسماء علی الذنوب

کذلک لا یحملکم علم اللہ تعالیٰ یعنی علم الٰہی کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے آسمان جس نے تم پر سایہ کر رکھا ہے اور زمین جس نے تمھیں اٹھا رکھا ہے۔ پس جس طرح تم آسمان و زمین سے نکل کر باہر نہیں جا سکتے اسی طرح علم الٰہی سے باہر نہیں ہو سکتے لیکن جس طرح آسمان و زمین تمھیں گناہ پر مجبور نہیں کرتے اسی طرح خدا کا علم بھی تمھیں گناہ پر مجبور نہیں کرتا۔

غالباً اس سے بہتر مثال خدا کے علم کی اور کوئی نہیں ہو سکتی اور نہ اس سے زیادہ صاف بیان مسئلہ جبر و اختیار میں اور کوئی ہو سکتا ہے چونکہ یہ خود رسول اللہ کا ارشاد ہے اس لئے کسی کو انکار کی گنجائش نہیں ہو سکتی لیکن ہم اس پر اکتفا نہیں کرتے، اور بعض صحابۂ کرام اور اکابر امت کے اقوال بھی اس باب میں پیش کرتے ہیں جس سے اس کی اور زیادہ وضاحت ہو جائے گی۔

جب حضرت علی جنگ صفین سے لوٹے تو ایک شخص آپ کے پاس آیا اور بولا کہ "ہمارا شام کی طرف سفر کرنا کیا قضا و قدر کے موافق تھا" آپ نے جواب دیا کہ "قسم ہے دانہ کو پھوڑنے والے اور جان کے پیدا کرنے والے کی کہ نہیں اترے ہم کسی وادی میں اور نہیں چڑھے ہم کسی بلندی پر مگر موافق قضا و قدر کے۔" اس شخص نے کہا کہ "تو پھر ہمیں کوئی ثواب بھی نہیں ملا۔" حضرت علی نے سن کر فرمایا "لعلک ظننت قضاءً واجباً و قدراً حتماً ولو کان کذلک لبطل الثواب والعقاب ولسقط الوعد والوعید ولما کانت تاتی من اللہ لائمۃ لمذنب ولا محمدۃ لمحسن تلک مقالۃ اخوان الشیاطین وعبدۃ الاوثان وخصماء الرحمٰن و شہود الزور واہل العمیٰ عن الصواب فی الامور ہم قدریۃ ہذہ الامۃ ومجوسہا ان اللہ تعالیٰ امر تخییراً ونہی تحذیراً ولم یکلف مجبراً ولم یبعث الانبیاء عبثاً ذالک ظن الذین کفروا فویل للذین کفروا"

"یعنی شاید تو اس کو قضائے یقینی و قطعی خیال کرتا ہے، حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو عذاب و ثواب سب باطل ہو جاتے اور نہ خدا کی طرف سے گنہگار پر ملامت ہوتی اور نہ نیکوکار پر انعام، یہ قول ہے شیطان کے بھائیوں، بت پرستوں، خدا کے دشمنوں اور دروغگو بازوں کا۔ خدا نے مجبور بنا کر مکلف نہیں کیا اور پیغمبروں کو بے کار نہیں بھیجا۔ یہ گمان ہے ان کا جو کافر ہیں۔ (ملاحظہ ہو ملل و نحل)

ایک مرتبہ حجاج نے امام حسن بصری سے اسی مسئلہ کو دریافت کیا آپ نے جواب دیا کہ "خدا جس کام سے باز رکھنا چاہتا ہے وہ اس کی طرف سے نہیں ہوتا کیونکہ خدا خود فرماتا ہے کہ "لا یرضی لعبادہ الکفر" اللہ اپنے بندوں کے کفر پر راضی نہیں پس اگر کفر قضا و قدر ہوتا تو خدا یہ نہ فرماتا جیسا کہتے ہیں کہ خدا جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے نیک راہ دکھاتا ہے لیکن اگر وہ آیت کے ماقبل و مابعد پر غور کریں تو معلوم ہو سکتا ہے کہ خدا گناہ کرنے سے پہلے گمراہ نہیں کرتا کیونکہ اس کا قول ہے کہ "یضل اللہ الظالمین" یا اللہ ظالموں کو گمراہ کرتا ہے یعنی ان کی گمراہی کا حکم دیتا ہے اور فرماتا ہے "فلما زاغوا ازاغ اللہ قلوبہم و ما یضل بہ الا الفاسقین" جب وہ کجی اختیار کرتے ہیں اللہ ان کے دلوں کو کج کر دیتا ہے اور وہ گمراہ نہیں کرتا مگر فاسقوں کو۔

حضرت امام حسن نے جب اہل بصرہ کو خط لکھا تو اس میں صاف صاف تحریر کر دیا کہ "من حمل ذنبہ علی ربہ فقد فجر ان اللہ لا یطاع استکراہا و لا یعصی بغلبۃ لانہ الملیک لما ملکہم والقادر علی ما اقدرہم علیہ فان عملوا بالطاعۃ لم یحل بینہم و بین ما فعلوا وان عملوا بالمعصیۃ فلیس ہو الذی اجبرہم علی ذالک فلو اجبر اللہ الخلق علی الطاعات اسقط عنہم الثواب

ولو اجبرہم علی المعاصی الا سقط عنہم العقاب اہملہم لکان عجزا فی القدرۃ ولکن لہم فیہم المشیت التی غیبہا عنہم فان عملوا بالطاعات کانت لہم المنۃ علیہم وان عملوا بالمعصیۃ کانت لہ الحجۃ علیہم۔

یعنی جو اپنے گناہ کو خدا کی طرف منسوب کرتا ہے وہ فاجر ہے، خدا نہ اپنی اطاعت پر مجبور کرتا ہے اور نہ نافرمانی سے کوئی شخص اس پر غلبہ حاصل کر سکتا ہے خدا ان کے اور ان کے عمل کے درمیان حائل نہیں ہوتا۔ اگر گناہ کریں تو خدا نے گناہ پر ان کو مجبور نہیں کیا۔ اگر خدا دنیا کو اپنی اطاعت پر مجبور کرتا تو ثواب اٹھا لیتا۔ اگر گناہوں پر مجبور کرتا تو عذاب اٹھا لیتا پس اگر اطاعت کریں گے تو خدا کا ان پر احسان ہوگا اور اگر گناہ کریں گے تو ان پر خدا کی حجت ہوگی۔

اس قدر بیان سے غالباً آپ پر یہ امر واضح ہو گیا ہوگا کہ اصل مفہوم قضا و قدر کا کیا ہے اور اسلام میں اس کے متعلق کیا ہدایات ہیں۔ آج کل عام طور پر جو عقیدہ مجبوری کا پایا جاتا ہے وہ حد درجہ مخرب امن و انتظام ہے اور وہی لوگ اس کے قائل ہیں جو دنیا میں صرف کاہلی اور مکر و فریب کے سہارے پر زندگی گذارنا چاہتے ہیں، انسان نظام تمدن کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا ہے اور اسے عقل و حواس اسی لئے عطا ہوئے ہیں کہ وہ سوچ سمجھ کر کام کرے اگر ایسا نہ ہوتا تو سارا نظام درہم برہم ہو جاتا اور تعلیمات مذہب کا بھی کوئی اثر نہ ہوتا۔ خیر و شر کو منسوب کرنا صرف اس بناء پر ہے کہ حقیقی فاعل ارادہ و قوت کا وہی ہے اور اس کی عظمت کا خیال جس وقت دل میں جاگزیں ہوتا ہے تو ہم یہی کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ یفعل ما یشاء لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ اس نے ہم کو بالکل مجبور کر دیا ہے اور ہم کو نیک و بد کی تمیز نہیں دی گئی۔

مذہب و عقل!

(استفسار جناب محمد شاکر صاحب جنڈولہ)

مذہب کا سوال صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ایک شخص خدا کی ہستی کو تسلیم کرے ورنہ خدا کو قادر مطلق اور غالب و قدیر ماننے کے بعد عقل سے کام لینے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کیونکہ اس کے نزدیک ہر چیز ممکن ہے اور وہ جو چاہے کر سکتا ہے میں دیکھتا ہوں کہ بہت سے لوگ (جن میں غالباً آپ بھی شامل ہیں) بہت سے مذہبی مسائل سے صرف اس بنا پر انکار کر دیتے ہیں کہ عقل انھیں تسلیم نہیں کرتی۔ حالانکہ خدا کی قدرت کو صحیح معنی میں سمجھ لینے اور تسلیم کر لینے کے بعد انسانی عقل آرائی کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی اور ہمیں ہر بات کے آگے سر عجز خم کر دینا چاہئے خواہ ہماری عقل میں آئے یا نہیں۔ میں حیران ہوں کہ کیوں یہ اختلاف ہے اور لوگ مذہب میں عقل کو کیوں دخل دیتے ہیں۔!

اس اختلاف پر مجھے بھی حیرت ہے اور سب سے زیادہ حیرت اس امر پر ہے کہ لوگ مذہب کو حدود عقل سے کیوں باہر سمجھتے ہیں۔ مذہب اسلام کے متعلق میرا اعتقاد ہے کہ وہ دین فطری ہے اور ایک مذہب کا فطرت کے مطابق ہونا ہی معنی رکھتا ہے

کہ اس میں کوئی امر عقل سلیم کے منافی نہیں ہو سکتا۔

اگر مذہب نام ہے صرف مجموعۂ امکانات کا ہو تو خدا کی قدرت کاملہ تسلیم کر لینے کے بعد دنیا کا محال سے محال امر بھی احاطۂ مذہب میں داخل ہو سکتا ہے کیونکہ خدا سب کچھ کر سکتا ہے اور مذہب اسلام کے ظہور کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن اگر مذہب کا تعلق واقعات سے بھی ہو تو کائنات کی حقیقتوں سے بھی وہ بحث کرتا ہے، قوانین قدرت پر غور کرنا بھی اس کے مقاصد میں داخل ہے اور اگر تحقیق حق سے اُسے نفرت نہیں تو عقل سے کام لینا بھی ضروری ہو جاتا ہے اور آپ کسی کو مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ آپ کی ہر بات آنکھ بند کر کے تسلیم کر لے۔

ایک قصہ مشہور ہے کہ حضرت عیسٰی کے پاس ایک نابینا آیا اور اپنے اعادۂ بصارت کے لئے دعا چاہی، آپ نے دعا کی اور بینائی عود کر آئی۔ چند دن کے بعد آپ نے دیکھا کہ وہی شخص کسی بُرے معصیت تماشہ میں مصروف ہے۔ حضرت عیسٰی نے پوچھا کیوں تو نے اپنی بینائی اسی لئے چاہی تھی کہ اس سے یہ کام لے؟ وہ بولا کہ حضرت اگر بینائی سے یہ مقصود نہیں ہے کہ میں اس سے لطف اُٹھاؤں تو آپ اپنی بینائی لے جائیے مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔

پس اگر آپ مذہب میں عقل سے کام لینے کے مخالف ہیں تو خدا کو عقل ہی پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی بلکہ انسان ہی کو وجود میں لانا بیکار تھا، خدا کی خدائی اس کی محتاج نہ تھی۔

انسان کا یہ فطری حق ہے کہ وہ ہر بات کا سبب دریافت کر کے حوادث کی علتوں پر غور کرے اور سلسلۂ علت و معلول پر نگاہ کر کے کوئی نتیجہ نکالے کیونکہ بغیر اس کے کوئی شخص ترقی نہیں کر سکتا اور مذہب کا عین مقصود نوع انسان کی ترقی ہے۔ اگر آج آپ یہ کہیں کہ اللہ

نے جنت اور دوزخ کو ایک قمقمہ کے اندر بند کر دیا ہے تو اس لحاظ سے کہ خدا ایسا کر سکتا ہے، ہر شخص کو تسلیم کر لینا چاہئے لیکن سوال یہ ہے کہ خدا نے اگر ایسا کیا تو کیوں اور اس میں اس کی کیا مصلحت مضمر تھی۔ عام طور پر دوزخ و جنت، فرشتہ، معجزہ و کرامت، پیدائش مسیح وغیرہ کے متعلق جو عقائد رائج ہیں، ان پر محض امکان کے نقطۂ نظر سے بحث نہیں کی جا سکتی، بلکہ حقیقت، واقعیت، ضرورت اور مصلحت کو دیکھا جاتا ہے کہ بغیر اس کے نہ کوئی مذہب مقبول ہو سکتا ہے اور نہ کوئی مبلغ یا نبی ترویج احکام الہیہ میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ آج اگر ایک شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں رسول ہوں یا یہ کہ خدا میرے اندر حلول کر گیا ہے تو آپ کو فوراً تسلیم کر لینا چاہئے کیونکہ خدا کی قدرت سے یہ امر باہر نہیں لیکن آپ اسے جھوٹا کہہ دیتے ہیں، کیوں؟ اس لئے کہ آپ نے عقل سے کام لیا اور عقل نے آپ کو بتایا کہ اس کا دعویٰ صحیح نہیں ہو سکتا۔ بہر حال عقل سے وہ شخص بھی کام لیتا ہے (اور کام لینا بالکل فطری ہے) جو اس سے کام لینے کی ضرورت کا قائل نہیں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسے شخص کا عقل سے کام لینا محض ان ہدایات کی حد تک ہوا کرتا ہے جو مذہب نے بتا دیئے ہیں اور ان سے آگے وہ نہیں بڑھتا۔ اس لئے یہ ایک نوع کی پابندی اصول ہے نہ کہ عقل آرائی یہ بالکل صحیح ہے لیکن کبھی آپ نے اس پر بھی غور کیا کہ اس طرح آپ مذہب کا میدان کس قدر تنگ کر رہے ہیں۔ اس کے معنی صرف یہ ہوئے کہ ایک مذہب صرف انھیں لوگوں کے لئے ہے جو اس مذہب کے پیرو ہیں یعنی اسلام کے اصول صرف مسلمان ہی کے لئے ہیں جو اندھا دھند بغیر سوچے سمجھے ایک مقررہ خط پر چلا جا رہا ہے اور اس میں کوئی دوسرا شخص شریک نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن چونکہ یہ امر حقیقت کے خلاف ہے اور مذہب اسلام کی دعوت عام اور اس کے اصول سب کے بلئے نویدِ امن ہیں اس لئے آپ کے لئے ناگزیر ہو جاتا ہے کہ ہر شخص کو اس کی خوبی سمجھائیں، پھر یہ ظاہر ہے کہ غیر مذہب والا کبھی آپ کے اصول کو تسلیم نہیں کر سکتا جب تک اس کی عقل ان کی صحت پر حکم نہ لگائے اور اس کے لئے آپ کو دلائل عقلی ہی اپنی طرف سے پیش کرنے پڑیں گے، چونکہ آپ ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں، اس لئے آپ میں اسلام کی خوبی اور اس کے اصول کی پاکیزگی کا عقیدہ نسلاً منتقل ہوا ہے لیکن دوسرا شخص تو آپ کی طرح محض "تقلیدی" مسلمان نہیں ہو سکتا۔ وہ تو پوری جانچ کرنے کے بعد آپ کے شعائر و عقائد اختیار کرے گا۔ چنانچہ یہی سبب تھا کہ خود خدا نے رسول اللہ کو حکم دیا کہ تبلیغ مذہب میں مخاطب کے ذہن و فکر کا خیال ضروری ہے اور "جادلھم بالتی ہی احسن" کا یہی مقصود ہے

اگر آپ نے تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا ہوگا تو یہ امر آپ سے مخفی نہ ہوگا کہ عہد سعادت میں سوائے کلام پاک کے مسلمانوں کے پاس اور کوئی چیز نہ تھی جسے وہ اپنی صداقت کے ثبوت میں پیش کرتے، پھر چونکہ رسول اللہ کا "اسوۂ حسنہ" اور آپ کی عملی زندگی بجائے خود ایک نہایت ہی بین اور روشن دلیل تصدیق مذہب کے لئے موجود تھی اس لئے لوگوں کو "کیوں" اور "کس طرح" کہنے کا موقع ہی حاصل نہ تھا اور نہ حقیقتاً اس عہد کی عملی زندگی میں کبھی کسی کو اس کا ہوش ہوا کہ وہ عقلی نقطۂ نظر سے تعلیمات اسلام پر غور کرے، کلمۂ شہادت پڑھنے کے بعد سب سے پہلے انھیں بقائے نفس کی فکر دامن گیر ہو جاتی تھی اور اس کی مہلت ہی نہ ملتی تھی کہ بیٹھ کر کبھی اس پر غور کریں کہ "اللہ کیا ہے اور

رسول کی رسالت کسے کہتے ہیں؟

بعد کو جب مدافعانہ زندگی کے جھگڑوں کو طے کر کے مسلمان ذرا اطمینان سے بیٹھے اور مختلف اقوام و ملل کے لوگوں اور مختلف اذہان و عقول کے انسانوں کو عام دعوت دی گئی اور جوق در جوق لوگ اس طرف آنے لگے تو معلوم ہوا کہ اب ہر شخص سے کلمۂ شہادت پڑھوا لینا آسان نہیں ہے کیونکہ وہ اپنے دل میں کچھ سوالات رکھتا ہے اس کے دماغ میں کچھ شکوک پیدا ہوتے ہیں، وہ سمجھنا چاہتا ہے کہ خدا کا وجود کیا معنی رکھتا ہے۔ رسول کی رسالت کا کیا مفہوم ہے۔ کلام اللہ کو قول ربانی کہنے سے کیا مقصود ہے؟ پھر چونکہ خدا "لا اکراہ فی الدین" کا حکم نافذ کر کے مذہبی آزادی دے چکا تھا اس لئے یہ تو ممکن نہ تھا کہ ایسے سوال کرنے والوں کے گلے پر چھری رکھدی جاتی کہ لفظ خدا اور رسول کا جو مفہوم بھی ہو تمہیں بہرحال مسلمان ہونا پڑے گا (اور نہ تہذیب انسانیت کا یہ تقاضہ ہو سکتا تھا) بہرحال مستفسرین کی تشفی کرنی پڑتی تھی، ان کے سوالات پر غور کرنا پڑتا تھا۔ اور ان کے شکوک کا جواب منقولات سے نہیں (کیونکہ وہ ہماری منقولات کو کیوں تسلیم کرنے لگے تھے) بلکہ معقولات سے دینا ضروری تھا۔

اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ رفتہ رفتہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ مذہب میں معقولات علم کلام کی بنیاد پڑ گئی اور اس کو اس قدر وسعت ہوئی کہ آج صرف اس کی تاریخ لکھنے کے لئے خدا جانے کتنے مجلدات کی ضرورت ہے۔ مذہب کی وہ سادگی کہ بغیر سوچے سمجھے ایک بات کا اقرار کر لیا جاتا تھا مفقود ہو چکی تھی اور عقول انسانی کی ترقی کے ساتھ ساتھ مذہبی مسائل و عقائد کو بھی تنقیدی روشنی میں لا کر سچا ثابت کرنے کی ضرورت روز بروز قوی

ہوتی جاتی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بحث کے ہزاروں پہلو پیدا ہو گئے اور قدیم وحادث کی نزاع، واجب وممکن کی بحث، بسیط ومرکب کا جھگڑا، علت ومعلول کا مسئلہ، ذات صفات کا قصہ، عرض وجوہر، اصول وفروع، تشبیہ وتجسیم، تقلید واجتہاد، سنت، اجماع قیاس، استحسان، استصلاح، استصحاب وغیرہ خدا جانے کیا کیا مسائل ظہور میں آگئے اور اس طرح فقہ اصول فقہ، حدیث، تفسیر، رجال، تاریخ، جغرافیہ، منطق، فلسفہ، الہیات وغیرہ بیسیوں علوم وجود میں آگئے۔ اب آپ ہی غور فرمائیے کہ یہ سب عقل آرائی کا نتیجہ نہیں تو کیا ہے اور اگر اس سے کام نہ لیا جاتا تو صرف آپ کے منقولات سے کیا کام چل سکتا تھا اور اسلام کی اشاعت اس قدر عام ہونے کی کیا صورت تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح اسلام میں بہت سے گروہ پیدا ہو گئے، احکام وشعائر کے لحاظ سے یک جہتی نہیں رہی، عبادات ومعاملات کے نقطۂ نظر سے یک رنگی مفقود ہو گئی لیکن یہ ہونا ضروری تھا اور اس پر ہمیں افسوس کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ بہرحال یہ تمام جماعتیں مسلمان ہیں، قرآن ہی کو سب نے اپنے عقاید کا ماخذ قرار دیا ہے اور رسول کو برحق کہنے میں سب متفق ہیں۔ اگر ذرا بھی رواداری سے کام لیا جائے تو یہ اختلاف قابل لحاظ نہیں رہ سکتا اور یہ تمام جماعتیں باہم دگر نہایت الفت ورافت کے ساتھ زندگی بسر کر سکتی ہیں کیونکہ خدا کو ایک اور رسول کو نبی برحق مان لینے کے بعد اسلام کی حقیقی روح کا تعلق اخلاق سے رہ جاتا ہے پھر اگر ایک شخص آپ کی طرح دوزخ وجنت کو مادی چیز نہیں مانتا۔ فرشتوں کو وہ صرف قوار مدبرۂ عالم مانتا ہے۔ حشر اجساد کو ضروری نہیں سمجھتا۔ میزان وصراط وغیرہ کے بیانات کو صرف تمثیلی قرار دیتا ہے۔ حضرت عیسیٰ کی

ولادت کو بغیر باپ کے نہیں مانتا۔ ان کے زندہ آسمان پر چلے جانے کا قائل نہیں ہو تو آپ اُسے کافر کیوں کہتے ہیں جبکہ وہ قرآن ہی سے اپنے عقائد کا استنباط کرتا ہے اور اپنے پندار میں اسے صحیح سمجھتا ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک شمع آپکے سامنے بھی روشن ہے اور میرے سامنے بھی۔ آپ اپنی عریاں آنکھ سے اس کی روشنی دیکھ کر کہتے ہیں کہ روشنی سپید ہوا کرتی ہے اور میں ایک مثلثی شیشے کے ذریعہ سے دیکھ کر حکم لگاتا ہوں کہ اس کا نور سات رنگوں سے مرکب ہے، پھر اگر آپ صرف اتنی سی بات پر مجھے اندھا کہدیں تو صریحی ظلم ہے۔ اگر آپ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تو جانے دیجئے آپ کو یہ حق کیوں کر حاصل ہو گیا کہ مجھے آنکھوں والوں کی صف سے بھی نکال دیں بعینہ یہی حالت مسلمانوں کی ہے کہ حنفی شیعی کو برا کہتے ہیں شیعی خارجی کو کافر بتاتا ہے، اشعری معتزلہ کو گمراہ قرار دیتا ہے حالانکہ میرے نزدیک یہ سب مسلمان ہیں اور اصول کے لحاظ سے (اگر خدا کی وحدانیت اور رسول کی رسالت پر کوئی حرف نہیں آتا) شیعی، خارجی معتزلی، وہابی، احمدی، بہائی، نیچری وغیرہ سب کے سب دائرہ اسلام میں داخل ہیں خیر یہ تو ضمنی بات تھی جو عرض کی گئی۔ اصل سوال یہ ہے کہ مذہبیات میں عقل کا درخور ہونا چاہئے یا نہیں؟ سو گزشتہ بیان سے آپ پر واضح ہو گیا ہوگا کہ قرون اولی ہی میں اس کی بنیاد پڑ گئی تھی اور بغیر اس کے چارہ کار نہ تھا۔

پھر اس زمانہ میں بھی جب کہ علوم محدود اور نظری تھے۔ مسائل مشتبہ و موہوم تھے علماء اسلام کو جب اس قدر کاوش کرنی پڑی اور تبلیغ و احکام الٰہیہ میں پوری طرح عقل سے کام لینا ضروری ہوا تو زمانہ موجودہ میں (جبکہ مدرسہ کے لڑکے ارسطو و

افلاطون کے فلسفہ پر بحث کرنے لگے ہیں۔ تلی اور مزدور تک علمی باتیں سمجھنے لگے ہیں مباحث حکمت سے اخباروں کے صفحات پُر نظر آتے ہیں۔ نت نئی ایجادوں کی اختراع کا بازار گرم ہے۔ سائنس نے کورانہ تقلید کی بندشیں کاٹ دی ہیں اور بات بات پر علمی سند طلب کی جاتی ہے۔ عقل سے کام لینے کی ضرورت اور زیادہ قوی ہوگئی ہے اور ہم ایک لمحہ کے لئے اپنے مذہب کی تبلیغ نہیں کر سکتے تا وقتیکہ آہن کا جواب آہن سے دینے کے لئے تیار نہ ہو جائیں۔

اگر آپ اب بھی اپنے قدیم خیالات کی حفاظت کے درپے ہیں اور اب تک تقلیدی اسلام کے دائرہ سے خارج نہیں ہوئے تو آپ کے اسلام پر تو کوئی حرف نہیں آسکتا اور نہ آپ کی نجات میں کلام ہو سکتا ہے لیکن آپ حامی دین نہیں کہلائے جا سکتے اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ اسلام کی خدمت کر رہے ہیں۔ اپنی فرسودہ کشتی پر آپ ہی تنہا سوار ہیں اور چونکہ اس کی بوسیدگی زیادہ بار کی متحمل نہیں ہو سکتی، اس لئے کسی اور طوفان سے نکال کر ساحل تک پہونچانے کی ہمت آپ میں نہیں ہے لیکن وہ شخص جو اسلام کی حقانیت و صداقت کو دلائل عقلی سے ثابت کرنا چاہتا ہے وہ حقیقتاً ایک نہایت وسیع و مضبوط دخانی جہاز تیار کر رہا ہے اور اپنے ساتھ بہت سے لوگوں کو سیلاب سے بچا کر نکال لے جانا چاہتا ہے۔ پھر آپ ہی غور فرمایئے کہ آپ میں اور اس میں افضل کون ہے اور اجتماع بشری پر کس کا احسان رہ جانے والا ہے۔

طوفانِ نوح

(بجواب استفسار جناب محمد منظور الرحمٰن صاحب ہمدرد و پٹنہ)

چونکہ طوفان نوح کا واقعہ عہد قبل تاریخ کا واقعہ ہے، اس لئے اس پر تاریخی حیثیت سے روشنی ڈالنے کا سوال بے معنی ہے، البتہ اگر توریت کو تاریخی کتاب کہا جا سکتا ہے تو اس مسئلہ کی تاریخی حیثیت پیدا ہو سکتی ہے کیونکہ سوائے توریت کے اور کوئی قدیم ذریعہ طوفان نوح کے حالات معلوم کرنے کا نہیں ہے یا پھر کلام پاک ہے جس پر ہمارا آپ کا ایمان ہے۔ ہر چند مجھے یقین کامل ہے کہ کلام پاک میں طوفانِ نوح کا جو حال لکھا گیا ہے وہ بالکل صحیح و درست ہے لیکن اس کو صرف مذہبی صورت سے پیش کیا جا سکتا ہے علیحدہ تاریخی حیثیت نہیں دی جا سکتی اور اس صورت میں واقعہ طوفان کے ساتھ چند در چند ضمنی مباحث مذہبی کا پیدا ہو جانا ضروری ہے۔

اس سلسلہ میں وہ خاص خاص امور جو صراحت چاہتے ہیں حسب ذیل ہیں:۔
نوح کا زمانہ، قوم نوح کا مسکن، قوم نوح کا مذہب، طوفان کا سبب، طوفان کی وسعت، طوفان کا زمانہ، کشتی اور اس میں جانوروں کے جوڑے رکھنا، نوح کے بیٹے اور ان کی بیوی کا غرق ہونا۔

سنہ ۱۸۷۲ء سے پہلے محققین یورپ کا بھی طوفان نوح کے بارے میں عام طور پر وہی خیال تھا جو توریت سے ظاہر ہوتا ہے لیکن حال ہی میں کالڈیا کے کھنڈروں میں مسٹر جارج اسمتھ

نے جب وہ گیارہ اینٹیں نکالی جن میں طوفانِ نوحؑ کا ذکر کیا گیا ہے تو بعض علمائے نے خیال کیا کہ یہودیوں کے یہاں یہ بیان شاید کالڈیا والوں سے منتقل ہوا ہے اور طوفان کا بیان صرف ایک افسانہ ہے لیکن ان کا یہ خیال بالکل غلط ہے۔

چونکہ یہ اینٹیں نینوا سے برآمد ہوئی ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ نینوا کی آبادی کے بعد ان اینٹوں پر طوفان کا قصہ منقوش کیا گیا ہوگا۔ نینوا آشور نے آباد کیا تھا اور اس کا زمانہ سنہ طوفانی تھا یعنی وفات نوحؑ کے پچاس سال بعد (ہم نے جن دلائل کی بنا پر سنہ متعین کیا ہے ان کی صراحت فی الحال غیر ضروری ہے اگر کسی کو شبہ ہو تو ہم سے دریافت کر سکتا ہے)

علمائے یورپ کا خیال ہے کہ یہ اینٹیں دو ہزار سال قبل مسیح کی ہیں۔ اول تو ان کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں، اور اگر ہم اسے صحیح تسلیم کر لیں تو بھی طوفان کا آنا اس سے قبل کا واقعہ ہے کیونکہ عبری توریت کے بیان کے مطابق ۲۳۴۸ سال قبل ولادت مسیح طوفان آیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ کالڈیا والوں کا زمانہ حضرت موسیٰ سے پہلے ہوا ہو لیکن یہ خیال کرنا کہ توریت میں قصہ انھیں لوگوں سے منتقل ہوا صحیح نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جب کالڈیا کا ملک طوفان سے تباہ ہو گیا اور بعد کو نوحؑ کی نسل کے لوگ یہاں آ کر آباد ہوئے تو طوفان کی روایت بھی اپنے ساتھ لائے اور اس طرح کالڈیا کے کسی بت پرست شاعر نے نظم میں لا کر اس کی حیثیت بدل دی اور بت پرستانہ رنگ میں رنگ دیا۔

عبری توریت سے معلوم ہوتا ہے کہ طوفان پیدائش آدمؑ کے ۱۶۵۶ برس بعد

اور توریت کے مغربی ترجموں سے ۲۶۲۲ سال بعد آیا تھا (اس جگہ یہ بحث فضول ہے کہ پیدائش آدم کی یہ مدت صحیح ہے یا نہیں اور سال سے ان کی مراد اس جگہ کیا ہو سکتی ہے) اس لئے یہی زمانہ حضرت نوحؑ کا تھا۔ ایک جگہ توریت سے معلوم ہوتا ہے کہ نوحؑ کی عمر ۶۰۰ سال کی تھی جب طوفان آیا اور اس کے بعد ۳۵۰ سال وہ زندہ رہے یعنی کل ۹۵۰ سال کی عمر انھوں نے پائی لیکن دوسری جگہ صرف ۱۲۰ سال لکھی ہے۔ کلام مجید سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عمر ساڑھے نو سو سال کی ہوئی۔ (فلبث فیھم الف سنة الا خمسین عاما (سورۂ عنکبوت)) ہم یہاں اس مسلہ پر بحث کرنا نہیں چاہتے کہ اس سے مقصود حقیقتاً عمر نوحؑ کا بیان ہے یا ان کے نام کا اتنے عرصے تک چلنا مراد ہے۔

قوم نوحؑ کا مسکن وہاں تھا جسے آرمینیا کہتے ہیں اور وہیں وہ پہاڑ ہے جسے اب ارارات کہتے ہیں۔ عربی میں اسی پہاڑ کا نام جودی ہے۔ کلام مجید سے اس قوم کا بت پرست ہونا ثابت ہوتا ہے اور اسی بت پرستی کے خلاف حضرت نوحؑ وعظ فرماتے تھے اور اسی نافرمانی کی وجہ سے اللہ نے طوفان کی صورت میں ان پر عذاب نازل کیا۔

اٹھارھویں صدی کے اخیر تک یورپ میں بھی عام طور پر یہی خیال کیا جاتا تھا کہ یہ طوفان ساری دنیا کو محیط ہو گیا تھا لیکن بعد کو یہ خیال نہیں رہا حقیقت یہی ہے کہ یہ طوفان آرمینیا ہی میں آیا اور وہیں چاروں طرف پھیل کر دجلہ و فرات کی وادیوں تک پہونچ گیا۔ یوں بھی یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت نوحؑ ایک مخصوص قوم کے لئے

مبعوث ہوئے تھے اور اسی قوم کے تمرّد کی سرکشی پر طوفان کا عذاب نازل ہوا تھا۔ پھر ساری دنیا کا اس میں مبتلا ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ کلام مجید میں بھی سورۂ انبیا کی آیات ۷۶، ۷۷ سے یہی ثابت ہوتا ہے۔

طوفان کا سبب کثرت بارش دریاؤں کا سیلاب اور زمین سے چشموں کا پھوٹ نکلنا تھا۔ قرآن مجید کے الفاظ "وفجرنا الارض عیونا" اور "فار التنور" سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ تنور عربی زبان میں اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں سے کوئی چشمہ پانی کا پھوٹ نکلے، یہاں کسی بڑھیا کا تنور مراد نہیں ہے۔

حضرت نوح کو یقیناً اپنی فطری نطانت یا الہام سے اس عذاب کا حال معلوم ہو گیا تھا اور اسی لئے وہ بہت پہلے سے اپنے بعض اعوان و انصار کی مدد سے کشتی تیار کر رہے تھے، جو طوفان میں انھیں اور چند اہلی جانوروں کو جنھیں وہ ساتھ رکھ سکتے بچا سکی، تمام دنیا کے جانوروں میں سے ایک ایک جوڑا لے لینے کی تصدیق کلام مجید سے نہیں ہوتی۔

توریت میں حضرت نوح کے تین بیٹوں کا ذکر پایا جاتا ہے اور وہ بیٹا جو طوفان میں ڈوبا جو تھا بیٹا نہ تھا بلکہ ان کی بیوی کا بیٹا پہلے شوہر سے تھا۔ سورۂ تحریم کی ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ کی بیوی نافرمان تھی اور اس پر عذاب نازل ہوا اور بعض تفاسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بیوی کشتی میں ان کے ساتھ تھیں لیکن اس میں کوئی تضاد کی بات نہیں کیونکہ حضرت نوحؑ کی دو بیویاں تھیں۔ ایک جو نافرمان تھی غرق ہو گئی، دوسری جو فرماں بردار تھی کشتی میں ساتھ رہی۔

خضر علیہ السلام

(بجواب استفسار جناب محمد عمر صاحب صدیقی تلمری بمبئی)

خضر و موسیٰ کے اس تمام حصے میں جو عام طور پر مشہور ہے حسب ذیل امور قابل غور ہیں :-

۱۔ حضرت موسیٰ کسی ایسے شخص سے ملے یا نہیں جس کو خضر کے نام سے موسوم کرتے ہیں؟

۲۔ یہ کیوں کر معلوم ہوا کہ اس کا نام خضر ہے؟ اور یہ ذریعہ علم کہاں تک قابل اعتبار ہو سکتا ہے؟

۳۔ آب حیات کوئی چیز ہے یا نہیں؟ اور ہے تو کہاں ہے اور خضر نے اُسے پایا یا نہیں؟

۴۔ اگر خضر نے آب حیات پی کر زندگی دوام حاصل کر لی ہے تو یہ زندگی عام انسانی حیات کی طرح ہے یا کسی اور قسم کی، اگر ایسی ہی معمولی انسانی زندگی ہے تو خضر کا مسکن کہاں ہے اور ان کے کیا مشاغل ہیں؟

۵۔ پھر اسی سلسلہ میں "مرج البحرین" کی جغرافی تحقیق مچھلی کے دوبارہ زندہ ہو کر دریا میں جانے کی اصلیت اور ان تین عجیب و غریب باتوں کی تفصیل بھی شامل ہے جو خضر سے موسیٰ کی معیت کے دوران میں سرزد ہوئی تھیں (یعنی ایک کشتی میں سوراخ کر دینا، ایک لڑکے کو مار ڈالنا، ایک گرتی ہوئی دیوار کو درست کر دینا) ہر سے اور سب مسلمانوں کے نزدیک کسی واقعہ کے ثبوت میں مستحکم ترین دلیل جو پیش

کی جاسکتی ہے وہ نصِ قطعی ہے، اس لئے ہمارا فرض ہے کہ سب سے پہلے کلام مجید میں اس واقعہ کی تفصیل تلاش کریں اور پھر غور کریں کہ اس سے زاید جو بیان کیا جاتا ہے وہ کہاں سے لیا گیا ہے اور یہ ماخذ کس حد تک قابلِ وثوق ہے۔

قرآن میں حضرت موسیٰ کا واقعہ دو جگہ سورۂ کہف اور سورۂ قصص میں مذکور ہے فرق یہ ہے کہ سورۂ قصص میں شروع سے لے کر آخر تک کے تمام واقعات حضرت موسیٰ کے بیان کئے گئے ہیں۔ اور سورۂ کہف میں صرف وہ واقعہ لیا گیا ہے جب وہ ایک قبطی کو قتل کرکے گرفتاری کے ڈر سے مدین کی طرف گئے ہیں اور راستہ میں خضر سے ملاقات ہوئی۔ چونکہ سورۂ قصص میں سفرِ مدین کا حال درج نہیں ہے اس لئے آپ کے استفسار کے جواب میں اس سے بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ سورۂ کہف کی آیتوں پر غور کرنا ضروری ہے کہ سفرِ مدین کا حال، خضر و موسیٰ کی ملاقات کا بیان، آبِ حیات اور مچھلی وغیرہ کے قصے (اگر ان کی کوئی حقیقت ہے) انھیں آیتوں سے متعلق ہو سکتے ہیں۔ بحث ذرا طویل ہو جائے گی لیکن ضروری ہے کہ ہم اس جگہ کلام مجید کی ان آیتوں کو پیش کر دیں کہ انھیں پر فیصلہ ہے۔

یہ آیتیں سورۂ کہف میں آٹھویں رکوع سے شروع ہوتی ہیں جن کا ترجمہ یہ ہے:۔

اور جب موسیٰ نے اپنے ساتھی جوان سے کہا کہ میں نہ رکوں گا جب تک مجمع البحرین نہ پہونچ جاؤں یا برسوں اسی طرح چلا جاؤں، پھر جب پہونچے "مجمع البحرین" تو وہ بھول گئے اپنی مچھلی اور وہ چلی گئی سمندر میں لیکن جب وہ اور آگے بڑھے تو موسیٰ نے اپنے رفیق سے کہا کہ "لاؤ ہمارا صبح کا کھانا، بیشک ہم کو اس سفر سے تکلیف پہونچی ہے، اس نے

کہا کیا تم نے دیکھا تھا جب ہم چٹان پر بیٹھے تھے۔ پھر بیشک میں بھول گیا مچھلی کو اور نہیں بھلایا مگر شیطان نے کہ ذکر کروں اس کا اور اختیار کی اس مچھلی نے اپنی راہ دریا میں تعجب ہے کہا موسیٰ نے یہی ہم چاہتے تھے پس وہ لوٹ پڑے اُلٹے پاؤں۔ پھر پایا انھوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ کہ دی تھی اس کو رحمت اللہ نے اپنے پاس سے اور سکھایا تھا اسے اپنے پاس سے علم، اس سے موسیٰ نے کہا کہ میں تیری پیروی کروں۔ اس شرط پر کہ تو بتائے مجھے جو کچھ سکھایا گیا ہے تجھے، اس نے کہا تو میرے ساتھ رہ کر صبر نہ کر سکے گا اور صبر کر بھی کیسے سکتا ہے اس امر پر جس کا تجھے پورا علم نہیں ہے، کہا موسیٰ نے اگر اللہ نے چاہا تو تو مجھے صابر پائے گا اور میں کسی امر میں تیری نافرمانی نہ کروں گا۔ کہا اس نے اگر تو میرے ساتھ چلتا ہے تو مجھ سے کسی امر کی نسبت سوال نہ کرنا یہاں تک کہ میں خود تجھ سے اس کا ذکر نہ کروں، پس وہ دونوں چلے یہاں تک کہ وہ دونوں سوار ہوئے ایک کشتی میں، موسیٰ نے کہا تو نے ڈبونے کے لئے یہ سوراخ کیا، بیشک تو نے نقصان کا کام کیا ہے، اس نے کہا میں نے تجھ سے نہیں کہا تھا کہ تو میرے ساتھ رہ کر صبر نہ کر سکے گا۔ موسیٰ نے کہا مجھے الزام نہ دے اس بات پر جسے میں بھول گیا اور میرے کام میں مشکل نہ پیدا کر، پھر وہ دونوں چلے یہاں تک کہ انھیں ایک نوجوان ملا، پس اس نے اس کو مار ڈالا، موسیٰ نے کہا کیا تو نے اسے ہلاک کر دیا ایک بے گناہ شخص کو بغیر بدلہ جان کے، بیشک تو نے نہایت نامناسب کام کیا۔ اس نے کہا میں نے تجھ سے نہیں کہا تھا کہ تو میرے ساتھ رہ کر صبر نہ کر سکے گا، موسیٰ نے کہا کہ اگر اب میں تجھ سے کوئی سوال کروں تو مجھے اپنے ساتھ نہ رکھنا، بیشک تجھے میری طرف سے عذر پہنچ گیا ہے، پھر دونوں

چلے اور جب وہ ایک بستی کے لوگوں کے پاس پہونچے تو ان سے کھانے کو مانگا مگر ان لوگوں نے کھلانے سے انکار کر دیا پھر ملی ان کو ایک دیوار اس بستی میں جو گرنے والی تھی بس اس نے اس دیوار کو درست کر دیا، موسیٰ نے کہا اگر تو چاہتا تو اس کام کی اجرت لے سکتا تھا، اس نے کہا یہ ہماری تمہاری جدائی ہوتی ہے۔ اب میں تجھے ان باتوں کا سبب بتاتا ہوں جن پر تو صبر نہیں کر سکا تھا کشتی بعض غریب آدمیوں کی تھی جو دریا میں کام کرتے تھے۔ میں نے اسے اس لئے معیوب کر دیا کیونکہ وہاں ایک بادشاہ ہے جو ہر کشتی کو چھین لیتا ہے۔ اب رہا وہ جوان، سو اس کے ماں باپ مسلمان ہیں اور میں ڈرا کہ یہ ان کو اذیت پہونچائے گا اور نافرمانی کرے گا۔ اس لئے میں نے چاہا کہ خدا ایسا بدل انھیں دے جو خلوص و محبت میں اس سے بہتر ہو، رہی دیوار سو وہ دو یتیم لڑکوں کی ہے اور اس کے نیچے خزانہ ہے اور ان کا باپ دیندار شخص ہے اس لئے چاہا پروردگار نے کہ وہ جوان ہو کر خدا کی رحمت سے خزانہ کو نکالیں اور یہ سب میں نے اپنی خوشی سے نہیں کیا، یہ ہے بیان ان باتوں کا جن پر تو صبر نہ کر سکا تھا۔"

یہ ہے نہایت صاف و صریح بیان حضرت موسیٰ کے اس سفر کا جسے انھوں نے اول بار مصر سے نکلنے کے بعد اختیار کیا تھا۔ اس میں نہ کہیں خضر کا نام آیا ہے نہ آبحیات کا ذکر ہے اور نہ کسی اور بات کا جسے عقل باور نہ کر سکے اور پھر اس کی تاویل کی ضرورت ہو تاہم بعض امور صراحت طلب ضرور ہیں۔

سب سے پہلے "مجمع البحرین" کو سمجھ لینا چاہئے کہ اس سے کیا مراد ہے اس کے لغوی معنی ہیں دو سمندروں یا دریاؤں کے ملنے کی جگہ یعنی ان کا سنگم، اکثر مفسرین نے لکھا

ہے کہ اس سے مراد وہ جگہ ہے جہاں بحرِ روم و بحرِ فارس آپس میں ملتے ہیں حالانکہ یہ دونوں نہ کبھی ملے اور نہ مل سکتے تھے اس لئے یہ تحقیق غلط قرار پاتی ہے۔ اب اگر موسیٰ کا یہ سفر مدین کی طرف کا قرار دیا جائے گا جیسا کہ تمام اسلامی تاریخوں سے پایا جاتا ہے تو "مجمع البحرین" سے مراد وہ مقام ہوگا جہاں بحرِ قلزم کی دو شاخیں آپس میں ملی ہیں کیونکہ وہیں سے مدین کو جا سکتے ہیں لیکن اگر یہودی روایتوں کی بنا پر موسیٰ کا یہ سفر اتھوپیا کی طرف قرار دیا جائے گا تو پھر مجمع البحرین سے مراد وہ مقام ہوگا جہاں دریائے نیل کی دو شاخیں خرطوم کے پاس آپس میں ملی ہیں اور جن میں سے ایک کو بحرِ ابیض اور دوسری کو بحرِ اسود کہتے ہیں۔ بہرحال یہ بالکل یقینی ہے کہ اس سے مراد بحرِ روم کا سنگم نہیں ہو سکتا جیسا کہ مفسرین نے ظاہر کیا ہے۔

اس کے بعد "واتخذ سبیلہ فی البحر عجباً" پر غور کرنا ہے عام طور پر جس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ وہ سمندر میں عجیب طریقہ سے چلی گئی، اور بعض مفسرین نے اس لفظ عجباً کی تفسیر میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ مچھلی بھنی ہوئی تھی اور اس کی ضمنی تائید میں بخاری شریف کی ایک حدیث بھی انھیں مل گئی ہے جس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ مچھلی کا غائب ہو جانا ایک خاص علامت تھی جو انھیں بتا دی گئی تھی یعنی جس جگہ مچھلی غائب ہو گی وہیں خضر سے ملاقات ہو گی، اور اس کی تائید ایک طرح خود آیتوں سے بھی ہوتی ہے کیونکہ اس کے بعد ہی حضرت موسیٰ کا یہ کہنا کہ "یہی تو ہم چاہتے تھے" اور پھر اُلٹے پاؤں اسی جگہ واپس جانا اور وہاں ایک اللہ کے بندے کا ملنا سب اس کی تائید کرتے ہیں لیکن اگر اس امر پر غور کر لیا جاتا کہ "اتخذ فی سبیلہ" کے بعد علامت "ق" موجود ہے تو آسانی سے

سمجھ میں آجاتا کہ عجبا کا تعلق اس سے نہیں بلکہ اس واقعہ سے کہ موسیٰ کے ساتھی مچھلی کے گم ہو جانے کو موسیٰ سے ذکر کرنا بھول گئے۔ اس صورت میں آیت "قال ارایت اذ اوینا عجبا" کا مطلب یہ ہوگا کہ جب حضرت موسیٰ نے اپنے ساتھی سے کھانا مانگا تو انھوں نے جواب دیا کہ مچھلی تو میں وہیں بھول گیا تھا جہاں ہم نے آپ نے ایک چٹان پر قیام کیا تھا، اور وہاں سے وہ مچھلی پھر سمندر میں چلی گئی، میں اس واقعہ کا ذکر کرنا بھول گیا جس پر خود مجھے بھی تعجب ہے۔ یہ سن کر موسیٰ نے کہا کہ "ذالک ما کنا نبغ" یعنی یہی تو ہم چاہتے تھے، اس ذلک (یہی) سے مراد جیسا کہ سرسید مرحوم نے لکھا ہے یقیناً غذا (کھانا) ہے نہ کہ مچھلی کا چلا جانا۔ خبر سننے کے بعد حضرت موسیٰ کا پھر اس جگہ واپس آنا صرف اس وجہ سے کہ وہ وہاں پہونچکر دریا سے دوسری مچھلی پکڑنے کی کوشش کریں۔

مجمع البحرین سے آگے نکلنے کے بعد کوئی چیز کھانے کی نہ مل سکتی تھی اور جب وہ واپس آئے تو انھیں اتفاق سے ایک رہبر مل گئے اور یہ ان کے ساتھ ہو لئے۔

اس رہبر کے متعلق بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ پیغمبر تھے اور اس کے ثبوت میں "آتینہ رحمۃ من عندنا وعلمنہ من لدنا علما" اور "ما فعلتہ عن امری" کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے متعلق زیادہ بحث کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، ہر چند امام فخر رازی نے ان کو ثبوت نبوت کے لئے کافی نہیں سمجھا لیکن ان کو نبی مان لیا جاوے تو بھی کوئی حرج پیدا نہیں ہوتا بہر حال یہ نبی ہوں یا نہ ہوں یہ یقینی ہے کہ اس نواح سے واقف تھے اور ان کی وجہ سے موسیٰ کی صحرا نوردی میں بہت کمی ہو گئی۔

اب اس پر غور کرنا چاہئے کہ جب کلام مجید میں نہ کہیں خضر کا نام آیا ہے اور نہ کہیں

اور خلافِ عقل بات کا تذکرہ ہے تو پھر خضر و موسیٰ کا اتنا طویل افسانہ کہاں سے پیدا ہو گیا اس غرض کے لئے جب احادیث کی جستجو کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مفسرین کے ان تمام بیانات کا ماخذ بخاری کی بعض احادیث ہیں۔

ہم ان احادیث کو یہاں نقل نہیں کرتے بلکہ ان کا مفہوم بیان کئے دیتے ہیں وہ مفہوم یہ ہے کہ:۔

ایک دن حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو وعظ و نصیحت کی تو کسی نے پوچھا کہ اے رسول خدا دنیا میں تم سے زیادہ کوئی صاحب علم موجود ہے یا نہیں؟ آپ نے کہا کہ نہیں! اس پر خدا نے وحی بھیجی کہ مجمع البحرین پر میرا ایک بندہ تجھ سے زیادہ صاحب فہم و ادراک ہے، موسیٰ نے کہا کہ میں کیوں کر اس سے مل سکتا ہوں، خدا نے کہا کہ تم اپنی زنبیل میں ایک مچھلی لے لو جہاں وہ گم ہو جائے سمجھ لینا کہ وہیں وہ شخص تم کو ملے گا۔ چنانچہ موسیٰ نے ایسا ہی کیا اور چل کھڑے ہوئے۔ جب وہ ایک چٹان کے پاس پہونچے تو موسیٰ سو گئے اور مچھلی تڑپ کر سمندر میں چلدی، جب آگے چل کر موسیٰ کو اپنے ساتھی (یوشع بن نون) سے یہ حال معلوم ہوا تو پھر اسی جگہ واپس آئے جہاں انھیں ایک شخص سبز چادر اوڑھے ہوئے ملے جن کا نام خضر تھا۔

یہ ہم نے ایک عام مفہوم ظاہر کر دیا ہے ورنہ احادیث کے الفاظ میں بہت اختلاف ہے چنانچہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ جس جگہ چٹان پر مچھلی رکھی تھی اس کے نیچے چشمہ آب حیات کا تھا جب مچھلی کے جسم سے اس پانی نے مس کیا تو وہ زندہ ہو کر چلدی یا خضر کے متعلق ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "وہ سمندر کے درمیان سبز سجادہ

بچھائے بیٹھے تھے۔

چونکہ ان تمام احادیث کے الفاظ میں باہمدگر بہت اختلاف ہے اور یہ امر یقینی ہے کہ یہ تمام روایتیں بالفاظ رسول اللہ بیان نہیں کی گئی اس لئے ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ اصول درایت کی رو سے بھی انھیں جانچے۔ میرے نزدیک اگر ان روایات کی بہت سی خلاف عقل باتوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو بھی ایک ایسی قوی دلیل ہمارے پاس ان کو احادیث نبوی نہ سمجھنے کی موجود ہے کہ اس سے کسی ایک کو انکار ہو ہی نہیں سکتا۔ ان روایات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ کا ذکر ایک نبی کی حیثیت سے کیا گیا ہے اور ان پر وحی بھیجنے کا بھی ذکر ہے۔ اس لئے اگر ان روایات کو درست سمجھ لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ موسیٰ مجمع البحرین کا سفر اختیار کرنے سے قبل ہی نبی ہو چکے تھے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اور خود سورۂ قصص کی آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے بہت زمانہ بعد آپ کو شرف نبوت حاصل ہوا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ رسول اللہ کبھی ایسی بات نہ بیان کر سکتے تھے جو خلاف واقعہ یا نص قطعی کے منافی ہو۔

سر سید کی رائے اس باب میں بہت درست معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ رسول اللہ نے قصص بنی اسرائیل کی روایت کی اجازت دے دی تھی اس لئے لوگوں نے خضر و موسیٰ کے اس واقعہ کو بھی یہودیوں کی روایت کے مطابق بیان کیا لیکن اخیر کے راوی نے یہ خیال کر کے کہ پہلے راوی نے اس واقعہ کو رسول اللہ ہی سے سنا ہوگا آپ سے منسوب کر دیا حالانکہ حقیقت یہ نہ تھی۔

الغرض اس تمام بیان کا خلاصہ یہ ہوا کہ خضر کا نام یا آب حیات کا ذکر کلام مجید

میں آ چکے ہیں اور جو وضاحت میں آیا ہے ان کا حال بھی معلوم ہو چکا اس سے ثابت
ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں جو یہ سارا قصہ مشہور ہے وہ صرف یہودیوں کی روایت کے
مطابق ہے۔ سو اب آپ کو اختیار حاصل ہے خواہ یہودیوں کی اس روایت کو صحیح
سمجھ کر بہت سی خلاف عقل باتوں کا اعتراف کرتے رہیے یا کلام مجید کے بیان کے
مطابق آپ کو ایک معمولی واقعہ سمجھ کر ان عجائب پرستیوں سے احتراز کیجیے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

(بجواب استفسار جناب محمد اکبر خان صاحب کراچی)

جہاں تک میں غور کیا ہے میری سمجھ میں یہی بات آتی ہے کہ جس کلام مجید کی آیات سے حضرت عیسیٰ کی پیدائش وغیرہ کے متعلق خلاف عقل باتوں کے ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اسی سے ان باتوں کی تردید ہوتی ہے لیکن چونکہ کسی نبی کی عظمت اس وقت تک عوام کے دل میں پیدا نہیں ہوتی جب تک بعض خلاف عقل باتوں کا ظہور اس سے منسوب نہ کیا جائے اس لئے لوگوں نے کلام مجید پر کم غور کیا اور ان روایات پر زیادہ اعتماد کر لیا جو ایسی مافوق العادت امور کی مثبت تھیں حالانکہ وہ روایات اصولاً پایۂ اعتبار سے گری ہوئی ہیں

میں آپ کے استفسار کا جواب دینے میں زیادہ شرح و بسط سے تو کام نہیں

ے سکتا لیکن مختصراً تمام امور پر نگاہ ڈالوں گا، اور غور کروں گا کہ کلام مجید کا فیصلہ اس باب میں کیا ہے؟ لیکن قبل اس کے کہ قرآن پاک کی آیتوں پر غور کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً حضرت عیسٰیؑ کا وہ سارا قصہ بیان کر دیا جائے جو عام طور پر باختلاف جزئیات اکثر کتب تاریخ میں درج ہے چنانچہ میں تاریخ کامل ابن اثیر اور ابن خلدون سے اس کا ملخص یہاں درج کرتا ہوں، ابن اثیر کا بیان ہے کہ "ایک شخص عمران بن ماثان (جو داؤد کی نسل میں سے تھا) کا نکاح ایک خاتون حنہ بنت فاقوذ سے ہوا لیکن کوئی اولاد عرصہ تک نہ ہوئی، یہاں تک کہ حنہ بوڑھی ہو گئی، حنہ نے ایک دن خدا سے التماس کی کہ اگر میرے بیٹا ہو جائے تو میں اُسے بیت المقدس کی خدمت کے لئے وقف کر دوں گی خدا نے اس التجا کو سن لیا اور حنہ حاملہ ہو گئی، لیکن قبل ولادت اس کا شوہر عمران مر گیا جب زمانہ ختم ہوا تو بجائے لڑکے کے لڑکی پیدا ہوئی اور اس کا نام مریم رکھا گیا۔ حنہ لڑکی کو دیکھ کر ملول ہوئی کیونکہ لڑکیاں کنیسہ کی خدمت کے لئے وقف نہ ہو سکتی تھیں تاہم وہ اپنے عہد کے مطابق مریم کو متولیان بیت المقدس کے پاس لے گئیں اور اپنی نذر کا سارا حال بیان کر کے کہا کہ اسے لے لو چونکہ یہ لڑکی عمران کی تھی جو اُن کا سردار و امام تھا اس لئے ہر ایک نے چاہا کہ مجھ کو مل جائے لیکن قرعہ حضرت ذکریا کے نام نکلا جو مریم کے خالو بھی تھے۔ یہ اپنی خالہ کے پاس (جن کا نام ایشاع تھا) پرورش پاتی رہیں، جب وہ بڑی ہو گئیں تو مسجد میں ایک بالاخانہ ان کے لئے بنوا دیا جس میں تنہا رہتی تھیں اور عبادت کیا کرتی تھیں لیکن ان کے چچا کا بیٹا یوسف بن یعقوب بن ماثان بھی کنیسہ کی خدمت کیا کرتا تھا اور عیسائی روایات کے بموجب

مریم کا نسبتی شوہر تھا لیکن ابھی تک قربت کی نوبت نہیں آئی تھی۔ یہ دونوں اپنے گھڑے لے کر قریب کے تالاب میں پانی لینے جاتے اور کنیسہ کو لوٹ آتے ایک دن مریم تنہا پانی لینے گئیں تو ان کو فرشتہ نظر آیا جس نے بیٹے کی خوش خبری دی۔ مریم نے کہا یہ کیسے ممکن ہے جبکہ مجھے کسی مرد نے چھوا تک نہیں، یہ سن کر فرشتہ نے کہا کہ ایسا ہی ہوگا اور ان کے گریبان میں پھونک ماری جس سے وہ حاملہ ہو گئیں۔ جب یوسف کو ان کے حاملہ ہونے کا علم ہوا تو اس کو سخت حیرت ہوئی کیونکہ وہ مریم کو بہت عفیفہ خیال کرتا تھا۔ لیکن جب مریم نے فرشتے کی ملاقات کا سارا قصہ بیان کیا تو یوسف خاموش ہو رہا۔

مدت حمل کی نسبت اختلاف ہے کوئی نو مہینے بتاتا ہے کوئی آٹھ مہینے اور بعض نے صرف ایک ساعت بتائی ہے، بہرحال مریم کو جب درد زہ شروع ہوا تو وہ شرقی محراب کی طرف چلی گئیں اور یہیں آپ کے بچہ پیدا ہوا۔ بنی اسرائیل کو علم ہوا تو وہ آئے اور مریم پر تہمت رکھی لیکن جب حضرت عیسیٰ نے گہوارہ سے گفتگو شروع کر دی تو سب چلے گئے اس کے بعد انھوں نے اس حمل کی تہمت ذکریا پر لگائی اور انھیں مار ڈالا، اس باب میں روایتیں مختلف ہیں یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ زمانہ وضع حمل کے قریب یوسف انھیں مصر لے گیا وہیں ولادت ہوئی اور بارہ سال کے بعد مریم حضرت عیسیٰ کو لے کر واپس آئیں (مصر کے دوران قیام میں ان سے بہت سے معجزے ظاہر ہوئے جن کا اجمالی ذکر ہم آئندہ کریں گے)

ان کے آسمان پر اٹھائے جانے کا واقعہ ابن اثیر نے اس طرح لکھا ہے کہ

حضرت عیسیٰ کے پاس کچھ یہودی آئے اور ان پر اور ان کی ماں پر تہمت لگائی حضرت عیسیٰ نے بد دعا کی اور یہ سب سوّر ہوگئے اس پر یہودیوں میں بڑا جوش پیدا ہوا اور آپ کو ہلاک کرنے جمع ہوئے لیکن آپ جبرئیل کی ہدایت کے موافق ایک مکان میں داخل ہوگئے اور وہاں ایک روزن کے ذریعہ سے آسمان پر اٹھا لئے گئے۔ یہودیوں نے ایک آدمی کو مکان کے اندر بھیجا کہ حضرت عیسیٰ کو ہلاک کردے لیکن وہاں کوئی نہ تھا جب یہ آدمی باہر نکلا تو اس کی صورت بالکل حضرت عیسیٰ کی طرح ہوگئی تھی اس لئے اسی کو پکڑ کے صلیب دیدی بعض کا بیان ہے کہ خود حضرت عیسیٰ کے حواریوں میں سے ایک شخص نے ان کی صورت میں تبدیل ہوجانا منظور کرلیا تھا اور اسے مصلوب کیا گیا۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کو پکڑ کر جب صلیب کی طرف لے چلے تو فرشتوں نے آکر اندھیرا کردیا اور جس نے حضرت عیسیٰ کو گرفتار کرایا تھا وہ ان کی شکل میں تبدیل ہوگیا اور اُسے سولی دیدی گئی۔ بہرحال ان تمام روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ مصلوب نہیں ہوئے بلکہ کوئی اور ان کی جگہ مصلوب ہوا اور وہ آسمان پر اُٹھا لئے گئے۔

اس واقعہ کے سات روز بعد حضرت عیسیٰ پھر زمین کی طرف بھیجے گئے کیونکہ مریم بہت ملول تھیں اور مصلوب لاش کے پاس کھڑی رو رہی تھیں آپ جب آسمان سے نیچے اترے تو آپ نے فرمایا کہ میں مصلوب نہیں ہوا ہوں بلکہ خدا نے مجھے اوپر اٹھا لیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے حواریوں کو جمع کیا اور ان کو ہدایت کرکے پھر نوری لباس پہن کر اوپر اڑ گئے، حضرت عیسیٰ کی ولادت حضرت یحییٰ سے چھ ماہ پہلے ہوئی، مریم کی عمر تیرہ، پندرہ یا بیس برس کی تھی جب وہ حاملہ ہوئیں، تیس سال کی عمر میں وہ نبی ہوئے

اور بتیس سال کچھ دن کی عمر میں آسمان پر اٹھالیے گئے۔

ابن خلدون نے سب سے پہلے مریم کے نسبی سلسلہ کی تحقیق کی ہے اور انجیلوں کی روایات میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کو ظاہر کیا ہے، اسی کے ساتھ یعقوب بن یوسف کی کتاب کے حوالے سے یہ بتایا ہے کہ مریم کے والد کا نام یواقیم تھا جو نسل داؤد سے تھے اور ظاہر کیا ہے کہ ممکن ہے عبرانی زبان میں عمران ہی یواقیم کہتے ہیں کہتے ہوں (چونکہ قرآن پاک میں مریم کو بنت عمران ظاہر کیا گیا ہے، اس لئے ابن خلدون کو یہ تاویل کرنے کی ضرورت ہوئی) اس کے بعد طبری کے حوالہ سے مریم کی ولادت اور زکریا کی کفالت میں دیے جانے کے وہی واقعات لکھے ہیں جو ابھی ہم ابن اثیر کے حوالہ سے درج کر چکے ہیں۔

یعقوب بن یوسف کی کتاب کے حوالے سے بعد کے حالات اس طرح لکھے گئے ہیں کہ:۔

"حنہ (مریم کی ماں) کا انتقال اس وقت ہوا جب مریم کی عمر ۸ سال کی تھی بنی اسرائیل کے ہاں رواج تھا کہ جب کوئی عورت طریق ازدواج کو پسند نہ کرتی تو اس پر ہیکل کی مجاورت فرض ہو جاتی۔ چنانچہ خدا نے الہام کیا کہ اولاد ہارون جمع کی جائے اور جس کے عصا سے کوئی علامت ظاہر ہو مریم اسی کے سپرد ہوں اور اسی کے ساتھ منسوب کی جائیں جب یہ سب جمع ہوئے تو یوسف نجار کے عصا سے ایک کبوتر سفید رنگ کا نکل کر سر پر بیٹھ گیا۔ یوسف، مریم کو لے کر ناصرہ چلے گئے (جہاں یوسف کا اصلی وطن تھا) مریم کی عمر اس وقت بارہ سال کی تھی یہیں تالاب سے پانی بھرنے کی حالت

میں فرشتہ نے بشارت دی اور آپ حاملہ ہوئیں۔ اس کے بعد مریم بیت المقدس زکریا کے پاس گئیں لیکن ان کا انتقال ہو چکا تھا اس لئے پھر ناصرہ واپس آئیں۔ اب یوسف کو حمل کا علم ہوا تو اسے سخت تعجب ہوا لیکن جب فرشتہ نے خواب میں آکر بتایا کہ یہ حمل روح القدس سے ہے تو یوسف کو مریم کی عفت کا یقین آیا۔"

اسی کے ساتھ ابن خلدون نے طبری کی بھی وہ روایت درج کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف مریم کے ساتھ بیت المقدس ہی میں رہتا تھا اور پھر استقرار حمل کے بعد مصر چلا گیا۔ راستہ میں دردِ زہ ہو کر وضع حمل ہوا۔ یوسف ان کو گدھے پر سوار کرا کے لے گیا اور لوگوں سے اس راز کو پوشیدہ رکھا یہاں تک کہ بارہ برس کا زمانہ گزر گیا۔ اس زمانہ میں مسیح سے بہت سی کرامات ظاہر ہوئیں اس کے بعد حکم ہوا کہ عیسیٰ کو لے کر کر ایلیا (بیت المقدس) واپس جائیں چنانچہ مریم آپ کو لیکر بیت المقدس آئیں اور یہاں آپ سے بہت سے معجزات ظاہر ہوئے اس کے بعد آپ کے مصلوب ہونے اور آسمان پر اٹھائے جانے کے واقعات بعض اختلافات کے ساتھ وہی بیان کئے ہیں جو ابن اثیر کے حوالہ سے بیان ہو چکے ہیں۔

چونکہ تاریخ کی کتابوں اور انجیل کی روایتوں میں باہم اس قدر اختلاف ہے کہ حضرت عیسیٰ کی زندگی کے متعلق کسی واقعہ کی تحقیق ان کی مدد سے نہیں ہو سکتی اور خود رسول اللہ کے زمانہ میں مسیح کے متعلق عجیب و غریب اعتقاد لوگوں میں رائج تھے یہاں تک کہ بعض لوگ ان کو خدا کا بیٹا اور بعض ناجائز مولود کہتے تھے اس لئے ظاہر ہے کہ ہم کو صرف قرآن پاک پر غور کرنے سے حقیقت کا علم ہو سکتا ہے جس میں تمام

تو اعتقادات و تجربے کے خلاف صحیح واقعات کی خبر دی گئی ہے

حضرت عیسیٰؑ کا ذکر یوں تو کلام مجید میں کثرت سے پایا جاتا ہے لیکن امور زیر بحث پر غور کرنے کے لئے ہم کو سورۂ آل عمران، سورۂ مائدہ اور سورۂ مریم کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ سورۂ مریم میں ان کی پیدائش کے واقعات درج ہیں اور سورۂ مائدہ میں صرف ان کے معجزات کا ذکر ہے (جن میں اندھوں، کوڑھیوں کو اچھا کرنا، مُردوں کو جلانا وغیرہ شامل ہے) اور سورۂ آل عمران میں پیدائش سے لے کر آخر تک تمام واقعات کا بیان ہے اس لئے ہم سب سے پہلے آلِ عمران اور سورۂ مریم کی آیات کا ترجمہ درج کرتے ہیں جن میں حضرت عیسیٰ کی پیدائش کا حال درج ہے:-

"جب کہا فرشتوں نے اے مریم اللہ خوش خبری دیتا ہے تجھ کو اپنی طرف سے ایک کلمہ کی بابت جس کا نام مسیح عیسیٰ مریم کا بیٹا ہوگا جو دنیا و آخرت میں صاحبِ وجاہت ہوگا۔ خدا کے مقربین میں سے ہوگا، لوگوں سے کلام کریگا گہوارہ میں اور بڑی عمر میں اور ہوگا نیکوں میں سے۔ مریم نے کہا اے پروردگار میرے، میرے لڑکا کیسے ہو سکتا ہے درانحالیکہ مجھے کسی مرد نے نہیں چھوا، خدا نے کہا یوں ہوگا اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے، جب وہ کسی کام کا کرنا ٹھہرا لیتا ہے تو کہہ دیتا ہے ہو جا، اور وہ کام ہو جاتا ہے"

مریم کی آیات کا ترجمہ ملاحظہ ہو:-

"اور ذکر کر کتاب میں مریم کا جب وہ علیحدہ ہوئی اپنے لوگوں سے ایک شرقی مکان میں پھر کر لیا اس نے ان کی طرف سے پردہ پس بھیجا ہم نے اس کے

پاس اپنی روح کو جو بن گئی اس کے سامنے ایک پورا آدمی، مریم نے کہا میں
خدا کی پناہ مانگتی ہوں تجھ سے اگر ہے تو پرہیزگار ہو اس نے کہا میں تو تیرے
پروردگار کی طرف سے پیغام لے کر آیا ہوں کہ میں تجھے ایک پاکیزہ بیٹا دونگا
مریم نے کہا میرے بیٹا کیسے ہو سکتا ہے درانحالیکہ مجھے کسی مرد نے نہیں چھوا
اور نہ میں نے کبھی بدکاری کی، فرشتہ نے کہا ایسا ہی ہوگا، تیرے رب نے
کہا ہے یہ میرے لئے آسان ہے اور ہم بنائیں گے اس کو نشانی لوگوں کیلئے
اور رحمت اپنی طرف سے اور یہ امر ٹھہرایا ہوا ہے، پھر حمل ٹھہرا مریم کو اور وہ
دور چلی گئی، پھر درد زہ اس کو ایک کھجور کی جڑ میں لے لیا مریم نے کہا کاش
میں اس سے پہلے ہی مر گئی ہوتی اور مٹ جاتی، پھر اس کو پکارا کسی نے نیچے
سے کہ رنجیدہ نہ ہو، جاری کیا ہے تیرے پروردگار نے نیچے ایک چشمہ تو کھجور
کو ہلا وہ تجھ پر تر و تازہ پھل گرائے گا تو اسے کھا اور پی اور ٹھنڈی کر اپنی آنکھ
اگر تو کسی آدمی کو دیکھے تو کہہ کہ میں نے اللہ کے نام پر روزہ رکھا ہے اور میں
آج کسی سے بات نہ کروں گی، پھر مریم اپنے بیٹے کو قوم کے پاس لائی، انھوں نے
نے کہا اے مریم تو عجیب چیز لائی ہے۔ اے ہارون کی بہن نہ تیرا باپ خراب
آدمی تھا اور نہ تیری ماں خراب تھی، پھر اشارہ کیا مریم نے لڑکے کی طرف، لوگوں
نے کہا ہم کیا بات کریں اس سے جو تھا ایک لڑکا گہوارہ میں، عیسیٰ نے کہا میں خدا
کا بندہ ہوں۔ دی ہے اس نے مجھے کتاب اور بنایا ہے مجھے نبی اور مجھ کو
کیا ہے برکت والا، جہاں کہیں میں ہوں اور مجھ کو ہدایت کی ہے نماز روزہ کی

جب تک میں ز ... ں اور بنایا ہے ... کرنے والا اپنی ماں کے ساتھ اور
نہیں بنایا مجھے سرکش بدبخت، اور سلام ... جس دن میں پیدا ہوا جس دن
میں مروں گا اور جس دن میں زندہ ہو کر اٹھوں گا۔

یہ ہے سچا قصہ ... مریم کا جس میں لوگ اختلاف کرتے ہیں۔ خدا کے لئے یہ موزوں نہیں کہ اس کے لئے کوئی بیٹا ہو وہ اس سے پاک ہے وہ جب کسی کام کو کرنا چاہتا ہے تو کہہ دیتا ہے ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔"

قبل اس کے کہ ہم کلام مجید کے مندرجہ بالا بیان پر غور کریں یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ خدا نے حضرت عیسیٰ کے نسب کے متعلق کیا فرمایا ہے۔ سورۂ انعام میں نہایت وضاحت کے ساتھ یہ بات بیان کر دی گئی ہے کہ حضرت عیسیٰ آل ابراہیم سے ہونگے "وتلک حجتنا آتینہا ابراہیم علی قومہ نرفع درجت من نشاء، ان ربک حکیم علیم، ووہبنا لہ اسحاق ویعقوب کلاً ہدینا ونوحاً ہدینا من قبل ومن ذریتہ داؤد وسلیمان وایوب ویوسف وموسیٰ وہارون وکذلک نجزی المحسنین وزکریا وعیسیٰ والیاس کل من الصالحین الخ"

اب اگر حضرت عیسیٰ کی ولادت بغیر باپ کے تسلیم کی جائے اور صرف مادری سلسلۂ نسب پر لحاظ کیا جائے تو دیکھنا چاہئے کہ مریم آل ابراہیم یا آل داؤد سے تھیں یا نہیں؟ کلام مجید میں ایک جگہ مریم کو بنت عمران (عمران کی بیٹی) کہہ کر پکارا گیا ہے[1] اور دوسری جگہ اخت[2] ہارون (ہارون کی بہن) کے لقب سے یاد کیا گیا ہے گویا

---

[1] ومریم ابنت عمران التی احصنت فرجہا الخ (سورۂ تحریم۔ آیت ۱۱)
[2] یا اخت ہارون ما کان ابوک الخ (سورۂ مریم آیت ۲۰)

اس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ مریم کے باپ کا نام عمران تھا اور ہارون ان کے بھائی تھے۔ اس پر عیسائی علماء نے اعتراض بھی کیا ہے کہ ہارون کے زمانہ سے مریم کو کیا نسبت ہو سکتی ہے لیکن وہ اس امر کو نہیں سمجھے کہ مریم کو ہارون کی بہن کہنا کسی حقیقی رشتہ کا اظہار نہیں ہے بلکہ صرف اس مماثلت کی بناء پر ہے کہ جس طرح ہارون حفاظت و خدمت ہیکل کے لئے مامور تھے اسی طرح مریم کی بھی زندگی شروع ہوئی یہ صحیح ہے کہ موسیٰ کی بہن کا نام بھی مریم تھا لیکن اس جگہ مریم کو اخت ہارون کہنے سے یہ نتیجہ نکالنا کہ قرآن میں عیسیٰ کی ماں مریم اور موسیٰ کی بہن مریم کو ایک ہی ہستی قرار دیا گیا ہے درست نہیں ہو سکتا اس لئے اخت ہارون کے الفاظ سے مریم کے سلسلہ نسب پر تو کچھ روشنی نہیں پڑ سکتی، اب رہ گیا ان کو عمران کی بیٹی کہنا سو یقیناً یہ بھی اسی لحاظ سے کہا گیا ہے جس طرح اخت ہارون کے الفاظ کو استعمال کیا گیا ہے۔ کلام مجید میں آل، اخت ابن، بنت وغیرہ کا استعمال بہت وسیع معنی میں ہوا ہے اور ان الفاظ سے وہ قریب کا رشتہ مراد نہیں لیا گیا ہے جو ان کے معنی سے متبادر ہوتا ہے اس لئے مریم کو بنت عمران کہنا یہ معنی رکھتا کہ وہ واقعی عمران کی بیٹی تھیں بلکہ اس سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ وہ آل عمران میں سے تھیں جن کی بزرگی کے بارے میں کلام مجید میں یہ آیت آئی ہے۔

"ان اللہ اصطفیٰ آدم و نوحاً و آل ابراہیم و آل عمران علی العالمین"

مریم کے والد کون تھے یہ امر بالکل تاریکی میں ہے اور اسی لئے عیسیٰ کا سلسلہ نسب داؤد تک متعین نہیں ہو سکتا۔ اور اگر مریم کی ولادت کو بھی بغیر باپ کے تسلیم کر لیا جائے جیسا کہ بعض عیسائی جماعتوں کا خیال ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ مریم کے نانا کون تھے اور

ان کا سلسلۂ نسب آلِ داؤد سے ملتا ہے یا نہیں؟ اور اگر مریم کے باپ کا نام واقعی عمران صحیح تسلیم کیا جائے تو ان کے نسب نامہ کے متعلق اس قدر اختلاف ہے کہ خود عیسائیوں کو اکثر جگہ تاویل کی ضرورت محسوس ہوئی اور یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس سلسلہ سے آلِ داؤد میں شمار ہو سکتے ہیں بعض نے انھیں ناثان کی اولاد میں شامل کیا ہے، ابن اسحاق انھیں یاشیم بن امون کی اولاد بتاتا ہے۔ ابن عساکر نے زریاقیل کے سلسلہ سے ابن ناثان ہونا ثابت کیا ہے اور انجیلوں میں باہم سخت اختلاف ہے یہاں تک کہ بعض جگہ مریم کا بھی بغیر باپ کے پیدا ہونا ظاہر کیا گیا ہے اور بعض بیانات سے بجائے عمران کے مریم کے باپ کا نام یواقیم درج ہے۔ بہرحال مریم کے والد کا حال چونکہ بالکل تاریکی میں ہے اس لئے اس پر اعتماد کر کے حضرت عیسیٰ کو مادری سلسلہ سے آلِ ابراہیم یا آلِ داؤد میں شامل نہیں کیا جا سکتا حالانکہ قرآن پاک سے صراحۃً ان کا ذریات ابراہیم یا آلِ داؤد میں ہونا ثابت ہے البتہ اگر مریم کے نسبتی شوہر یوسف نجار کو عیسیٰ کا باپ تسلیم کر لیا جائے تو آسانی سے حضرت عیسیٰ کا آلِ داؤد میں ہونا ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ یوسف یقیناً آلِ ناثان میں سے تھا اور ناثان کا سلسلۂ نسب داؤد تک پہونچتا ہے جیسا کہ متی انجیل سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کے باپ کا نام یوسف تھا اور وہ بیٹے تھے یعقوب کے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے یوسف حضرت عیسیٰ کے باپ نہ تھے اور وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے ہیں تو پھر انجیل و قرآن کی یہ صراحت کہ وہ آلِ داؤد میں سے ہوں گے بالکل لغو ہو جاتی ہے کیونکہ اول تو مریم کا سلسلۂ نسب داؤد تک پہونچتا نہیں اور اگر پہونچے بھی تو ساقط الاعتبار ہے کیونکہ

یہودیت میں ہمیشہ سلسلہ نسب باپ کا قابل لحاظ تسلیم کیا جاتا تھا اور ماں کے سلسلہ نسب کو کوئی نہ پوچھتا تھا۔ یہاں تک تو گفتگو سلسلہ نسب کے لحاظ سے ہوئی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگر عیسیٰ کی ولادت بغیر باپ کے تسلیم کی جائے تو نص قطعی اس کی معارض معلوم ہوتی ہے۔

اب دوسری صورت بحث کی یہ ہے کہ نفس مسئلہ ولادت مسیح کے متعلق انجیل و قرآن کی آیات پر غور کیا جائے۔ انجیلیں چار ہیں۔

(۱) متی کی انجیل جو حضرت عیسیٰ کے دو سال بعد لکھی گئی اور تمام انجیلوں میں بہت قدیم ہے۔

(۲) لوک کی انجیل جو ۳۰-۴۱ سال بعد تحریر میں آئی۔

(۳) یوحنا کی انجیل جو ۶۳-۶۴ سال بعد لکھی گئی۔

(۴) مارک کی انجیل جو اس کے بہت بعد کی ہے۔

ان چاروں انجیلوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف مریم کے شوہر اور عیسیٰ کے باپ تھے متعدد مقامات پر اسی نسبت کا اظہار کیا گیا ہے (دیکھو انجیل متی باب ۱ ورس ۱۶۔ لوک کی انجیل باب ۲ ورس ۲۳۔ یوحنا کی انجیل باب ۶ ورس ۴۲)

کلام مجید کی آیات میں کسی جگہ اس کا اظہار نہیں کیا گیا کہ آپ کی ولادت بغیر باپ کے ہوئی ہے لیکن بعض الفاظ ایسے ہیں جن سے یہ مفہوم اخذ کیا جاتا ہے اس لئے آیئے اب ان الفاظ پر غور کریں کہ اصل بحث یہی ہے اور اسی پر فیصلہ کا انحصار ہے۔

اب آپ آل عمران کی اُن آیتوں کو جنھیں ہم درج کر چکے ہیں ان میں سب سے

پہلا وہ لفظ جس کو ولادت مسیح سے متعلق سمجھا جاتا ہے کلمہ کا لفظ ہے یعنی ملائکہ کا مریم سے یہ کہنا کہ ہم تجھے خوش خبری دیتے ہیں خدا کی طرف سے ایک کلمہ کی جس کا نام مسیح ابن مریم ہوگا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ مسیح واقعی خدا کے صرف ایک کلمہ تھے اور یہی کلام مسیح کی ولادت کا باعث ہوا لیکن کسی شخص کا ایسا خیال کرنا نافہمی کی دلیل ہے کیونکہ اول اس کے یہ معنی ہو ہی نہیں سکتے کہ جس کلمہ کی خوش خبری دی جاتی ہے اس کا نام مسیح ہوگا، کیونکہ لفظ کلمہ مونث ہے اور اسمہ میں ضمیر مذکر کی ہے اگر وہ مقصود ہوتا تو اسمہا ہونا چاہیئے تھا۔ دوسرے یہ کہ اگر مسیح کو کلمہ الٰہی سمجھ لیا جائے تو بھی اس سے ان کی ولادت بے باپ کیسے ثابت ہو سکتی ہے۔

(۔) کلمہ کا لفظ کلام مجید اکثر جگہ آیا ہے لیکن کسی جگہ اس کے معنی لفظ یا کلام کے نہیں لئے گئے اکثر جگہ تو اس سے مراد پیشین گوئی لی گئی ہے لیکن کہیں کہیں احکام ربانی کتاب الٰہی اور مخلوقات مراد ہیں مثلاً:۔

ان اللہ یبشرک بیحییٰ مصدقاً بکلمۃ من اللہ	یہاں کلمہ سے مراد پیشین گوئی ہے
لا تبدیل لکلمات اللہ	اس جگہ بھی پیشین گوئیاں یا مقادیر الٰہیہ مراد ہیں
ولقد کذبت رسل من قبلک فصبروا علیٰ ما کذبوا واوذوا حتیٰ اتاہم نصرنا ولا مبدل لکلمات اللہ۔ (انعام، آیت ۳۴)	یہاں بھی کلمات سے پیشین گوئیاں مراد ہیں۔
قل لو کان البحر مداداً لکلمات ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی ولو جئنا بمثلہ مدداً۔	یہاں کلمات سے مخلوقات مراد ہیں۔

پھر جب قرآن پاک میں کسی جگہ کلمہ کے معنی لفظ کے نہیں آئے تو آل عمران کی اس آیت میں کیونکر وہ معنی مراد ہو سکتے ہیں ظاہر ہے کہ یہاں بھی کلمہ کے معنی پیشین گوئی کے ہیں جیسا کہ امام رازی نے بھی ظاہر کیا ہے یا صرف مخلوق کے! اور اس لحاظ سے آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ فرشتوں نے مریم سے کہا کہ اللہ تجھے ایک بیٹے کی پیشین گوئی کی خوشخبری دیتا ہے جس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا، لفظ ولد یبشرک کے بعد محذوف ہے جیسا کہ سورۂ حجر کی آیت ۵۵ میں قالوا بشرنٰک کے بعد لفظ ولد محذوف ہے اور اسی طرح محذوفات پُر کرنے کے بعد آیت یوں ہوگی۔

ان اللہ یبشرک بکلمۃ منہ (بولد) اسمہ المسیح الخ یعنی: اللہ خوشخبری دیتا ہے تجھے اپنی طرف سے ایک پیشین گوئی کی (اور وہ پیشین گوئی ایک لڑکے کی ہے) جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا، لفظ ولد کو حذف کرکے اس کا مفہوم مراد لینا بالکل اسی طرح ہے جس طرح ہم لوگ کنایۃً کسی کو حاملہ ظاہر کرنے کے لئے کہتے ہیں کہ فلاں عورت امید سے ہے یا ولادت کے متعلق کہا کرتے ہیں کہ خدا جلد کوئی خوشخبری سنائے، بالکل یہی انداز بیان اس جگہ کلام مجید کا ہے۔ بہرحال اس آیت میں لفظ کلمہ سے کوئی مفہوم ایسا اخذ نہیں ہو سکتا جس سے عیسیٰ کا بن باپ کے پیدا ہونا ثابت ہوتا ہو۔ سورۂ مریم میں بجائے لفظ کلمہ کے صراحتاً الفاظ غلاماً زکیا (پاکیزہ لڑکا) استعمال کئے گئے ہیں اور یہ مزید ثبوت اس امر کا ہے کہ یہاں بھی لفظ کلمہ کا مفہوم وہی ہے نہ کہ کلام خداوندی۔

آل عمران کی دوسری آیت جو اس امر کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہے یہ ہے:

قالت رب انی یکون لی ولد ولم یمسسنی   مریم نے کہا اے پروردگار میرے لڑکا کیسے

بشر قال کذلک اللہ یخلق ما یشاء اذا قضی امرا فانما یقول لہٗ کن فیکون۔

ہو سکتا ہے درانحالیکہ مجھے کسی مرد نے نہیں چھوا، خدا نے کہا یہی ہوگا۔ اللہ پیدا کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے، جب وہ کسی کام کا کرنا ٹھہرا لیتا ہے تو کہہ دیتا ہے ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔

مریم کا یہ کہنا مجھے کسی مرد نے نہیں چھوا، اس بات کا ثبوت نہیں کہ عیسیٰ کے کوئی باپ نہ تھا کیونکہ مریم کا تعلق ازدواج تو یقیناً اس سے ثابت ہے کہ ان کے اولادیں بھی تھیں پھر جس طرح اور اولادیں تعلق ازدواج کے بعد ہوئیں اسی طرح حضرت عیسیٰ کی ولادت ہوئی ہوگی، البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ جس وقت مریم کو بشارت دی گئی اس وقت تک ان کا نکاح نہ ہوا ہوگا اور اسی لئے انھوں نے کہا کہ مجھے تو اب تک مرد نے نہیں چھوا ہے لیکن بعد کو تعلق ازدواج قائم ہوا اور حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے۔

یہاں پر ایک اور نکتہ قابل غور ہے وہ یہ کہ ،،قال کذلک،، سے آگے کی عبارت ،،اللہ یخلق ما یشاء،، سے متعلق ہے یا نہیں، سورۂ مریم میں بھی یہی الفاظ آئے ہیں لیکن اس طرح ،،قال کذلک، قال ربک ہو علی ہین،، اس سے یہ معنی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح سورۂ مریم میں قال کذلک علیحدہ ہے۔ اسی طرح سورۂ آل عمران میں بھی ہے اور اس صورت میں اس کا مطلب ہوگا کہ جب مریم نے کہا کہ میرے کیسے بیٹا ہوگا جبکہ مجھے کسی مرد نے نہیں چھوا تو فرشتہ نے کہا ،،کذلک،، (ایسا ہوگا) یعنی تمھیں مرد چھوئے گا اور تمھارے اولاد ہوگی۔

اب رہے الفاظ ،،اللہ یخلق ما یشاء،، اور ،،اذا قضی امرا فانما یقول لہٗ کن فیکون،، سو ان سے بھی عیسیٰ کی ولادت غیر معمولی طور پر ثابت نہیں ہو سکتی کیونکہ خدا تمام امور کو

اپنے ہی طرف منسوب کرتا ہے اور قانون قدرت کے مطابق ظاہر ہونے والے تمام واقعات کو بھی یخلق ما یشاء اور کن فیکون کے انداز میں بیان کرتا ہے۔ کلام مجید میں نہایت کثرت سے ان الفاظ کا استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ مقصود یہی ہے کہ تمام امور کو اپنے سے منسوب کرے۔ کن فیکون سے کہیں اور کسی مفسر کے نزدیک یہ مراد نہیں ہے کہ کسی امر کا وقوع یا کسی شئے کا وجود فوراً اسی لمحہ ہو جائے۔ اسی کے ساتھ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ولادت مسیح کے غیر معمولی طور پر ہونے کا اظہار مقصود ہوتا تو یخلق کیف یشاء کہا جاتا نہ کہ یخلق ما یشاء۔

اب سورۂ مریم کی آیتوں پر غور کیجئے۔

اذ انتبذت من اہلہا مکانا شرقیا۔ مکان شرقی سے مراد حضرت مریم کی خوابگاہ ہے یا ان کی عبادت کی جگہ جہاں بحالت خواب ان کو فرشتہ نظر آیا اور اس سے وہی گفتگو ہوئی جس کا ذکر سورۂ آل عمران میں ہو چکا ہے۔ آگے چل کر ولنجعلہ آیۃ للناس ورحمۃ منا کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں لیکن ان کا تعلق حضرت عیسیٰ کی آئندہ زندگی اور نبوت سے ہے نہ کہ ولادت اور طریق ولادت سے۔

اس کے بعد مریم کے حاملہ ہونے کا اور ان کے چلے جانے کا ذکر ان الفاظ میں ہے۔ فحملتہ فانتبذت بہ مکانا قصیا۔ جب کلام مجید میں کوئی قصہ یا واقعہ بیان کیا جاتا ہے تو درمیان کی غیر ضروری کڑیاں چھوڑ کر خاص خاص باتوں کا ذکر کر دیا جاتا ہے لیکن بعض لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح واقعات بیان ہوئے ہیں وہ مسلسل اور فوراً وقوع میں آئے ہیں۔ سورۂ مریم میں پہلے مریم کا فرشتہ کو

مفصلاً بیان ہوا ہے، اور اس کے بعد ہی حاملہ ہونے، وضع حمل کی تکالیف میں مبتلا ہونے، عیسیٰ کو اپنی قوم کے پاس لانے اور عیسیٰ کا لوگوں سے گفتگو کرنے کے واقعات بیان ہوئے ہیں لیکن تمام جملے ف ہ سے شروع کئے گئے ہیں جس سے ترتیب واقعات تو ضرور ظاہر ہوتی ہے لیکن قرب زمانی سے اس کو کوئی واسطہ نہیں ہے بعض لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تمام واقعات فوراً ہو گئے یعنی فرشتہ کا آنا، مریم کا حاملہ ہونا وضع حمل ہو جانا اور مسیح کا بولنا یہ سب ایک ہی ساعت یا دن میں ہو گیا، حالانکہ مقصود صرف واقعات کو اس ترتیب سے ظاہر کرنا ہے نہ یہ کہ وہ فوراً وقوع میں آ گئے سورۂ مریم کی آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مریم حاملہ ہونے کے بعد کسی دور جگہ چلی گئیں اور تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جگہ ناصرہ تھی یا مصر جہاں وہ اپنے نسبتی شوہر یوسف نجار کے ساتھ تشریف لے گئیں اس کے بعد آیت "فاجاءھا المخاض" سے شروع ہوتی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وضع حمل کی بیں کسی بلند مقام پر ہوا جبکہ مریم حالت سفر میں ... اور وضع حمل کی وہ تمام تکالیف آپ پر طاری ہوئیں جو عام طور پر ظاہر ہوتی ہیں یہ گویا دوسرا ثبوت اس امر کا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی ولادت اس طرح ہوئی جس طرح عام طور پر تمام بچوں کی ہوتی ہے۔ پھر وہ آیتیں ہیں جن میں حضرت مریم کا عیسیٰ کو اپنی قوم کے پاس لانا وغیرہ بیان ہوا ہے اور ان میں بعض الفاظ تو ضرور غور طلب ہیں ہم ان کو مکرر درج کرتے ہیں۔

فاتت بہ قومھا تحملہ، قالوا یا مریم لقد جئت شیئاً فریا، یا اخت ہارون ما کان ابوک امرا سوء وما کانت امک بغیا۔ فاشارت الیہ قالوا کیف نکلم من کان فی المھد صبیا،

قال انی عبداللہ اتانی الکتاب وجعلنی نبیا الخ

ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ جب مریم، حضرت عیسیٰؑ کو لے کر اپنی قوم کے پاس آئیں تو انھوں نے کہا اے مریم یہ تم عجیب چیز لے کر آئی ہو حالانکہ نہ تمہارا باپ برا تھا اور تمہاری ماں خراب تھی یہ سن کر انھوں نے حضرت عیسیٰ کی طرف اشارہ کیا کہ اسی سے پوچھو، اس پر لوگوں نے کہا کہ ہم اس سے کیا بات کریں جو گہوارہ کا بچہ تھا۔ اس پر عیسیٰ نے کہا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں مجھے کتاب دی گئی ہے اور میں نبی بنایا گیا ہوں وغیرہ وغیرہ۔

غور طلب امر یہ ہے کہ قوم نے کیوں کہا کہ تم عجیب چیز لے کر آئی ہو اور کیوں مریم کے ماں باپ کے متعلق کہا کہ وہ خراب نہ تھے اسی کے ساتھ مریم کا عیسیٰ کی طرف اشارہ کرنا اور قوم کا یہ کہنا کہ ہم بچہ سے کیا بات کریں اور پھر حضرت عیسیٰ کا گفتگو کرنا ان تمام باتوں کی کیا اصلیت ہے۔

عام طور پر ان آیات کا یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ بچہ پیدا ہوتے ہی مریم اس کو قوم کے پاس لے آئیں اور چونکہ مریم کی شادی کسی سے نہ ہوئی تھی اس لئے ان کو بچہ پیدا ہونے پر تعجب ہوا اور انھوں نے مریم پر یہ الزام لگایا کہ تمہارے ماں باپ تو ایسے نہ تھے یہ تم نے کیا حرکت کی کہ ناجائز بچہ پیدا ہوا لیکن حضرت عیسیٰ نے گویا گہوارہ سے قوم کو مخاطب کیا جو ان کا ایک معجزہ تھا لیکن حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ خود انہیں آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ جب اپنی قوم کے پاس لائے گئے تو بچہ نہ تھے اور نہ مریم پر لوگوں نے ناجائز بچہ پیدا کرنے کا الزام لگایا تھا۔

وہ لوگ جو یہ بیان کرتے ہیں کہ مریم ان کو بالکل حالت طفلی یا شیر خوارگی میں لائیں

وہ ثبوت میں لفظ تحملہ کو پیش کرتے ہیں یعنی مریم حضرت عیسٰی کو لائیں اس حال میں کہ وہ انھیں اٹھائے ہوئے تھیں یا گود میں لئے ہوئے تھیں، ایسا سمجھنا غلطی ہے کیونکہ خود کلام مجید میں دوسری جگہ بھی لفظ آیا ہے اور وہاں گود میں لینے کے معنی نہیں ہیں بلکہ کسی سواری پر لے جانے کے ہیں۔ (ملاحظہ ہو سورۂ برائت آیت ۹۲)

(ولا علی الذین اذا ما اتوک لتحملہم قلت لا اجد ما احملکم علیہ)

اس لئے یہاں بھی یہ معنی ہوئے کہ مریم حضرت عیسٰی کو سواری پر لائیں، علاوہ اس کے جو گفتگو حضرت عیسٰی نے کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت عیسٰی پیغمبر ہو چکے تھے، اور ان کو کتاب الٰہی مل چکی تھی اور یہ امر ظاہر ہے، آپ کو نبوت ۳۰ سال کی عمر میں ملی ہے۔ اسی کے ساتھ قوم کا یہ کہنا کہ اس سے کیا بات کریں جو گہوارہ میں بچہ تھا۔ یعنی انھوں نے لفظ کان کا استعمال کیا ہے جس سے زمانہ ماضی ظاہر ہوتا ہے نہ یہ کہ وہ فی الحال گہوارہ کے بچے ہیں، اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسٰی بچہ نہ تھے۔

اب رہا یہ امر کہ قوم کا مریم سے کہنا کہ تم عجیب چیز لائی ہو اور یہ کہ تمھارے ماں باپ خراب نہ تھے سو اس سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ ان پر ناجائز بچہ پیدا کرنے کا الزام لگایا تھا اور ان کا کوئی شوہر نہ تھا۔ چونکہ حضرت عیسٰی یہودیوں کے عقائد کے خلاف تلقین کرتے تھے اس لئے انھوں نے لفظ فریا استعمال کیا جس کے معنی ایسے شخص کے ہیں جو عجیب غریب باتیں کرے یا دکھائے یعنی انھوں نے کہا کہ اے مریم یہ کیسا بیٹا تم نے جنا ہے جو ہمارے معتقدات کی اس قدر توہین کرتا ہے حالانکہ تمھارے ماں باپ تو ایسے نہ تھے یہ سن کر مریم نے کہا کہ اسی سے پوچھو، جس پر اہل قوم نے کہا کہ ہم اس سے کیا بات کریں

جوکل گہوارہ میں کھیلتا تھا۔ اس سے مقصود گویا عیسٰی کی توہین تھی اور ان کی ناتجربہ کاری کو ظاہر کرنا۔ اس کے جواب میں جو کچھ عیسٰی نے کہا وہ قطعی ثبوت اس امر کا ہے کہ لوگوں نے مریم پر زنا کی تہمت نہیں لگائی اور نہ حضرت عیسٰی بن باپ کے پیدا ہوئے کیونکہ حضرت عیسٰی نے جو کچھ جواب میں کہا ہے اس میں کہیں اپنی ماں کی برائت کا ذکر نہیں ہے ورنہ اگر یہ الزام لگایا گیا ہوتا اور قوم یہ تہمت مریم پر رکھتی تو اس کے متعلق بھی آپ کچھ کہتے، لیکن آپ نے کہیں نہیں اس کا ذکر نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت سب کو عیسٰی کی ولدیت کا پورا علم تھا اور یوسف نجار کے ساتھ مریم کے منسوب ہونے کو سب جانتے تھے اس لئے وہ یہ تہمت رکھ ہی نہ سکتے تھے اور اسی بنا پر حضرت عیسٰی کو اپنی ماں کی برائت اور اپنی ولادت کے متعلق کسی بیان کے پیش کرنے کی ضرورت لاحق ہی نہ ہوئی۔

مذکورہ بالا آیات کے علاوہ چند آیتیں اور ہیں جن سے غیر معمولی ولادت مسیح پر استدلال کیا جاتا ہے مثلاً:-

یا اہل الکتاب لاتغلوا فی دینکم ولاتقولوا علی اللہ الا الحق انما المسیح ابن مریم رسول اللہ و کلمتہ القٰہا الی مریم وروح منہ۔
(سورۂ نساء آیت ۱۷۱)

اے کتاب والو! اپنے دین میں غلو مت کرو اور اللہ کے حق میں سوائے سچ کے اور کچھ نہ کہو مسیح ابن مریم اللہ کا رسول ہے اور اس کا کلمہ ہے جو پہنچایا اس نے مریم کی طرف اور روح ہے اس کی

والتی احصنت فرجہا فنفخنا فیہا من روحنا وجعلنٰہا وابنہا آیۃ للعالمین۔
(سورۂ انبیاء آیت ۹۱)

اور (مریم وہ ہے) جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی اس لئے پھونک دی ہم نے اس میں اپنی روح اور بنا دیا اسے اور اسکے بیٹے کو نشانی قوموں کے لئے۔

ان آیات یا اسی مفہوم کی دوسری آیتوں میں جو جدید لفظ قابل غور ہے "ونفخ روح" ہے بعض کا یہ خیال ہے کہ خدا کا یہ کہنا کہ "ہم نے روح پھونکی" اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ عیسیٰ حضرت روح اللہ تھے اور ان کے کوئی باپ نہ تھا لیکن یہ استدلال صد درجہ ضعیف ہے کیونکہ خدا نے ہر انسان کی پیدایش کا باعث نفخ روح قرار دیا ہے۔

"خلق الانسان من طین ثم جعل نسلہ من سلالۃ من ماء مہین ثم سواہ ونفخ فیہ من روحہ"

سورۂ انبیاء کی آیت ۹۱ سے بھی جو اوپر درج کی گئی ہے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مریم شوہر والی تھیں کیونکہ اس میں لفظ احصنت استعمال کیا گیا ہے یعنی آپ کا محصنہ ہونا بیان کیا گیا ہے اور محصنہ اس عفیفہ کو کہتے ہیں جو شوہر رکھتی ہو، کنواری کو عربی زبان میں محصنہ نہیں کہتے اس آیت میں جو مریم کے متعلق یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ انھوں نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تو اس سے یہ مقصود ہے کہ انھوں نے سوائے اپنے شوہر کے دوسرے مردوں سے احتراز کیا نہ یہ کہ اپنے شوہر سے بھی، بعض یہودی آپ پر زنا کی تہمت رکھتے تھے اس لئے خدا نے کلام مجید میں ان کی عفت کی شہادت دی، یہاں ایک نکتہ اور قابل غور ہے اور وہ یہ کہ یہودیوں نے زنا کی تہمت یوسف نجار کے ساتھ کبھی نہیں لگائی بلکہ ایک اور شخص پنتھرا نامی کے ساتھ منسوب کی تھی۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یوسف نجار کا شوہر ہونا اس وقت سب کو معلوم تھا اور اس کے ساتھ تہمت نہیں لگا سکتے تھے۔

سورۂ نساء میں ایک جگہ خدا فرماتا ہے "لن یستنکف المسیح ان یکون عبداللہ" (مسیح کے لئے اس میں کوئی امر باعث ننگ نہیں کہ وہ اللہ کا بندہ ہو) اس سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بحیثیت مخلوق خداوندی ہونے کے وہ دوسرے انسانوں سے زیادہ کوئی حیثیت

نہ رکھتے تھے اور یہیں سے نفخ روح کے مفہوم پر روشنی پڑتی ہے کہ اس سے مراد وہی علم نفخ روح ہے جو دوسرے انسانوں کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے اسی کے ساتھ جب اس پر غور کیا جاتا ہے کہ آپ دوسرے انسانوں کی طرح نو مہینے تک ماں کے پیٹ میں رہے جیسا کہ ابن عباس کے قول سے ثابت ہوتا ہے اور مریم کو دردِ زہ کی بھی وہی تکلیف ہوئی جو عام طور پر تمام عورتوں کو ہوتی ہے (ملاحظہ ہو سورۂ مریم) تو کوئی وجہ نہیں کہ استقرار حمل کو خلاف قانون قدرت یقین کیا جائے۔ علی الخصوص اس وقت جبکہ قرآن پاک میں کہیں اس کا ذکر موجود نہیں ہے۔ اگر یوسف نجار کے ساتھ آپ کا تعلق ازدواج ثابت نہ ہوتا، اگر آپ کی ولادت کسی ایسے غیر معمولی طریقے سے ہوتی جو عام طور سے نہیں دیکھی جاتی تو بیشک آپ کی ولادت بصورت معجزہ یہودیوں کے سامنے پیش کی جا سکتی تھی لیکن جب لوگوں کو معلوم تھا کہ یوسف کے ساتھ آپ منسوب ہو چکی ہیں انھیں کے ساتھ رات دن رہتی ہیں اور استقرار حمل کے بعد آپ کی ولادت بھی معمولی طور پر ہوئی ہے تو پھر اس واقعہ پر انھیں کیا حیرت ہو سکتی تھی اور وہ کس طرح اسے مریم یا مسیح کا معجزہ یقین کر سکتے تھے۔ بہرحال کلام مجید سے یہ بات کسی طرح ثابت نہیں ہوتی کہ مسیح کی ولادت بغیر باپ کے ہوئی، اس لئے اب دیکھنا ہے کہ ایسی صورت میں جبکہ انجیل سے بھی مریم اور یوسف کا تعلق ازدواج ظاہر ہو رہا ہے اور اس میں متعدد جگہ یوسف کو مسیح کا باپ ظاہر کیا ہے۔ یہ اعتقاد کہ آپ بن باپ کے پیدا ہوئے کیونکر پھیل گیا۔

اس میں شک نہیں کہ مسیح کو خدا کا بیٹا، خدا کی روح کہنا اور ان کی نسبت اسی قسم کے اور الفاظ کا استعمال جن سے ایک شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ عیسیٰ کا کوئی انسانی باپ نہ تھا انجیل میں

پایا جاتا ہے لیکن جیسا کہ سینٹ پال نے لکھا ہے کہ یہ سب روحانی اعتبار سے تھا لیکن بعد کو یہ اعتبار محو ہو گیا اور عیسائی یہودیوں کی ضد میں جو مسیح کو ناجائز مولود کہتے تھے حقیقی معنی میں خدا کا بیٹا کہنے اور سمجھنے لگے اور اسی خیال کو بعض مفسرین اسلام نے بغیر کسی تنقیح کے اپنے یہاں لے لیا۔

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ کلام مجید میں ہر جگہ عیسیٰ کو ابن مریم کہا گیا ہے ان کے باپ کا نام کسی جگہ درج نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے لیکن یہ استدلال غلط ہے کیونکہ جب کلام مجید نازل ہوا تو عیسیٰ اس وقت ابن مریم ہی کی کنیت سے مشہور تھے اور اسی لئے مخاطبت میں اس لفظ کو قایم رکھا علاوہ اس کے کہ اگر کلام مجید میں کسی کے باپ کے ذکر کا نہ ہونا اس امر کی دلیل ہو کہ اس کے باپ ہی نہ تھا تو موسیٰ کو بھی بن باپ کے ماننا پڑے گا کیونکہ ان کے پیدائش کے ذکر میں بھی ان کے باپ کا نام نہیں لیا گیا۔

(۲)

جس طرح حضرت عیسیٰ کی ولادت کا مسئلہ اہم ہے اسی طرح ان کی وفات یا مصلوب ہونے کا واقعہ بھی بہت غور طلب ہے۔

اس مسئلہ میں یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے خیالات مختلف ہیں، یہودیوں کا خیال ہے کہ وہ صلیب پر چڑھا کر قتل کئے گئے، عیسائی کہتے ہیں کہ وہ مصلوب ہونے کے بعد پھر زندہ کر کے آسمان پر اٹھا لئے گئے اور مسلمان کہتے ہیں کہ وہ صلیب پر نہیں کوئی اور شخص ان کی جگہ مصلوب ہوا لیکن آسمان پر چلے جانے کے یہ بھی

قایل ہیں۔ کلام مجید میں جن آیتوں سے اس پر استدلال کیا جاتا ہے یہ ہیں:۔

اذ قال اللہ یا عیسیٰ انی متوفیک و رافعک الی و مطہرک من الذین کفروا

(آل عمران۔ آیت ۵۴)

یقولون انا قتلنا المسیح عیسی ابن مریم رسول اللہ و ما قتلوہ و ما صلبوہ ولاکن شبہ لہم و ان الذین اختلفوا فیہ لفی شک منہ ما لہم من علم الا اتباع الظن و ما قتلوہ یقیناً، بل رفعہ اللہ الیہ کان عزیزاً حکیما۔

(سورۂ نسا۔ آیت ۱۵۷-۱۵۸)

جب اللہ نے کہا اے عیسیٰ میں بیشک تجھے مارنے والا ہوں اور اٹھانے والا ہوں اپنی طرف اور پاک کرنے والا ہوں تجھے ان سے جو کافر ہوئے وہ کہتے ہیں کہ ہم نے قتل کر دیا مسیح عیسیٰ مریم کے بیٹے اللہ کے رسول کو اور انھوں نے نہیں قتل کیا اس کو نہ صلیب دی اس کو لیکن ان کو اس کا دھوکا ہوا اور جو لوگ اس میں اختلاف کرتے ہیں وہ بیشک شک میں ہیں ان کا علم جو کچھ ہے وہ صرف ظن و قیاس ہے اور یقیناً مسیح کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اٹھا لیا اس کو اپنی طرف اور اللہ غالب ہے حکمت والا۔"

سب سے پہلے ہم آپ کے واقعۂ صلیب کو لیتے ہیں جس کا ذکر نہایت صراحت کے ساتھ سورۂ نسا میں آیا ہے، سورۂ نسا کی ان آیتوں میں ذکر ہے یہود کا جو کہتے تھے کہ ہم نے مسیح کو صلیب پر چڑھا کر قتل کر ڈالا۔ کلام مجید میں اس کا صاف انکار کیا گیا ہے کہ انھوں نے مسیح کو قتل کیا اور نہ صلیب پر چڑھایا لیکن بحث طلب الفاظ شبہ لہم کے ہیں جس سے بعض نے یہ استدلال کیا ہے کہ کوئی دوسرا شخص مسیح کی صورت میں تبدیل ہو گیا تھا اور اسی کو سولی پر چڑھایا گیا لیکن ان الفاظ سے یہ مفہوم اخذ کرنا نہایت ناروا جسارت ہے۔ کلام مجید کے الفاظ کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ یہودی مسیح کی موت یا

ان کے قتل کئے جانے کے مسئلہ میں دھوکے میں مبتلا ہو گئے یعنی وہ ہلاک ہوئے نہیں اور انھیں مردہ سمجھ لیا گیا۔ عربی زبان میں یہ لفظ کثرت سے التباس یا دھوکہ کے معنی میں مستعمل ہے۔ چنانچہ عام طور پر جب کسی شخص کو کسی بات میں دھوکہ ہو جاتا ہے تو کہتے ہیں شُبّہ علیہ الامر (فلاں امر میں اس کو التباس یا دھوکہ ہو گیا) اس لئے اس کے یہ معنی لینا کہ کوئی اور شخص مسیح کی شبیہ بن گیا تھا درست نہیں ہے۔

اب رہا یہ امر کہ وہ صلیب پر چڑھائے گئے تھے تو کلام مجید میں کیوں اس کی نفی ما صلبوہ کہہ کر کی گئی ہے۔ اس کا جواب نہایت آسان ہے۔ قرآن پاک میں قتل و صلیب دونوں کی نفی ساتھ ساتھ کی گئی ہے اور یوں ارشاد ہوا ہے ما قتلوہ وما صلبوہ جس سے صاف ظاہر ہے کہ صلبوہ کا مفہوم بھی وہی ہے جو ما قتلوہ کا ہے یعنی ان کو صلیب پر چڑھانے کے بعد جو اصل مقصود تھا حاصل نہیں ہوا اور وہ ہلاک نہیں ہوئے اس لئے جب صلیب دینے کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو یہ کہنا عام محاورہ کے بالکل مطابق ہے کہ انھیں صلیب بھی نہیں دی گئی جس کی تصدیق شُبّہ لہم سے اور زیادہ ہوتی ہے اور شبہ لہم کا مفہوم جو ہم نے بیان کیا۔ آگے کے الفاظ، مالہم بہ من علم الا اتباع الظن سے اور زیادہ موثق ہو جاتا ہے

اس کے بعد سوال ہے ان کے آسمان پر اٹھائے جانے کا اور جس کے ثبوت میں رافعک الیَّ اور رافعہ اللہ الیہ کے الفاظ پیش کئے جاتے ہیں لیکن یہاں رفع (اٹھانے) سے مراد رفع جسم (جسم کا اٹھانا) نہیں ہے بلکہ رفعت مرتبت مراد ہے، جیسا کہ مفردات امام راغب اور تفسیر کبیر میں بھی صراحتاً مذکور ہے۔ عربی میں رفع کے معنی رفع قدر کے بھی آتے ہیں اور رفیع اس شخص کو کہتے ہیں جو معزز و بلند مرتبت والا ہو۔

اسی خیال کی مزید تقویت سورۂ آل عمران کی آیت ۴۵ سے بھی ہوتی ہے جہاں "رافعک الیّ" کے بعد حرف عطف کے ذریعہ سے اس فقرہ کو بھی ملا یا گیا ہے "ومطہرک من الذین کفروا"۔

کہا جاتا ہے کہ جب مسیح صلیب پر چڑھائے گئے تو انھیں آسمان پر اٹھا لیا گیا اور ان کی شبیہ صلیب پر قائم کر دی گئی ہے بعض کا خیال ہے کہ صلیب تو انھیں دی گئی تھی لیکن وہ صلیب سے مردہ سمجھ کر اتارے گئے تو خدا نے ان کو اوپر اٹھا لیا۔ الغرض آسمان پر اٹھائے جانے کا واقعہ صلیب ہی کے واقعہ سے متعلق ظاہر کیا جاتا ہے حالانکہ کلام مجید میں صراحتہً "انی متوفیک ورافعک الیّ" کے الفاظ پائے جاتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ رفع آسمان کا واقعہ آپ کی وفات کے بعد ہوا ہے اور آپ کی وفات صلیب پر ہوئی نہیں جیسا کہ ہم ابھی کلام مجید سے ثابت کر چکے ہیں اس لئے انحصار فیصلہ کا اس امر پر ہوا کہ آپ کی وفات ہوئی یا نہیں یعنی آپ نے عمر طبیعی کو پہونچ کر انتقال کیا یا نہیں؟ اگر ثابت ہو جائے تو پھر زندہ آسمان پر اٹھائے جانے اور مفہوم رفع کی وضاحت آسانی سے ہو جائے۔

لفظ متوفی کا مصدر توفّی ہے اور جو مفسرین حضرت عیسیٰ کے زندہ آسمان پر اٹھائے جانے کے قائل ہیں انھوں نے توفّی کے معنی استکمال یا وفائے عہد کے لئے ہیں یعنی خدا نے عیسیٰ سے کہا کہ میں تجھ سے وفائے عہد کرنے والا ہوں۔ ہرچند توفّی کے یہ معنی بھی آتے ہیں لیکن کوئی وجہ نہیں کہ توفّی کے معنی مارنے کے نہ لئے جائیں جبکہ توفاہ اللہ کے معنے اماتہ اللہ (اللہ نے موت طاری کی) کے بھی آتے ہیں۔ امام بخاری نے بھی ابن عباس کی

روایت سے متوفیک کے معنی ممیتک (تجھ پر موت طاری کرنے والے) لکھا ہے کہیں
خود کلام مجید میں بھی اور مقامات پر لفظ توفی مارنے کے معنی میں آیا ہے (ملاحظہ ہو
سورۂ نسار آیت ۹۹) ان الذین توفاہم الملائکۃ (لخ) اور سورۂ انعام آیت ۶۰
وہو الذی یتوفیکم باللیل (لخ) علاوہ اس کے یوں بھی جب کلام مجید سے نہایت صراحۃً
یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت عیسیٰ اپنی موت سے مرے اور وہ عمر طبعی کو پہونچے
تو متوفیک کے معنی سوائے ممیتک کے کوئی اور اختیار کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

یوں تو کلام مجید کی مختلف آیتوں سے حضرت عیسیٰ کی وفات اور ان کی طبعی
موت ثابت ہوتی ہے لیکن یہاں ہم صرف دو آیتوں کو پیش کرتے ہیں جن میں نہایت
صراحت کے ساتھ اس امر کا اظہار ہے اور جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

واذ قال اللہ یا عیسیٰ ابن مریم ء
انت قلت للناس اتخذونی وامی الٰہین
من دون اللہ، قال سبحانک ما یکون لی
ان اقول ما لیس لی بحق، ان کنت قلتہ
فقد علمتہ تعلم ما فی نفسی ولا اعلم ما فی نفسک
انک انت علام الغیوب، ما قلت لہم
الا ما امرتنی بہ ان اعبدوا اللہ ربی وربکم
وکنت علیہم شہیدا ما دمت فیہم فلما توفیتنی
کنت انت الرقیب علیہم وانت علی کل شیء شہید

جب کہے گا اللہ (قیامت کے دن) اے عیسیٰ
مریم کے بیٹے کیا تو نے کہا تھا لوگوں سے کہ مجھے اور
میری ماں کو خدا ٹھہراؤ علاوہ اللہ کے عیسیٰ جواب
دے گا پاک ہے تیری ذات میں کیونکر ایسی بات
کہہ سکتا تھا جو حق نہ تھی، اگر میں نے ایسا کہا ہوگا
تو تجھے خبر ہوگی کیونکہ جو میرے جی میں ہے اس کا
علم تجھے ہے اور جو تیرے جی میں ہے اسے
میں نہیں جانتا تو غیب کی چیزوں کا جاننے والا
ہے میں نے قوم سے وہی کہا جو تو نے حکم دیا

تھا یعنی یہ کہ اللہ کی پرستش کرو جو میرا تمہارا دونوں کا پروردگار ہے اور اس بات پر میں ان کا گواہ تھا جب تک میں ان کے درمیان میں رہا پھر جب تو نے مجھ پر موت طاری کی تو تو ہی ان کا نگہبان تھا اور تو ہر چیز کا گواہ ہے۔

آخر کی آیت میں توفیتنی کے معنی سوائے مارنے کے لئے ہی نہیں جا سکتے کیونکہ اگر کوئی اور معنی لئے جائیں گے تو مفہوم بالکل غلط ہو جائے گا اور یہ امر اس قدر ظاہر ہے کہ کسی مزید تصریح کی ضرورت ہی نہیں۔

دوسری آیت جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ عمر طبعی تک پہونچنے کے بعد بوڑھے ہو کر مرے یہ ہے:۔

ویکلم الناس فی المھد وکھلا۔ (آل عمران آیت ۴۵)	اور (مسیح) بات کرے گا گہوارہ میں اور عالم ضعیفی میں۔

یہ آیت اس سلسلہ کی ہے جب فرشتہ نے مریم کو بیٹے کی ولادت کی خوش خبری دی تھی اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ اس قدر تندرست پیدا ہونگے کہ گہوارہ ہی میں دوسرے توانا بچوں کی طرح بات کرنے لگیں گے اور ضعیفی میں پہونچنے کے بعد بھی ان کا یہی عالم رہے گا۔ اس آیت لفظ کہلاً سے صاف طور پر یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ کلام مجید میں مسیح کی عمر طبعی تک پہونچنے کی پیشین گوئی موجود ہے۔

پھر جب مسیح کا عمر طبعی تک پہونچنا ثابت ہوتا ہے تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ آپ صلیب سے نہیں مرے، کیونکہ جس وقت آپ کو صلیب دی گئی تو آپ کی عمر ۳۲ سال کچھ دن کی تھی اور اس عمر کے انسان کو کہلاً (ضعیف) نہیں کہہ سکتے اور

اس صورت میں متوفیک کے معنی وہی لئے جائیں گے جو ہم نے بیان کئے ہیں۔

بعض مفسرین نے یکلم الناس فی المھد سے آپ کا یہ معجزہ ثابت کیا ہے کہ آپ گہوارہ ہی میں باتیں کرنے لگے تھے اول تو گہوارہ یعنی عالم طفلی میں بچوں کا باتیں کرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ بہت سے تندرست بچے شیر خوارگی ہی کے زمانہ میں بولنے لگتے ہیں اور اگر واقعی اس سے اظہار معجزہ کا ہے تو کہلا بیکار ہو جاتا ہے اور اس کے ذکر کی ضرورت نہیں رہتی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ ہم صلیب دئے جانے کے واقعہ کو مربوط صورت میں بیان کر دیں تاکہ واقعات یکجائی طور پر سامنے آجائیں اور آیات قرآن کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ صلیب پر چڑھانا یہ معنی رکھتا تھا کہ انسان یقیناً اور فوراً مر جاتا تھا حالانکہ یہ غلط ہے۔ صلیب پر چڑھانے کی یہ صورت ہوا کرتی تھی کہ انسان کو ایک لانبے تختے کے ساتھ ملا کر کھڑا کرتے تھے اور اس کے ہاتھوں کو دوسرے تختے پر جو پہلے تختہ پر متقاطع صورت میں جڑا ہوتا تھا پھیلا دیتے تھے اور کس کر باندھ دیتے تھے اسی طرح پاؤں پر پاؤں رکھ کر تختہ کے ساتھ کیل سے جڑ دیتے تھے یا باندھ دیتے تھے تاکہ آدمی نیچے کو نہ سرک سکے۔ بس اس کا نام صلیب دیا جانا تھا۔ مصلوب انسان کو اسی حال میں بھوکا پیاسا چھوڑ دیتے تھے یہاں تک کہ وہ دھوپ بھوک اور ہاتھ پاؤں کے زخموں کی تکلیف سے دو چار دن میں ہلاک ہو جاتا تھا۔

جمعہ کے دن دوپہر کو مسیح صلیب پر چڑھائے گئے چونکہ اسی دن شام سے

یوم سبت شروع ہونے والا تھا اس لئے یہودیوں کے اعتقاد کے بموجب شام سے پہلے مسیح کو دفن بھی ہو جانا چاہیئے تھا لیکن اس خیال سے کہ اس قدر جلد کوئی شخص صلیب پر نہیں مر سکتا، یہ رائے قرار پائی کہ مسیح کی ٹانگیں توڑ دی جائیں تاکہ وہ جلد ہلاک ہو جائیں لیکن جب آپ کو دیکھا تو آپ پر شدت تکلیف سے غشی کی سی کیفیت طاری تھی اور سب نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ آپ مر گئے ہیں چنانچہ آپ کے دفن کئے جانے کی اجازت دے دی گئی اور رات ہی کو آپ کو ایک حواری لے جا کر دفن کر دیا یا کسی غار میں چھپا دیا اور پھر وہاں سے آپ کو نکال کر لے گیا۔ اس کے تیسرے دن جب آپ کی قبر کو دیکھا گیا تو پتھر سرکا ہوا تھا اور نعش موجود نہ تھی، اس واقعہ پر حواریوں نے مشہور کر دیا کہ آپ آسمان پر اٹھا لئے گئے تاکہ یہودی تلاش نہ کریں اور اس کو معجزہ سمجھ کر آپ کی نبوت پر ایمان لے آئیں۔ اس کے بعد نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت عیسیٰ اپنے حواریوں کے ساتھ کہاں گئے، کب تک زندہ رہے اور کہاں مدفون ہیں۔ انجیل کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ معہ حواریوں کے گلیلی چلے گئے تھے۔ احمدی جماعت کا بیان ہے کہ وہ وادی کشمیر میں آئے چنانچہ سری نگر میں ان کا مزار موجود ہے جو نبی صاحب کا مزار کہلاتا ہے۔

جو واقعات انجیل کی روایات سے معلوم ہوئے ان سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے مصلوب ہونے کی حالت میں جان نہیں دی۔ مثلاً صرف چند گھنٹے صلیب پر رہنا اور مصلوب کی جان کئی دن میں نکلتی ہے۔ مسیح کے ساتھ جو دو شخص اور مصلوب ہوئے تھے اور وہ بھی شام کو اتار لئے گئے تھے زندہ تھے۔ اگر خدا آپ کے

جسم کو آسمان پر اٹھا لیتا تو جہاں آپ غار یا قبر میں مدفون تھے وہاں کا پتھر سرکنے کی کوئی وجہ نہ تھی، کیونکہ خدا کو اوپر اٹھانے کے لئے پتھر ہٹانا ضروری نہ تھا، جب آپ واقعہ صلیب کے بعد اپنی ماں سے ملے تو جسم پر زخموں کے نشان موجود تھے اور آپ بھیس بدلے ہوئے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے واقعی آپ مصلوب اور زندہ اتار لئے گئے اور اس ڈر سے کہ یہودیوں کو پتہ نہ چل جائے بھیس بدل کر اپنی ماں سے ملے۔

(۳)

تیسرا حصہ اس بحث کا مسیح کے معجزات سے متعلق ہے، سب سے پہلا معجزہ تو یہ ہے کہ آپ نے گہوارہ سے گفتگو کی، اس کے متعلق ہم کوئی مزید بحث نہ کریں گے کیونکہ گزشتہ صفحات میں ہم اس کی حقیقت کو واضح کر چکے ہیں، اور گہوارہ سے بات کرنے کا مفہوم صغیر سنی میں بات کرنے کا ہے اور یہ کوئی معجزہ نہیں، باقی اور معجزات وہ ہیں جن کا ذکر سورۂ مائدہ اور آل عمران میں ہے۔ وہ آیتیں یہ ہیں :۔

انی قد جئتکم بآیۃ من ربکم۔ انی اخلق لکم من الطین کہیئۃ الطیر فانفخ فیہ فیکون طیرا باذن اللہ وابری الاکمہ والابرص واحی الموتی باذن اللہ وانبئکم بما تاکلون وما تدخرون فی بیوتکم ان فی ذلک لآیۃ لکم ان کنتم مومنین۔

(آل عمران آیت ۴۸)

میں لایا ہوں تمہارے پاس نشانی تمہارے رب کی طرف سے، میں بناتا ہوں تمہارے لئے مٹی سے طائر کی صورت میں، پھر پھونکتا ہوں اس میں پس وہ ہو جاتا ہے ایک طائر اللہ کے حکم سے۔ اور اچھا کرتا ہوں اندھے کو، کوڑھی کو اور جلاتا ہوں مردہ کو اللہ کے حکم سے اور خبردار کرتا ہوں جو تم کھاتے ہو اور جو گھروں میں بچاتے ہو

تحقیق کہ اس میں نشانی ہے تمھارے لئے اگر تم ایمان لانے والے ہو۔

اذ قال اللہ یا عیسیٰ ابن مریم اذکر نعمتی علیک وعلیٰ والدتک اذ ایدتک بروح القدس تکلم الناس فی المھد وکھلا واذ علمتک الکتاب والحکمۃ والتوراۃ والانجیل، واذ تخلق من الطین کھیئۃ الطیر باذنی فتنفخ فیھا فتکون طیرا باذنی وتبرئ الاکمہ والابرص باذنی واذ تخرج الموتیٰ باذنی واذ کففت بنی اسرائیل عنک اذ جئتھم بالبینات فقال الذین کفروا منھم ان ھذا الا سحر مبین۔

جب کہے گا اللہ اے عیسیٰ ابن مریم یاد کر میری نعمت کو اپنے اوپر اور اپنی ماں کے اوپر جب میں نے مدد کی تیری روح القدس کے ذریعہ سے، تو نے بات کی لوگوں سے گہوارہ میں اور بڑھاپے میں، جب میں نے سکھائی تجھے کتاب حکمت، توریت اور انجیل اور جب بنایا تو نے مٹی سے طائر کی صورت میں میرے حکم سے پھر تو نے پھونکا اس میں اور وہ ہو گیا طائر میرے حکم سے اور اچھا کیا تو نے اندھے کو کوڑھی کو میرے حکم سے اور جب تو نے نکالا مردے کو میرے حکم سے اور جب میں نے باز رکھا بنی اسرائیل کو تجھ سے جبکہ تو ان کے پاس کھلی دلیلیں لایا، لیکن کافروں نے کہا کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے۔

اذ قال الحواریون یا عیسیٰ ابن مریم ھل یستطیع ربک ان ینزل علینا مائدۃ من السماء قال اتقوا اللہ ان کنتم مؤمنین

جب کہا حواریوں نے اے عیسیٰ ابن مریم کیا تیرا رب ایسا کرے گا کہ وہ اتارے ہم پر دسترخوان آسمان سے، کہا اس نے ڈرو اللہ

قالوا نرید ان ناکل منہا وتطمئن قلوبنا ونعلم
ان قد صدقتنا ونکون علیہا من الشاہدین
قال عیسی ابن مریم اللہم ربنا انزل علینا
مائدۃ من السماء تکون لنا عیدا لاولنا وآخرنا
وآیۃ منک وارزقنا وانت خیر الرازقین
قال اللہ انی منزلہا علیکم فمن یکفر بعد منکم
فانی اعذبہ عذابا لا اعذبہ احدا من العالمین
(سورۂ مائدہ آیت ۱۱۰-۱۱۵)

سے اگر تم ایمان والے ہو انھوں نے کہا
ہم چاہتے ہیں کہ کھائیں اس خوان سے اور
مطمئن ہو جائیں ہمارے قلوب اور ہم جان
لیں کہ بیشک تو نے سچ کہا اور ہم اس پر گواہ
ہو جائیں، کہا عیسیٰ ابن مریم نے اسے پروردگار
اتار ہم پر دسترخوان آسمان سے تاکہ ہو جائے
ہمارے لئے مسرت ہمارے اگلوں کے لئے
اور پچھلوں کے لئے اور نشانی تیری طرف سے
اور ہمیں روزی دے اور تو بہتر روزی دینے والا ہے کہا اللہ نے میں اتارنے والا ہوں خوان
تمہارے اوپر لیکن اگر کوئی نافرمانی کرے گا اس کے بعد تم میں سے، تو اس کو میں ایسا عذاب
دوں گا کہ عالم کے لوگوں میں سے کسی ایک کو ویسا عذاب نہ دیا ہوگا۔

سوائے معجزۂ نزول مائدہ کے اور جتنے معجزات بیان کئے جاتے ہیں وہ سب
آل عمران اور سورۂ مائدہ کی آیتوں میں مشترک ہیں یعنی جو معجزات سورۂ آل عمران
میں بیان کئے گئے ہیں انھیں کا ذکر سورۂ مائدہ میں بھی ہے لیکن فرق انداز بیان کا
ضرور ہے۔ آل عمران میں خود حضرت عیسیٰ اپنی زبان سے ان کا اظہار کر رہے ہیں
کہ میں ایسا کرتا ہوں، ایسا کر سکتا ہوں اور سورۂ مائدہ میں خدا اپنی نعمتوں کے سلسلہ
بیان میں حضرت عیسیٰ پر ظاہر کرتا ہے کہ یاد کرو اس وقت کو جب تم ہمارے حکم سے

ایسا اور ایسا کر سکتے تھے لیکن چونکہ باتیں دونوں جگہ ایک ہی ہیں اس لئے علیحدہ علیحدہ بحث کرنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی ان آیتوں سے جن معجزات کا ثبوت پیش کیا جاتا ہے وہ یہ ہیں :-

(۱) مٹی کی چڑیا بنا کر حضرت عیسیٰ کا اس کے اندر پھونک مارنا اور اس کا اڑ جانا۔

(۲) اندھے کوڑھیوں کو اچھا کرنا۔

(۳) مردہ کو زندہ کرنا۔

(۴) غیب کی خبر دینا اس قبیل سے کہ لوگ کیا کھاتے ہیں اور گھروں میں کیا رکھتے ہیں

(۵) عیسیٰ کی دعا پر آسمان سے دستر خوان کھانے کا نازل ہونا۔

معجزۂ اول کے متعلق بعض مفسرین کا بیان ہے کہ واقعی وہ مٹی کی چڑیا بناتے تھے اور ان میں جان ڈالتے تھے بعض کا خیال ہے جن میں سر سید مرحوم بھی شامل ہیں کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ کی عہد طفلی کا ہے اور بچپن میں لڑکے اس قسم کی باتیں کیا ہی کرتے ہیں لیکن میرے نزدیک یہ دونوں باتیں سمجھ سے باہر ہیں وہ اس لئے کہ کسی جاندار شے کا پیدا کرنا یا کسی چیز میں جان ڈالنا صرف اللہ کا کام ہے اور یہ اس لئے کہ اگر مٹی کی چڑیاں بنا کر جان ڈالدینے کا واقعہ صرف ان کے عہد طفلی کے کھیل سے متعلق ہوتا تو خدا اپنی نعمتوں کے سلسلۂ بیان میں اس کا ذکر نہ کرتا جیسا کہ سورۂ مائدہ کی آیتوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

انجیل کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو آسانی سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے

کہ حضرت عیسیٰ نے جہاں جہاں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ سب قصص وحکایات اور امثال وتشبیہات کی صورت میں بیان کیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے لٹریچر کی یہی شان تھی اس لئے غور کرنا چاہیے کہ لفظ خلق سے یہاں کیا مراد ہے اور نفخ کے بعد طائر کی طرح اڑنا کیا معنی رکھتا ہے۔

یہ امر ظاہر ہے کہ لفظ خلق پیدا کرنے کے معنی میں تو ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ متعدد آیات قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ خلق (پیدا کرنا) صرف خدا کا کام ہے اور یہ صفت صرف اسی کے ساتھ مخصوص ہے اس جگہ لفظ خلق کے معنی صرف اندازہ کرنے یا عزم کرنے کے ہیں (اس لفظ کے یہ معنی بھی عربی زبان میں آتے ہیں) طین (مٹی) سے انسان کی ضعیف پیدائش کی طرف اشارہ ہے نفخ سے مقصود احکام الٰہیہ کی تعلیم ہے اور طیر سے وہ انسان مراد ہیں جو عام سطح سے بلند ہو جائیں۔

کلام مجید میں انسانوں کو دآبّہ اور طائر سے تشبیہ دی گئی ہے (ملاحظہ ہو سورہ انعام آیت ۳۸۔ وما من دآبۃ الخ) اسی طرح نابجھ لوگوں کو جانوروں (انعام) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لئے اس آیت کے معنی یہ ہوئے کہ تم لوگوں کو جو مٹی سے بنے ہو یعنی اپنی پیدائش کے لحاظ سے بہت حقیر ہو، میں طائر کی سی ہیئت دینے کا عزم کرتا ہوں اور پھر تعلیم الٰہی دے کر واقعی بلند پرواز اور بلند خیال انسان بناتا ہوں۔

اندھے کوڑھی اور مردے سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی روحیں بیمار اور مردہ ہیں انجیل میں اکثر جگہ بیمار بول کر گنہگار مراد لیا گیا ہے اور خود کلام مجید میں بھی اعمٰی اور اموات (اندھوں اور مردوں) سے گنہگار اور کافر مراد ہیں مثلاً:

وما یستوی الاعمیٰ والبصیر۔ وما یستوی الاحیاء والاموات (سورۂ فاطر آیات ۱۹-۲۲)
اس لئے اندھے کوڑھیوں کو اچھا کہنے اور مردوں کو زندہ کرنے سے مراد یہی ہے
کہ میں گنہگاروں سے ان کے گناہ چھڑاتا ہوں اور جو روحیں معصیت سے مردہ ہیں
ان کو اخلاق کی تعلیم دے کر زندہ کرتا ہوں۔

مسیح کی خاص تعلیم یہ تھی کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے اُسے اللہ کی راہ میں صرف
کر دو اور کل کے لئے کچھ نہ رکھو، کیونکہ ان کے زمانہ میں لوگ کثرت سے سود خوار تھے
اور گھروں میں دولت جمع رکھتے تھے خواہ قوم پر کوئی آفت آجائے، اسی امر کی طرف
اشارہ ہے ان الفاظ سے "وانبئکم بما تاکلون وما تدخرون" یعنی میں تم کو بتاتا ہوں یا تعلیم
کرتا ہوں کہ تم کھاؤ اور کیا کھاتے ہو اور کیا جمع کرتے ہو، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس آیت
سے اخبار عن الغیب کیونکر سمجھ لیا گیا۔ اب رہا مائدہ کا آسمان سے نازل ہونا، سو کلام مجید
سے کہیں یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ مائدہ نازل کیا گیا۔ البتہ عیسیٰ سے حواریوں نے اس
کی خواہش کی تھی اور آپ نے دعا بھی کی تھی لیکن اس کے بعد اس کا کہیں ذکر نہیں کہ مائدہ
اتارا گیا۔ علاوہ اس کے مائدہ سے یہاں مراد واقعی کھانے کا دسترخوان نہیں ہے بلکہ
مقصود صرف روزی ہے اور عیسیٰ کی یہ دعا اسی قبیل سے تھی جیسی کہ انجیل میں پائی جاتی
ہے کہ "اے خدا آج کے دن کی ہماری خوراک دے"۔

مائدہ کی ان آیتوں سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ حواریوں نے وسعت رزق
طلب کی تھی اور اسی کی دعا حضرت عیسیٰ نے کی تھی سو اس کے مقبول ہونے کا ثبوت
تاریخ سے بہ آسانی مل سکتا ہے۔

یونس علیہ السلام

(جناب سید ضامن حسین صاحب انبالہ)

شیخ سعدی کا ایک شعر ہے:۔

قرص خورشید در سیاہی شد یونس اندر دہان ماہی شد

اس دوسرے مصرعہ کا مطلب بعض لوگ یہ بتاتے ہیں کہ ماہی سے مراد برج حوت ہے اور یونس کسی سیارہ کا نام ہو شاید۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یونس سے مراد یونس نبی ہیں اور دہان ماہی میں چلے جانے کا واقعہ وہی ہے جو مشہور ہے کہ آپ مچھلی کے پیٹ میں چالیس دن تک رہے۔ براہ کرم مطلع فرمائیے کہ اس شعر کا کیا مطلب ہے۔ اگر موخر الذکر مطلب صحیح ہے تو از رہِ تحقیق اس سے بھی مطلع فرمائیے کہ یونس علیہ السلام کیونکر مچھلی کے پیٹ میں اتنے دنوں تک رہے اور پھر زندہ نکل آنے کا کیا سبب ہوا؟

سعدی کے اس شعر کا مطلب تو وہی ہے جو آپ سمجھے ہیں۔ برج حوت اور وینس نہایت لغو اور مہمل تاویل ہے۔ دوسرا مصرعہ پہلے کا مشبہ بہ واقع ہوا ہے یا برعکس اس کے یعنی یونس کا دہانِ ماہی میں چلا جانا ایسا تھا جیسے آفتاب ابر کی سیاہی میں چھپ جائے، یا آفتاب کا ابر میں چھپ جانا ایسا تھا جیسے یونس کا دہانِ ماہی میں

چلا جاتا، بہرحال سیاق و سباق کے لحاظ سے جو صورت ہو اسی لحاظ سے مشبہ و مشبہ بہ کی تعیین ہو سکتی ہے۔

اب آپ کا یہ سوال کہ یونس دہان ماہی میں کیونکر چالیس دن تک زندہ رہے ضرور غور طلب ہے یونس کے متعلق جو قصہ عام طور پر مشہور ہے پہلے میں اسے درج کرتا ہوں اور پھر غور کروں گا کہ کلام مجید سے اس کی تصدیق کہاں تک ہو سکتی ہے کیونکہ ہمارے پاس عہد قدیم کے اس نوع کے واقعات کی جانچ کرنے کا تنہا ذریعہ یہی ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ یونس شہر نینوا کے لوگوں کو شریعت موسوی کی دعوت دیتے تھے لیکن جب کسی نے آپ کی وعظ و نصیحت کو نہ مانا تو آپ نے بد دعا کی اور نزول عذاب کے وقت آپ شہر سے باہر چلے گئے۔ صبح کو ایک ابر سرخ شہر پر چھا گیا جس سے آگ برسنے لگی، لوگوں نے اب یونس کو ڈھونڈا کہ ان کے ہاتھ پر توبہ کر کے اس عذاب سے نجات حاصل کریں لیکن وہ نہ ملے کیونکہ وہ بہت دور چلے گئے تھے مجبور ہو کر شہر والے باہر نکلے اور تین روز تک گریہ و زاری کے ساتھ توبہ کرتے رہے چوتھے روز یہ طوفان عذاب دفع ہوا۔

یونس اہل نینوا سے بیزار ہو کر دریا کے کنارے پہونچے اور کشتی میں سوار ہو کر چلدیے جب کشتی نصف دریا میں پہونچی اور مخالف ہوائے جان کا خطرہ پیدا کر دیا تو آپ کو اپنی غلطی یا خطا کا احساس ہوا اور اپنے آپ کو دریا میں ڈال دیا، ایک مچھلی آپ کو نگل گئی اور چالیس دن تک آپ اس کے پیٹ میں رہے، اس کے بعد

اس نے آپ کو ساحل پر اگل دیا اور چالیس روز تک یہاں پڑے رہے جب اس عرصہ کے بعد آپ میں توانائی آئی تو پھر اسی شہر کی طرف جانے کا حکم ہوا۔

چونکہ شہر سے چلا جانا خدا کی مرضی کے خلاف تھا اس لئے آپ کو یہ سزا دی گئی کہ مچھلی نے نگل گیا اور جب آپ کی توبہ قبول ہوئی تو پھر مچھلی نے اگل دیا اور آپ نے پھر وعظ و تبلیغ کی خدمت انجام دینی شروع کیں۔

کلام مجید میں چھ جگہ یونس کا ذکر آیا ہے۔ ایک سورۃ نساء میں :-

انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح والنبیین من بعدہ و اوحینا الی ابرٰھیم
واسمٰعیل واسحاق ویعقوب والاسباط وعیسٰی وایوب ویونس وھارون و
سلیمان واٰتینا داوٗد زبورا (سورۃ نساء - آیت ۱۶۳)

دوسری جگہ سورۃ انعام میں :-

ووھبنا لہ اسحاق ویعقوب کلا ھدینا ونوحا ھدینا من قبل ومن ذریتہ
داوٗد وسلیمان وایوب ویوسف وموسٰی وھارون وکذلک نجزی المحسنین
وزکریا ویحیٰی وعیسٰی والیاس کل من الصالحین واسمٰعیل والیسع ویونس و
لوطا وکلا فضلنا علی العالمین۔ (سورۃ انعام آیت ۸۵-۸۶)

تیسری جگہ سورۃ یونس میں :-

فلولا کانت قریۃ اٰمنت فنفعھا ایمانھا الا قوم یونس. لما اٰمنوا کشفنا عنھم
العذاب الخزی فی الحیٰوۃ الدنیا ومتعنٰھم الی حین۔ (سورۃ یونس آیت ۹۸)

چوتھی جگہ سورۃ انبیاء میں :-

وادخلنٰھم فی رحمتنا انھم من الصالحین ۔ وذاالنون اذ ذھب مغاضبا فظن ان لن نقدر علیہ فنادیٰ فی الظلمٰت ان لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین ۔ (سورۂ انبیا۔ آیت ۸۶-۸۷)

پانچویں جگہ سورۂ الصافات میں :-

وان یونس لمن المرسلین ۔ اذ ابق الی الفلک المشحون ۔ فساھم فکان من المدحضین ۔ فالتقمہ الحوت وھو ملیم ۔ فلولا انہ کان من المسبحین ۔ للبث فی بطنہ الیٰ یوم یبعثون ۔ (سورۂ الصافات آیت ۳۹-۴۴)

چھٹویں جگہ سورۂ قلم میں :-

فاصبر لحکم ربک ولا تکن کصاحب الحوت اذ نادیٰ وھو مکظوم ۔ لولا ان تدارکہ نعمۃ من ربہ لنبذ بالعراء وھو مذموم ۔ (سورۂ قلم آیت ۴۸-۴۹)

سورۂ نساء اور سورۂ انعام کی مذکورۂ بالا آیتوں سے تو صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ یونس نبی تھے اور اللہ نے انھیں ہدایت کے لئے مامور فرمایا تھا۔ سورۂ یونس کی آیت ۹۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم یونس ہی ایک ایسی قوم تھی جس کو عذاب میں مبتلا ہونے کے بعد ایمان لانے اور توبہ کرنے پر نجات مل گئی۔ سورۂ انبیا میں انھیں ذوالنون کے لقب سے یاد کیا ہے، نون مچھلی کو کہتے ہیں اس سے ذوالنون کے معنی ہوئے "صاحب الحوت" کے جیسا کہ سورۂ قلم میں ظاہر کیا گیا ہے۔ سورۂ انبیا کی اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ جب یونس غصہ ہو کر چلے گئے اور گمان یہ کیا کہ ہم اس کو ضیق میں نہ ڈالیں گے تو اس نے مصیبت میں ہمیں پکارا کہ سوائے تیرے کوئی خدا نہیں اور تیرے ہی لئے پاکی و برتری

ہے بیشک وہ مدد سے تھا ذکر جانے والوں میں تھا۔ اس آیت سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ یونس اپنی قوم سے برہم ہو کر چلے گئے کشتی میں روانہ ہوئے اور مچھلی سے نگل لئے جانے والا کوئی ذکر نہیں ہے سوائے اس کے کہ انھیں ذوالنون کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔

سورہ والصافات میں بیشک آپ کے کشتی میں سوار ہو کر جانے اور مچھلی کا لقمہ بن جانے کا ذکر ہے۔ انھیں آیات پر فیصلہ کا انحصار ہے۔ ان آیات کو ہم اوپر نقل کر چکے ہیں۔ ان کا ترجمہ یہاں درج کیا جاتا ہے:-

"یونس بیشک رسولوں میں سے تھا جب وہ بھاگا ایک بھری ہوئی کشتی کی طرف پس وہ شریک ہو گیا اُن کا اس حال میں کہ تھا وہ خارج البلد ہونے والوں میں سے پس پکڑ لیا اس کو مچھلی نے اس حال میں کہ وہ ملامت زدہ تھا پس اگر وہ نہ ہوتا خدا کی پاکی بیان کرنے والوں میں سے تو وہ رہتا اس کے بطن (پیٹ) میں قیامت کے دن تک۔"

ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یونس جب نینوا سے چلے ہیں تو وہ بھاگ کر ایسی کشتی پر سوار ہوئے جو لدی ہوئی تھی یعنی اس میں اور مسافر بھی تھے اور اسباب بھی بہت سا موجود تھا۔ ان کو خارج البلد کہنا اس احساس کی بناء پر ہے جو ان کے دل میں پایا جاتا تھا چونکہ وہ اپنے شہر اور اعزہ کو چھوڑ کر آ رہے تھے اس لئے اپنے آپ کو خارج البلد محسوس کرتے تھے اور ملامت زدہ کہنا قوم کے نقطۂ نظر سے ہے لیکن قابل غور صرف التقمہ الحوت کے الفاظ ہیں اور اس کے بعد فلبث فی بطنہ

کا فقرہ جس سے یہ استدلال ہو سکتا ہے کہ مچھلی نے ان کو نگل لیا اور وہ اس کے پیٹ میں رہے بعض لوگوں نے توریت کے انداز بیان پر غور کیا ہے ان سے یہ امر مخفی نہ ہوگا کہ اس میں آفات ارضی و مصائب طبیعی کو ہر جگہ طوفان سمندر کی تاریکی اور بحری درندوں وغیرہ سے تعبیر کیا ہے اور چونکہ یہ اسلوب بیان افہام کے ڈرانے اور سمجھانے کے لئے زیادہ مفید ہوتا ہے اس لئے کہیں کہیں قرآن پاک میں بھی بجنسہ اس کو اختیار کر لیا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی التزام کیا ہے کہ اصل واقعہ کی حقیقت کا بھی اظہار ہو جائے۔ اور جو عام روایات میں حشو و زوائد داخل ہو گئے ہیں ان کی تردید کر دی جائے۔

یہودیوں کے یہاں یونس کے متعلق یہ روایت پائی جاتی تھی کہ وہ چالیس دن تک مچھلی کے پیٹ میں رہے لیکن قرآن میں اس کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا بلکہ التقمہ الحوت سے ان کو صرف آفات دنیا و آفات بحر میں مبتلا ہونا مراد لیا گیا ہے۔ اور اگر اس سے مقصود واقعی یہ ہو کہ مچھلی نے آپ کو پکڑ لیا تو بھی کوئی خلاف عقل بات نہیں کیونکہ ایسا ہونا بالکل ممکن ہے۔ اگر مچھلی کے نگل لینے اور پھر دنوں تک ان کے پیٹ میں رہنے کا بیان ہوتا تو اس کو خلاف عقل کہہ سکتے تھے اور کلام مجید میں اس کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ اس کی تائید رسول اللہ کی ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں ارشاد فرمایا ہے "مچھلی نے ضرور آپ کی ایڑی پکڑ لی تھی"

اب رہ گیا لبث فی بطنہ، سو اس سے بھی کوئی حرج لاحق نہیں ہوتا کیونکہ کلام مجید میں یہ نہیں لکھا کہ یونس بطن ماہی میں رہے۔ بلکہ ارشاد یوں ہوتا ہے کہ اگر

دوسکین میں سے نہ ہوتے تو بطن ماہی میں قیامت تک رہتے لیکن ایسا نہیں ہوا۔
بعض نے بطن کے معنی قبیلہ و خاندان کے لیے ہیں اور یہ معنی لیے ہیں کہ اگر اللہ کی پاکی بیان کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو ہمیشہ خاندان اور قبیلہ میں صرف ایک معمولی آدمی کی حیثیت سے رہتے اور رسالت کی خدمت انہیں نہ ملتی۔
سورۂ قلم میں آپ کو صاحب حوت کہنا اسی واقعہ کی مناسبت سے ہے۔

قرآن اور اس کا جغرافیہ

(مسٹر جے مارٹن بمبئی)

ماہ جون کی ڈاک میں بمبئی کے کسی اہل کلیسہ کی تحریر سے جو لطف آپ کو حاصل ہوا تھا یقیناً وہ اب اس تحریر سے اور دوچند ہو جائے گا تعجب اور افسوس ہے کہ ہندوستان کا ایک مشہور ادیب جس کی انشاپردازی کے یورپی رسائل بھی مدح سرا ہوں ایسی سطحی نظر سے کام لے اور کسی "دنداں شکن" دلیدہ موسے اُلجھ بیٹھنے کی دھمکی دے کر خاموش رہنے کی تنبیہ کرے۔ یہ اسلام کی بد اخلاقی کی پہلی مثال ہے۔ خیر ہمیں کیا، ہم کو اپنے کام سے کام ہے۔ امید ہے کہ آپ ذیل کے اعتراضات کو نہایت غور سے پڑھ کر ہماری تشفی کریں گے۔ ہم ان سوالات کو بمبئی کے بڑے بڑے

علمائے اسلام کے پاس لے گئے مگر بجائے جواب دینے کے کافر کافر کہہ کر نکال دیا گیا، جس مذہب اور جس قوم کے اخلاق کی یہ حالت ہو کیا اُسے تنگ خیال اور اوہام پرست کہنا درست نہیں ہے۔

آخر میں یہ اور عرض کروں گا کہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہم قرآن کی عزت نہیں کرتے۔ نہیں ہم اس کی عزت کرتے ہیں مگر خدا کا کلام کہنے میں ذرا تامل ہے۔

اعتراضات[1] یہ ہیں:-

(۱) محمد نے تعلیم دی ہے کہ سات آسمان ہیں ایک دوسرے کے اوپر اور سات زمینیں ہیں ایک دوسرے کے نیچے اور ہر ایک کے درمیان ۵۰۰ سال کا فاصلہ ہے۔ سورۂ طلاق میں آیا ہے کہ خدا نے سات آسمان پیدا کئے ہیں اور اتنی ہی زمینیں۔

حدیث میں زمین کے درجے اس طرح بتائے گئے ہیں:-

پہلے طبقے کے بسنے والے آدمی، جن اور حیوانات ہیں، دوسرے طبقے میں دم گھونٹنے والی ہوا ہے جس نے عاد کی نافرمان قوم کو تباہ کیا۔ (سورۂ الحاقہ)

تیسرے طبقے میں جہنم کے پتھر ہیں جن کا سورۂ تحریم میں ذکر ہے اور جس کا ایندھن آدمیوں کو بھی بتایا گیا ہے، چوتھے طبقے میں دوزخ کی گندھک

---

[1] اعتراضات انگریزی میں تھے یہاں ان کا ترجمہ ہے جو درج کیا جاتا ہے (نہال)

ہے پانچویں میں سانپ ہیں، چھٹے میں بچھو ہیں جو رنگ اور جسامت میں سیاہ خچروں کی طرح ہیں اور جن کی دم نیزوں کی طرح ہے ساتویں طبقے میں شیطان اور فرشتے ہیں۔

زمین کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ ایک فرشتہ کے کندھوں پر قائم ہے جو لعل کی ایک چٹان پر کھڑا ہے، یہ چٹان ایک بڑے بیل کی پیٹھ پر قائم ہے جس کے چار ہزار آنکھیں ہیں اور اتنے ہی کان، ناک، منہ، زبان اور پاؤں، ہر کان کے درمیان پانسو سال کا فاصلہ ہے، اس بیل کا نام کجاتہ ہے اور یہ بیل ایک مچھلی پر قائم ہے جس کا نام بہاموت ہے۔ زمین کو مسلمان مصنفین نے وسیع میدان بتایا ہے اور کہا ہے کہ اس کے چاروں طرف ایک بڑا سمندر بحر محیط ہے جس کے چاروں طرف کوہ قاف ہے زمین کی وسعت کو پانسو سال کی مسافت بتایا ہے، محیط پر عرش ابلیس ہے اور اس کا مغربی حصہ بحر ظلمات ہے۔ جغرافیہ میں مسلمان مصنفین نے ہندوؤں کی طرح گھر دنیا میں بیٹھ کر سمندر اور ملک سب اپنے دل سے گھڑ کے بنا دیئے، ظاہر ہے کہ یہ تمام بیانات کس قدر غلط ہیں، زمین کروی شکل کی ہے ۲۵۰۰۰ میل اس کا دور ہے اور ۸۰ دن یا اس سے کم میں لوگ اس کی سیاحت کر سکتے ہیں۔

(۲) سورۂ نحل میں آیا ہے کہ "خدا نے زمین پر پہاڑ بنا دیئے ہیں تاکہ وہ جنبش میں نہ آ سکے" مسلمان خیال کرتے ہیں کہ زمین جب اول اول

بنی تو جھکی اور ہر ابر تھی، فرشتوں نے کہا ایسی ہلتی ڈلتی چیز پر
کون قائم رہ سکتا ہے تو خدا نے پہاڑ بنا کر اُسے قائم کر دیا۔ حالانکہ
پہاڑوں کا یہ فائدہ نہیں ہے بلکہ وہ بادلوں کو جذب کرتے
ہیں اور بارش لاتے ہیں۔ چنانچہ گنگا وغیرہ کا ہمالیہ سے پیدا
ہو کر جاری رہنا اسی بنا پر ہے

(۳) سورہ حجر میں لکھا ہے کہ "ہم نے آسمان میں بارہ نشانیاں
مقرر کی ہیں اور ہم نے انھیں مختلف صورتوں میں بنایا ہے تاکہ
لوگ دیکھیں اور ہم ان کی حفاظت کرتے ہیں شیطان سے جو
ہانکا جاتا ہے پتھروں سے، سوائے اس کے جو سنتا ہے چوری
سے اور جس پر ایک نمایاں شعلہ پھینکا جاتا ہے"

قرآن نے سمجھایا ہے کہ شیطان اوپر چڑھتے ہیں اور معلوم
کرنا چاہتے ہیں کہ آسمان میں کیا ہو رہا ہے، ان کو پتھروں سے
بھگایا جاتا ہے، اسی طرح جب کوئی ستارہ ٹوٹتا ہے تو مسلمان
یقین کرتے ہیں کہ فرشتے جو برج کی حفاظت پر مامور ہیں شیطان
پر تیر مارتے ہیں حالانکہ شہاب ثاقب ہمارے ہی زمین کے اجزاء
ہیں اور بعض اوقات زمین پر بھی گر جاتے ہیں، ہوا کی رگڑ سے
وہ مشتعل ہو جاتے ہیں، الغرض قرآن کا بیان غلط ہے

(۴) اگر قرآن کے احکام پر عمل کیا جائے تو بعض ملکوں کے

لوگ تنہا ہو جائیں۔ رمضان کے متعلق سورۂ بقر میں حکم ہے کہ "کھاؤ پیو جب تک سیاہ خط میں سپید خط نمودار نہ ہو جائے پھر اس کے بعد رات تک روزہ رکھو" محمد عرب تھے جنھوں نے کہیں باہر کا سفر نہ کیا تھا اور جغرافیہ سے واقف نہ تھے، اہل عرب اس حکم پر عمل کر سکتے ہیں لیکن ساری دنیا عمل نہیں کر سکتی، محمد ایسے ملک میں رہتے تھے جہاں دن رات تقریباً برابر ہوتے لیکن شمال میں جہاں آفتاب ہفتوں غروب نہیں ہوتا وہاں کے لوگ اگر اس پر عمل کریں گے تو ہلاک ہی ہو جائیں گے، اگر اسلام ساری دنیا کا مذہب ہوتا تو اس کے احکام بھی ایسے ہونے چاہئے تھے جن پر ہر ملک انسان عمل کر سکتا۔

آپ نے سب سے پہلی غلطی تو عنوان قایم کرنے میں کی ہے کیونکہ آپ کے اعتراضات کا تعلق زیادہ تر جیالوجی (طبقات الارض) سے ہے نہ کہ جغرافیہ سے اور دوسری غلطی یہ کی ہے کہ قرآن کے بتائے ہوئے "غلط جغرافیہ" میں آپ نے احادیث کو بھی شامل کر لیا ہے جو بالکل اصول بحث کے خلاف ہے پھر آپ نے یہ ظلم اور کیا ہے کہ نہ احادیث کی اصل عبارت درج کی اور نہ قرآن مجید کی لیکن چونکہ قرآن کی آیات کے ذکر میں آپ نے سورہ کا حوالہ دیدیا ہے اس لئے انھیں تو میں نے ڈھونڈھ نکالا لیکن احادیث کے متعلق چونکہ اس قدر تحریر کی بھی زحمت

گوارا نہیں فرمائی کہ کہاں اور کس کتاب میں آپ نے دیکھا ہے اس لئے میں نے خود اس خدمت کو انجام دینا مناسب نہیں سمجھا جو آپ کو کرنی چاہئے تھی۔ اس لئے جواب میں صرف کلام مجید کی ان آیات سے بحث کروں گا جن کے مطالب پر آپ کو مغالطہ اور غلط فہمی کا شبہ ہوا ہے اور احادیث سے اس وقت کوئی گفتگو نہ کروں گا جب تک آپ ان کا پورا حوالہ نہ دیں اور اصل عبارت نقل نہ کریں۔

(۱) آپ کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ کلام مجید (سورۂ طلاق) میں لکھا ہے کہ خدا نے سات آسمان پیدا کئے اور اتنی ہی زمینیں اسی کے ساتھ آپ نے ایک حدیث کا بھی حوالہ دیا ہے جس میں طبقات زمین کے باشندوں اور کرۂ ارض کا ایک فرشتہ کے کندھے پر قائم ہونا اور اسی طرح کی اور چند بیہودہ باتوں کا ذکر کیا ہے۔ میں اس حدیث یا کسی اور عالم کے قول سے اس جگہ کوئی گفتگو نہ کروں گا کیونکہ اول تو آپ نے نہ اصل عبارت نقل کی ہے اور نہ یہ تحریر فرمایا ہے کہ یہ حدیث آپ نے کہاں دیکھی اور دوسری یہ کہ اس قسم کی حدیثیں اکثر نامعتبر و موضوع ہیں اور درایتاً پایۂ تحقیق سے گری ہوئی ہیں لیکن سورۂ طلاق کی اس آیت کا مفہوم ضرور آپ کو بتاؤں گا جس میں سات آسمان اور سات زمینوں کے پیدا کرنے کا حال درج ہے کلام مجید کی آیت یہ ہے:-

اللہ الذی خلق سبع سمٰوٰت ومن الارض مثلھن تتنزل الامر بینھن لتعلموا ان اللہ علیٰ کل شئی قدیر وان اللہ قد احاط۔	اللہ وہ ہے جس نے پیدا کئے سات آسمان اور زمینیں بھی اتنی ہی اللہ کا حکم ان میں نازل ہوتا رہتا ہے تاکہ تم جان سکو

بحل مشتی علما — کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور یہ کہ اللہ کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ (سورۂ طلاق - آیت ۱۲)

اس پر اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ کلام مجید میں آسمان و زمین کی تعداد بتائی گئی ہے حالانکہ آسمان کا کوئی وجود فی الخارج نہیں ہے، زمین صرف ایک ہے اور اگر سات زمینوں سے اس کے طبقے مراد ہوں تو بھی یہ کہنا صحیح نہیں کیونکہ اس کے طبقات خدا جانے کتنے ہیں۔

کلام مجید میں آسمان یا سماء و سمٰوات کا ذکر بہت جگہ آیا ہے اور ان پر غور کیا جائے تو آسانی سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ قرآن میں جو مفہوم آسمان کا بتایا گیا ہے وہ کسی طرح موجودہ نظریہ کے منافی نہیں ہے۔

عربی زبان میں لفظ سماء آسمان کے لئے کوئی اصطلاحی لفظ نہیں ہے بلکہ ہر اس منظر کے لئے استعمال ہوتا ہے جو بلند نظر آئے چنانچہ غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کلام مجید میں کہیں لفظ سماء بول کر صرف بادل مراد لئے گئے ہیں جیسے "او کصیب من السماء یا انزل من السماء ماءً" میں اور کہیں صرف فضائے بسیط مقصود ہے جیسے "ثم استویٰ الی السماء وہی دخان" میں۔

اس لئے یہ بحث طلب امر رہ جاتا ہے کہ اگر سماء یا سمٰوات سے مراد صرف فضاء بلند ہے تو سورۂ طلاق میں سبع سمٰوات کیا مطلب ہو سکتا ہے۔

عربی زبان میں الفاظ سبع (سات) سبعین (ستر) اور سبع مائۃ (سات سو) جس طرح محدود عدد کے اظہار کے لئے آتے ہیں۔ اسی طرح بعض جگہ ان سے صرف اظہار

کثرت مراد ہوتی ہے یعنی سات، ستر وغیرہ بول کے صرف کثرت ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے سورۂ برائت میں ارشاد ہوتا ہے "ان تستغفر لہم سبعین مرۃ فلن یغفر اللہ لہم" (اگر تم ان کے لئے ستر مرتبہ مغفرت طلب کرو گے تو خدا انھیں معاف نہ کرے گا) ظاہر ہے کہ یہاں ستر سے مراد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ تم کتنی ہی مرتبہ طلب مغفرت کرو لیکن اللہ معاف نہ کریگا کیونکہ اگر عدد معین مراد ہوگا تو یہ معنی ہوں گے کہ اگر ستر مرتبہ کے بعد اکہترویں مرتبہ مغفرت طلب کی گئی تو اللہ معاف کردے گا، جو بالکل لغو و مہمل بات ہے۔

الغرض اول تو سورۂ طلاق کی اس آیت میں سبع کے معنی سات کے نہیں ہیں بلکہ محض کثرت کے اظہار کے لئے آیا ہے اور اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے بہت سے آسمان بنائے اور بہت زمینیں پیدا کیں۔ اس لئے اب تحقیق طلب صرف سموات اور ارض کا مفہوم رہ جاتا ہے سو اس کے متعلق جس وقت کلام مجید کی آیات پر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح سمآء، بادل اور بلندی کے معنی میں استعمال ہوا ہے اسی طرح مدار کے معنی میں بھی آیا ہے (مدار سے مراد وہ خط ہے جس پر ایک سیارہ گردش کرتا ہے اور جسے انگریزی میں (Orbit) کہتے ہیں) چنانچہ ایک جگہ نہایت صاف صاف بجائے سموات کے طرائق (راستے) استعمال کیا گیا ہے ملاحظہ ہو سورۂ مومنون آیت ۱۷ (ولقد خلقنا فوقکم سبع طرائق) یعنی بنائے ہم نے تمہارے اوپر فضا میں بہت سے راستے یا مدار جن پر سیارے گردش کرتے ہیں تفسیر بیضاوی میں بھی لفظ سمآء کی تحقیق اس طرح کی گئی ہے "والمراد بالسماء ہٰذا الاجرام العلویۃ او جہات العلو" یعنی سمآء سے مراد اجرام علوی (کواکب سیارے) ہیں یا بلند اطراف، سورۂ الذاریات میں ارشاد ہوتا ہے "والسماء ذات الحبک"

حُبُک جمع ہے حبک کی اور حبکہ کہتے ہیں راستہ کو اس لئے یہاں سما سے مراد ہوئی وہ فضا جس میں سیاروں کے راستے یا مدار واقع ہوتے ہیں۔

اب رہ گیا یہ امر کہ اگر سورۂ طلاق کی اس آیت میں سمٰوات سے سیاروں کے مدار مراد ہیں تو اس کا کیا مطلب ہوگا کہ زمینیں بھی اتنی ہی پیدا کی گئیں سو امام راغب نے اس کا بہترین فیصلہ کیا ہے کہ "ہر سما ایک فلک ہے اپنے تحت کے لحاظ سے اور زمین ہے اپنے فوق کے لحاظ سے یعنی ہر سیارہ جس طرح نیچے واقع ہونے والے سیارہ کے لحاظ سے ایک فلک کا حکم رکھتا ہے اسی طرح وہ اپنے سے بلند واقع ہونے والے سیارہ کے لحاظ سے زمین کا حکم رکھتا ہے اور اس لئے خدا کا یہ ارشاد کہ جتنے ہم نے افلاک بنائے اتنی ہی زمینیں پیدا کیں بالکل حقیقت کے موافق ہے۔

اگر سبع کے معنی یہاں سات کے لئے جائیں تو بھی نادرست نہیں کیونکہ سات سیارہ کا علم اس وقت بھی لوگوں کو تھا اور اس لحاظ سے سورۂ طلاق کی یہ آیت گویا اس وقت کے دریافت شدہ نظام شمسی سے بحث کرتی ہے۔

(۲) آپ کا دوسرا اعتراض سورۂ نحل کی کسی آیت پر ہے جس کو آپ نے نقل تو نہیں کیا لیکن اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ "خدا نے زمین پر پہاڑ بنائے تاکہ وہ جنبش میں نہ آئے"۔ تلاش سے صرف ایک آیت سورۂ نحل میں ایسی ملی ہے جہاں پہاڑوں کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے:-

"والقیٰ فی الارض رواسی ان تمید بکم"

آپ نے اس کا ترجمہ و مفہوم خدا معلوم کس انگریزی مترجم و مفسر کی کتاب سے اخذ کیا ہے

اگر آپ اس کے حقیقی مطلب کو سمجھ لیتے تو بجائے کسی شبہ کے آپ کو قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا یقین آجاتا کیونکہ یہ آیت زمین اور پہاڑ کی نسبت وہی معلومات پیش کرتی ہے جو علماء طبقات الارض نے دریافت کی ہے۔

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ خدا نے زمین میں پہاڑ پیدا کر دئے تاکہ وہ جنبش میں نہ آئے اس حال میں کہ تم اس پر آباد ہو۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ زمین پہلے بالکل اہتزاز و اضطراب کی حالت میں تھی اور اس قابل نہ تھی کہ انسان اس پر آباد ہو سکتا لیکن جب رفتہ رفتہ اس میں انجمادی کیفیت پیدا ہوتی گئی، یہاں تک کہ اس کی تہریاں منجمد ہو کر پہاڑ بن گئیں تو وہ انسانی آبادی کے قابل بن گئی اور پھر اس کی کیفیت اہتزاز جاتی رہی "القیٰ فی الارض رواسی" سے مقصود صرف یہی ظاہر کرنا ہے کہ زمین کی مضطرب حالت کو دور کیا گیا، یہاں تک کہ اس میں پہاڑ پیدا ہو گئے اور "ان تمید بکم" سے مراد یہ ہے کہ زمین انسانی آبادی کے قابل بن گئی۔

(۳) آپ کے تیسرے اعتراض میں غالباً سورۂ حجر[۵] کی حسب ذیل آیات کی طرف اشارہ ہے۔

"ولقد جعلنا فی السماء بروجا وزینٰها للناظرین وحفظنٰها من کل
شیطان الرجیم۔ الا من استرق السمع فاتبعه شهاب مبین"

آپ نے ان آیات کے سمجھنے میں بھی غلطی کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ کے

---

۵ سیل مارٹن صاحب نے اس سورہ کا نام انگریزی میں "HAJOR" لکھا ہے حالانکہ فی الاصل یہ لفظ حجر ہے اور اسے "HIJR" لکھنا چاہیے تھا۔

مبعوث ہونے سے قبل عرب میں کاہنوں کی بڑی کثرت تھی جو طرح طرح کی پیشین گوئیاں کرکے لوگوں کو ڈراتے رہتے تھے، وہ مدعی تھے کہ ان کے موکل یا جن آسمان کی باتیں سن سن کر انھیں بتاتے ہیں اور سیاروں کی حرکت اور بروج کے مطالعہ سے سعد و نحس ساعتوں کا علم انھیں ہوتا ہے۔

ان آیات میں بروج سے وہی ہیئت کے برج مراد ہیں (نہ کہ نشانیاں جیسا کہ آپ نے سمجھا ہے) اور اسی زبان و اصطلاح میں ان کاہنوں کا حال بیان کیا گیا ہے جو اس وقت مستعمل تھی، شیطان رجیم اور موکل جنھیں وہ اپنا تابع بتاتے تھے۔ لفظ رجیم نہایت لطیف اشارہ ان کی جھوٹی پیشین گوئی کی طرف ہے جیسا کہ اس طرح کی لغو پیشین گوئی کو رجم بالغیب بھی کہتے ہیں سورہ ملک کی ایک آیت سے اور زیادہ اس کی تصدیق ہوتی ہے ملاحظہ ہو آیت ۵ -

" ولقد زینا السماء الدنیا بمصابیح وجعلنا رجوماً للشیاطین "

اس آیت میں نمایاں طور پر کاہنوں کو شیاطین اور ان کی پیشین گوئی کو رجم بالغیب کہا گیا ہے۔

استرق السمع سے مراد کاہنوں کی وہ بعض باتیں ہیں جو علم ہیئت کی رو سے (مثلاً کسوف و خسوف کی پیشین گوئیاں) صحیح اترتی تھیں اور شہاب مبین سے مدعا واقعی انگارہ یا ٹوٹنے والا ستارہ نہیں ہے بلکہ مجازاً بمعنی خسران و ناکامی، تباہی و بربادی استعمال کیا گیا ہے کیونکہ اس وقت لوگوں کا یہی عقیدہ تھا کہ جب ستارے ٹوٹتے ہیں تو ضرور کوئی آفت آتی ہے۔

اب ان آیات کا مفہوم یہ ہوا کہ آسمان میں جو برج ہیں ان کے متعلق کاہنوں کا یہ کہنا کہ ان پر انھیں اقتدار حاصل ہے بالکل غلط ہے کیونکہ خدا نے ان کو رجم بالغیب کرنے والے اوہام ظن و گمان پر پیشین گوئیاں کرنے والے کاہنوں کی دسترس سے محفوظ رکھا ہے اور اگر کبھی کوئی پیشین گوئی ان کی (مثلاً کسوف و خسوف وغیرہ کے متعلق) صحیح ہو جاتی ہے تو اس پر قیاس کر کے اور باتوں پر بھروسہ نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ تو ایسی ہی باتیں تھیں جنھیں شہاب مبین نے باطل کر دیا ہے، شہاب مبین سے مراد یہاں اسلام و قرآن ہے نہ کہ ٹوٹنے والا ستارہ۔ چونکہ یہاں ذکر بروج وغیرہ کا تھا اس لئے اسے شہاب مبین کہا گیا جو اسلوب بیان کی پاکیزگی کی آخری حد ہے اور جس سے ان کے اس اعتقاد کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے کہ ستاروں کے ٹوٹنے کو وہ بربادی کی علامت سمجھتے تھے۔

(۴) آپ کا چوتھا اعتراض یہ ہے کہ قرآن میں روزہ رکھنے کے متعلق یہ حکم ہے کہ جب سپید خط سیاہ خط سے نمودار ہو تو روزہ شروع کیا جائے اور رات تک اس کو جاری رکھا جائے لیکن شمالی ممالک میں جہاں ہفتوں کا دن ہوتا ہے اس پر عمل ناممکن ہے اور اس لئے اسلام کی تعلیم ایسی نہیں ہے جس پر ہر ملک انسان عمل کر سکے۔

خیط ابیض کا خیط اسود سے نمودار ہونا صرف طلوع صبح کے معنی رکھتا ہے اس لئے روزہ کا حکم یہ ہوا کہ طلوع صبح سے اس کی ابتدا کرو اور شام کو ختم کر دو یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ پورے دن بھر روزہ رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ شمالی ممالک میں جہاں دن بہت طویل ہوتے ہیں یقیناً اس پر عمل نہیں ہو سکتا لیکن جہاں کلام مجید میں یہ ہدایت

کی گئی ہے دہیں اور احکام بھی قابل غور ہیں مثلاً ارشاد ہوتا ہے :-

"کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون ایاماً معدودات"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روزہ کی میعاد صرف چند دنوں تک محدود ہے اور دو مہینہ سے تجاوز نہیں ہو سکتا، پھر جن ممالک میں مہینوں آفتاب غروب نہیں ہوتا وہاں ان دن کا شمار طلوع و غروب کے حساب سے نہیں ہوتا اور نہ اس حساب سے مہینہ متعین کیا جاتا ہے بلکہ اسی ایک طویل دن کے ٹکڑے کر کے متعدد شب و روز متعین کئے جاتے ہیں اس لئے ایسے ممالک میں روزہ کا حکم بھی اسی تعیین کے لحاظ سے ہوگا اور جس طرح تمام کاروبار میں عمل و راحت کی تفریق ہوگی اسی طرح روزہ کی بھی تعیین ہوگی۔

کلام پاک میں ایک اور آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سال وغیرہ کا حساب کرنے میں طلوع قمر کا لحاظ کیا جائے نہ کہ طلوع شمس کا، ارشاد ہوتا ہے۔

"ہو الذی جعل الشمس ضیاءً و القمر نوراً و قدرہ منازل لتعلموا عدد السنین و الحساب"

اس میں قدرہ کی ضمیر قمر کی طرف راجع ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سالوں کا حساب چاند کی مقررہ منازل کے لحاظ سے کیا جائے گا تو روزہ ویسا ہی آسان ہو جائیگا جیسا دوسرے ممالک میں (اگر آپ کو چاند کے ان منازل کے سمجھنے میں اشکال واقع ہو تو مجھ سے دریافت فرما سکتے ہیں)

علاوہ اس کے "لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا" سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے ممالک میں ایام صیام کی تعیین اسی انداز سے کی جائے گی جو معتدل ممالک میں رائج ہے

اگر آپ اس کے حقیقی مطلب کو سمجھ لیتے تو بجائے کسی شبہ کے آپ کو قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا یقین آجاتا کیونکہ یہ آیت زمین اور پہاڑ کی نسبت وہی معلومات پیش کرتی ہے جو علماء طبقات الارض نے دریافت کی ہے۔

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ خدا نے زمین میں پہاڑ پیدا کر دئے تاکہ وہ جنبش میں نہ آئے اس حال میں کہ تم اس پر آباد ہو۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ زمین پہلے بالکل اہتزاز و اضطراب کی حالت میں تھی اور اس قابل نہ تھی کہ انسان اس آباد ہو سکتا لیکن جب رفتہ رفتہ اس میں انجمادی کیفیت پیدا ہوتی گئی یہاں تک اس کی جھریاں منجمد ہو کر پہاڑ بن گئیں تو وہ انسانی آبادی کے قابل بن گئی اور یہ اس کی کیفیت اہتزاز جاتی رہی "والقیٰ فی الارض رواسی" سے مقصود صرف یہی ظاہر کرنا ہے کہ زمین کی مضطرب حالت کو دور کیا گیا، یہاں تک کہ اس میں پہاڑ پیدا ہو گئے اور "ان تمید بکم" سے مراد یہ ہے کہ زمین انسانی آبادی کے قابل بن گئی

(۳) آپ کے تیسرے اعتراض میں غالباً سورۂ حجر[1] کی حسب ذیل آیات کی طرف اشارہ ہے۔

"ولقد جعلنا فی السماء بروجا وزینّٰھا للناظرین وحفظنا ہا من کل شیطان الرجیم الا من استرق السمع فاتبعہ شہاب مبین"

آپ نے ان آیات کے سمجھنے میں بھی غلطی کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ کے

---

[1] جے مارٹن صاحب نے اس سورہ کا نام انگریزی میں (MAJOR) لکھا ہے حالانکہ فی الاصل یہ لفظ حجر ہے اور اسے "HIJR" لکھنا چاہیے تھا۔

آپ تو شاید نہیں لیکن اور حضرات غالباً یہ سن کر متعجب ہوں گے کہ کلام مجید سے یوسف کا غیر معمولی جمیل ہونا کسی طرح ثابت نہیں ہوتا اور ایک جگہ بھی اس کی طرف اشارہ نہیں ہے معجزہ ہونا تو خیر بڑی بات ہے

چونکہ قصۂ یوسفؑ آپ کے سامنے ہوگا اس لئے میں اس کو شروع سے نہیں بیان کرتا بلکہ جن مقامات کے بیان کی ضرورت ہے انھیں کی طرف اشارہ کروں گا۔

کلام مجید میں پہلے خواب دیکھنے کا ذکر ہے کہ انھوں نے چاند سورج اور گیارہ ستاروں کو سجدہ کرتے دیکھا، اس کے بعد بھائیوں کا ان کو کنویں میں ڈال دینے کا بیان ہے اور پھر ایک قافلہ کا آکر اس کنویں سے نکالنے کا ذکر کیا گیا ہے یہاں تک ایک جگہ بھی یوسفؑ کے حسن کا ذکر نہیں ہے حالانکہ وہ موقع جب ان کے بھائیوں نے آپس میں باتیں کی ہیں کہ ہمارا باپ یوسفؑ اور اس کے بھائی کو زیادہ چاہتا ہے ایسا تھا کہ اس چاہنے کی وجہ ان کا جمال ظاہری قرار دی جاتی لیکن اس کا ذکر نہیں کیا گیا اس کے بعد جب کارواں کنویں پر آیا اور اس نے ڈول ڈال کر یوسفؑ کو نکالا تو اس وقت کھنے والے نے صرف یہی کہا کہ "بشریٰ ہذا غلام" اگر یوسف غیر معمولی جمیل ہوتے تو ناممکن تھا کہ وہ دفعتاً گھبرا کر یہ نہ کہہ اٹھتے کہ کیسا خوبصورت لڑکا ہے، بہرحال یہاں سے بھی آپ کے جمال کی نفی ہوتی ہے۔

اس کے بعد جب آپ مصر پہونچتے ہیں اور ایک مصری سردار یا عزیز مصر (عزیز مصر سے شاہ مصر مراد نہیں ہے) آپ کو مول لے کر اپنی بیوی زلیخا کو دیتا ہے تو صرف یہ کہتا ہے کہ "اکرمی مثواہ عسیٰ ان ینفعنا او نتخذہ ولدا" یعنی اس کو اچھی طرح رکھو شاید کسی وقت

تمھارے کام آئے یا ہم اسے متبنیٰ کرلیں"۔ اس نے بھی ان کے حسن و جمال کا ذکر نہیں کیا اس کے بعد خدا یوسف کو جوانی تک پہونچانے کا ذکر کرتا ہے تو ان الفاظ میں :-

"ولما بلغ اشدہ آتینہ حکما وعلما"

یعنی جب وہ جوان ہوا تو ہم نے اس کو علم و حکمت سکھائی۔ اس جگہ بھی ان کے جمال کا کوئی ذکر نہیں ہے حالانکہ اگر اللہ ان کو علم و حکمت کے ساتھ صورت ظاہری بھی غیر معمولی عطا کرتا تو ضرور وہ اس کا اظہار فرماتا۔

اس کے بعد زلیخا کی لگاوٹ کا بیان ہے کہ دروازہ بند کرکے یوسف کو اپنی طرف مائل کرنے لگی لیکن آپ راغب نہیں ہوئے پھر قمیص کے پھٹنے اور یوسف کے الزام سے بری ہونے کا بیان ہے اس میں بھی کہیں آپ کی خوبصورتی کی طرف اشارہ نہیں ہے۔

پھر اس دعوت کا ذکر ہے جب زلیخا نے مصر کی بعض عورتوں کو طلب کرکے یوسف کو ان کے سامنے پیش کیا اور انھوں نے یوسف کو دیکھ کر بجائے پھل کاٹنے کے اپنی انگلیاں کاٹ لیں اور یہی ایک واقعہ ایسا ہے جس سے جمال یوسف پر استدلال کیا جا سکتا ہے یعنی وہ اس قدر جمیل تھے کہ عورتیں انھیں دیکھ کر مبہوت ہو گئیں اور اپنے ہاتھ زخمی کر لئے اور چیخ اٹھیں کہ "ما ھذا بشرا ان ھذا ملک کریم" یعنی یہ انسان نہیں ہے کوئی شریف فرشتہ ہے لیکن چونکہ لوگوں نے اس واقعہ کے سمجھنے میں غلطی کی ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذرا وضاحت کے ساتھ بیان کیا جائے۔ کلام مجید کے الفاظ اس واقعہ کے متعلق یہ ہیں :-

وقال نسوة فی المدینة امرات العزیز
تراود فتٰها عن نفسہ قد شغفها حبا، انا لنراہا
فی ضلٰل مبین. فلما سمعت بمکرہن ارسلت
الیہن واعتدت لہن متکا واتت کل واحدۃ
منہن سکینا وقالت اخرج علیہن، فلما
راینہ اکبرنہ وقطعن ایدیہن وقلن حاش للہ
ما ھٰذا بشرا، ان ھٰذا الا ملک کریم۔ قالت
فذٰلکن الذی لمتننی فیہ ولقد راودتہ عن نفسہ
فاستعصم ولئن لم یفعل ما اٰمرہ لیسجنن ولیکونا
من الصاغرین۔ قال رب السجن احب الی
مما یدعوننی الیہ والا تصرف عنی کیدہن اصب
الیہن واکن من الجاہلین۔

اور کہا چند عورتوں نے شہر میں کہ عزیز
کی عورت اپنے غلام سے لگاوٹ کرتی ہے
اور اس کی محبت میں بے قرار ہے بیشک ہم
دیکھتے ہیں اس کو علانیہ گمراہی میں۔ جب عزیز
مصر کی عورت نے ان کی مکر کی باتیں سنیں تو
انھیں بلا کر ان کی دعوت کی اور ہر ایک کے
ہاتھ میں ایک چھری دیدی اس کے بعد یوسف
سے کہا کہ سامنے آجاؤ، پھر جب دیکھا عورتوں
نے یوسف کو تو اس کو بڑا جانا اور اپنے ہاتھ
کاٹ لئے اور بولیں دہائی ہے یہ انسان
نہیں ہے بلکہ بزرگ فرشتہ ہے۔ زلیخا
نے کہا یہ وہی ہے جس کی بابت تم مجھ کو
ملامت کرتی تھیں۔ بیشک میں نے اس سے لگاوٹ کی اور وہ بچا رہا لیکن اس نے میرا کہنا نہ مانا
تو وہ ضرور قید کیا جائے گا۔ اور ذلیل ہوگا۔

یوسف نے کہا اے میرے پروردگار قید میں جانا مجھے زیادہ محبوب ہے اس چیز سے
جس کی طرف وہ مجھے بلاتی ہیں اور اگر تو ان کے مکر کو دور نہ کرے گا تو میں ان کی طرف جھک
جاؤں گا، اور جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا۔

حاصل ان آیات کا یہ ہے کہ مصر کی بعض عورتوں نے (جو بعض مفسرین کے بیان

کے مطابق خود عزیز مصر کے ہاں کام کرنے والی یا آنے جانے والی تھیں) زلیخا کی محبت کا چرچا کیا تو زلیخا نے ان کے مکر کو سمجھ کر دعوت دی اور یوسف کو سامنے بلایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے۔ یہاں سب سے زیادہ اہم لفظ مکر ہے۔ عربی میں لفظ مکر کے وہی معنی ہیں جو اردو میں مستعمل ہیں یعنی فریب و خدعہ یا عورتوں کے لحاظ سے اس جگہ تریا چرتر کہہ لیجئے۔ ظاہر ہے کہ محض کسی کی محبت کا ذکر کرنا تہمت یا کسی کو بدنام کرنا مکر تو نہیں ہو سکتا اس لئے صاف ظاہر ہے کہ یا وہ عورتیں خود یوسف سے محبت کرتی تھیں جس کا علم زلیخا کو تھا اور اس لئے ان کے اس تجاہل کو مکر سے تعبیر کیا گیا یا پھر یہ کہ پہلے سے ان عورتوں میں اور زلیخا میں یوسف کو رام کرنے کے لئے کوئی حیلہ طے ہو گیا تھا اور اس لئے اس کو مکر سے تعبیر کیا گیا۔ بہر حال ان میں سے جو بات بھی ہو یہ یقینی ہے کہ جب یوسف ان کے سامنے آئے تو انھوں نے بھی ان کے ساتھ لگاوٹ شروع کی اور جب قابو میں نہ آئے تو ڈرانے کے لئے یا ان کو قید خانہ بھیجنے کے لئے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے۔ اس کا ثبوت خود اس سے بھی ملتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد یوسف نے کیا کہا۔ یوسف کے الفاظ یہ ہیں "السجن احب الی مما یدعوننی الیہ" یعنی قید خانہ مجھے زیادہ محبوب ہے اس چیز سے جس کی طرف وہ بلاتی ہیں۔ اس میں لفظ یدعوننی قابل غور ہے یعنی آپ نے صیغہ جمع میں فرمایا ہے۔ اگر صرف زلیخا کی لگاوٹ کا اظہار مقصود ہوتا تو صیغہ جمع کی ضرورت نہ تھی۔ دوسرا ثبوت انھیں آیات سے اور ملتا ہے وہ یہ کہ جب یوسف نمودار ہوئے اور ان کو دیکھ کر انھوں نے ہاتھ کاٹ لئے تو انھوں نے اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ سے کیا "ان ہذا الا ملک کریم" یعنی

یہ انسان نہیں فرشتہ ہے، لفظ فرشتہ ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یوسف کے حسن و جمال پر حیرت نہیں ہوئی بلکہ ان کے تقدس پر تعجب ہوا یعنی جب انھوں نے دیکھا کہ یوسف ان کی طرف مائل نہیں ہوئے اور ہاتھ کاٹ ڈالنے پر بھی نہ ان کو رحم آیا نہ خوف سے ان کی جانب راغب ہوئے تو انھوں نے کہا کہ یہ آدمی نہیں فرشتہ ہے جو کسی طرح معصیت پر آمادہ ہی نہیں ہوتا۔

اس امر کی تصدیق کہ ان عورتوں نے قصداً ہاتھ کاٹ ڈالنے کا مکر کیا تھا تاکہ یوسف کسی نہ کسی طرح ان کی طرف مائل ہو جائیں یا پھر اس بہانہ سے قید خانے بھیجدیئے جائیں بعد کی آیتوں سے بھی ہوتی ہے اور وہ اس طرح کہ جب یوسف قید خانے بھیجدیئے گئے تو کچھ عرصہ بعد بادشاہ نے ان کے علم تعبیر رویا کا حال معلوم کر کے ایک آدمی ان کے پاس بلانے کو بھیجا تو یوسف نے اس آدمی سے کہا کہ "ارجع الی ربک فسئلہ ما بال النسوۃ التی قطعن ایدیہن، ان ربی بکیدہن علیم" (اپنے مالک پاس واپس جاؤ اور دریافت کرو کہ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے میرا خدا ان کے مکر سے واقف ہے)

جب بادشاہ کے پاس یوسف کا یہ پیغام پہونچا تو اس نے ان عورتوں سے دریافت کیا کہ "ما خطبکن اذ راودتن یوسف عن نفسہ قلن حاش للہ ما علمنا علیہ من سوء" (کیا ہوا تھا جب تم نے یوسف سے لگاوٹ کی تھی، انھوں نے کہا ہم نے یوسف میں کوئی برائی نہ پائی یعنی یہ کہ اس میں کوئی لغزش نہیں پائی) ان آیات سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ ان عورتوں نے یوسف سے لگاوٹ کی اور قصداً اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے

تاکہ شاید اسی طرح وہ مائل ہو جائیں
پھر جب ہاتھ کاٹنے کی صورت یہ قرار پائی تو اس کی وجہ حسن یوسفی نہیں ہو سکتی الغرض کلام مجید میں صراحتہً وکنایۃً کسی جگہ یوسف کے حسن و جمال کا ذکر نہیں پایا جاتا، عورتوں کے ہاتھ کاٹ لینے سے یہ امر مستنبط ہو سکتا تھا سو اس کی بھی حقیقت ظاہر کر دی گئی میں یہ نہیں کہتا کہ یوسف کی خوبصورتی میں کوئی استحالۂ عقلی ہے ممکن ہے بہت جمیل رہے ہوں لیکن گفتگو صرف اتنی ہے کہ کلام مجید میں کہیں اس کا ذکر ہے یا نہیں؟۔

وہی یوسف، وہی افسانۂ حسن

(جناب سید فخر عالم فاضل فرنگی محلی۔ بھاگلپور)

نگار ماہ فروری ۳۳ء کے باب الاستفسار کے تحت جناب نے حسن یوسف کا غیر مصدق عن القرآن ہونا ثابت کیا ہے اور اپنے خیال کو تقویت پہونچانے کی غرض سے بہت جد و جہد کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ نے زیادہ غور و فکر سے کام نہیں لیا اگر آپ سورۂ یوسف پر غائر نظر ڈالتے تو آپ کو یوسف علیہ السلام کا غیر معمولی حسین ہونا معلوم ہو جاتا بہر کیف میں آپ ہی کی تحریر سے بتا دوں گا کہ حسن یوسف کا تذکرہ قرآن میں موجود ہے اور کہیں کہیں آپ کی تحریر کے علاوہ مفسرین کے اقوال اور احادیث سے بھی مدد لوں گا۔

سب سے پہلے آپ نے اخوان یوسف کے مکالمہ سے فائدہ اٹھانا چاہا ہے اور یہ تحریر فرمایا ہے کہ ان کے بھائیوں نے اپنے باپ کی محبت یوسف کی طرف زیادہ دیکھی تو بولے کہ ہمارا باپ یوسف اور اس کے بھائی کو زیادہ چاہتا ہے اگر حسن باعث محبت ہوتا تو ویسا تذکرہ کرتے لیکن اس کا تذکرہ نہیں کیا گیا جس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں "اذ قالوا لیوسف واخوہ احب الی ابینا منا ونحن عصبۃ ان ابانا لفی ضلال مبین" جب کہا ان سبھوں (اخوان یوسف) نے کہ ہمارا باپ یوسف اور اس کے بھائی کو زیادہ چاہتا ہے حالانکہ ہم لوگ عصبہ ہیں درحقیقت ہمارا باپ کھلی ہوئی گمراہی میں ہے۔ اس آیت میں وجہ زیادتی محبت تو کچھ بھی مذکور نہیں ہے تو کیا اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام میں کوئی خصوصیت و خوبی تھی ہی نہیں: پھر بغیر کسی خصوصیت و خوبی کے باپ کی غایت نظر شفقت ان دونوں بھائیوں پر کیوں تھی اور وہ کون سی شے ان دو ہستیوں میں پنہاں تھی جو ان سبھوں میں نہ تھی یقیناً وہ آئندہ ملنے والے مدارج تھے جو یعقوب علیہ السلام کو بذریعہ وحی معلوم ہو چکے تھے لیکن صرف یہی ایک باعث نہ تھا بلکہ جمال یوسفی بھی تھا جس کا ثبوت واقعۂ چاہ سے ملتا ہے یعنی اگر وجہ محبت صرف نبوت ہوتی تو اخوان یوسف کو دونوں بھائیوں کے قتل کی سازش کرنی چاہئے تھی کیونکہ حضرت ابن یامین دونوں نبوت کے لئے منتخب ہو چکے تھے لیکن قرآن سے صرف یوسف علیہ السلام کے قتل کی

سازش کا پتہ چلتا ہے۔ جیسا کہ ان کے بھائیوں میں نے آپس میں مشورہ کیا تھا کہ: اقتلوا یوسف او اطرحوہ ارضاً یخل لکم وجہ ابیکم وتکونوا من بعدہ قوماً صالحین: یوسف کو مار ڈالو یا پھینک دو کسی زمین پر تاکہ تمہارے باپ کی خاص توجہ تم لوگوں کی طرف ہو جائے اس کے بعد قوم صالح ہو جانا۔ کیا اس آیت سے بھی حضرت یوسف کا حسین تر ہونا ثابت نہیں ہوتا؟ حالانکہ بنیامین اور یوسف ایک ہی ماں کے پیٹ سے اور ایک ہی درجہ رکھنے والے تھے لیکن پھر بھی ان دونوں بھائیوں کے درمیان تقابل کرنے کے بعد جو چیز بنیامین سے یوسف کو بڑھا دیتی ہے وہ حسن ہی نظر آتا ہے اور آپ کا یہ کہنا کہ ان کے بھائیوں نے یوسف کے جمال کا ذکر نہیں کیا قابل افسوس ہے، سب سے پہلے آپ کو ان کے طرز تکلم کو ملاحظہ فرمانا چاہیئے تھا۔ بھلا جو شخص اپنے باپ کو گمراہ یا خطا دار کہے اور اس شخص کے نقائص کو دکھانے بیٹھے جس کی گود میں پل کر جوان ہوا ہے، کیا آپ اس کی زبانی سوتیلے بھائی کے محاسن سننے کے منتظر ہیں؟ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ؎

ہنر بچشم عداوت بزرگ تر عیبست

مکالمہ یا مشورت یوسف کے بعد آپ نے کاروان کی آمد کے واقعہ کو پیش کرتے ہوئے "یابشریٰ ہذا غلام"، سے اپنے قول پر استدلال قائم کرنا چاہا ہے لیکن آپ کو خبر نہیں کہ لفظ بشریٰ کے بعد یہ کہنے کی ضرورت

ہی باقی نہیں رہتی کہ یہ کیسا حسین و خوبصورت لڑکا ہے، حیرت و استعجاب کا اظہار اس وقت کیا جاتا ہے جبکہ انسان کوئی نئی چیز دیکھتا ہے، اگر اچھی اور خوبصورت شے نظر آگئی تو بے ساختہ انسان کہہ اٹھتا ہے" اہا" یہی حال وہاں بھی ہے کہ ان لوگوں نے ایک غیر معمولی حسین لڑکے کو دیکھا تو خوشی سے اچھل پڑے اور بولے "یا بشری ہذا غلام" اماں واہ کیا لڑکا ہے!! اور بشریٰ سے آدمی کا نام مراد لینا بر بنائے روایت صحیح غلط ہے۔ پھر آپ فرماتے ہیں کہ عزیز مصر جب حضرت یوسف علیہ السلام کو گھر لے کر آیا تو اس وقت بھی حسن کا ذکر نہیں کیا، سوال یہ ہے کہ جب یوسف علیہ السلام میں کوئی خاص بات نہ تھی تو پھر عزیز نے متبنٰی کیوں کیا اس وقت موجودہ اور فوری کشش جو یوسف علیہ السلام میں پائی جاتی تھی اور جسے عزیز مصر متبنٰی بنانے کے لئے طیار ہو گیا اور جس کو دیکھ کر عزیز کے دل کا کنول کھل گیا وہ آپ کا حسن ہی تھا اس لئے کوئی ضرورت نہ تھی کہ عزیز آپ کے حسن کا بھی تذکرہ کرتا کیونکہ حسن تو زلیخا کے سامنے موجود ہی تھا۔ پھر آگے چل کر "بلغ اشدہ آتینہ حکما وعلما" میں جمال یوسفی کی جستجو کرتے ہیں۔ حالانکہ یہاں تو خدا یہ کہہ رہا ہے کہ جب یوسف پر مصائب و آلام کی انتہا نہ رہی اور اس نے ایسی تکلیفوں میں بھی صبر کیا۔ یہاں تک کہ دور محن کی جوانی پوری ہو چکی یعنی ساری مصیبتیں ختم ہو گئیں اور آخر تک یوسف علیہ السلام نے خدا کو نہ بھلایا تو اب خدا صبر کے بدلہ میں علم و حکمت

عطا کرتا ہے چنانچہ آگے خود ہی فرماتا ہے "کذالک نجزی المحسنین" اسی طرح ہم نیکی کرنے والوں کو بدلہ دیا کرتے ہیں، اور یہ علم و حکمت کا عطیہ مصائب کے بعد ملتا ہے اور حسن تو خدا پہلے ہی دے چکا تھا اس وقت تو جدید عطیات عنایت ہو رہے ہیں قدیم عطیات کی یاد دہانی یا ذکر کی کیا ضرورت تھی

اگر میں آپ ہی کے قول کو صحیح مان لوں تو بھی مقصد حاصل ہے کیونکہ آپ نے ولما بلغ سے یوسف علیہ السلام کی جوانی مراد لی ہے اور تحریر فرمایا ہے کہ خدا فرماتا ہے کہ جب یوسف جوان ہوا تو ہم نے علم و حکمت سکھائی تو بندہ پرور ذرا غور فرمایئے کہ یہاں تو ان نعمتوں کا ذکر ہے جو عالم شباب میں خدا نے یوسف کو دی ہیں اور نعمت حسن تو قبل ہی ان کو دی جا چکی ہیں پھر جدید نعمتوں کے ساتھ قدیم عطیہ کی جستجو کیا معنی رکھتی ہے اگر حسن بھی جوانی کے بعد ملتا ہے تو یوسف علیہ السلام کو بھی ملتا لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے یعنی انسان حسین یا بدصورت ماں کے پیٹ ہی سے پیدا ہوتا ہے تو پھر یوسف علیہ السلام کیوں کر جوان ہونے کے بعد نعمت حسن سے معمور ہوتے اور جب یہ بات تصدیق شدہ ہے تو خدا کی خاموشی بھی اس موقع پر ذکر حسن سے عین دانائی پر مبنی ہے۔

لما بلغ کی تشریح کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ قرآن نے زلیخا کے تعشق یا لگاوٹ کا ذکر کرتے وقت بھی حسن یوسفی کی طرف اشارہ نہیں کیا میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ جیسا ادیب و افسانہ نگار یہاں بھی سپر ڈالے دیتا ہے حالانکہ

عورتوں کے عشق وتعشق کا دارومدار ہی حسن ظاہری پر ہے جس کی مزید توضیح کی یہاں گنجائش نہیں۔

مجھے پھر اظہار حیرت کی ضرورت پیش آگئی کیونکہ آپ عاشقوں کی جھرمٹ میں پہنچ کر اور حقیقت کا اقرار کرنے کے بعد پھر حسن سے انکار کرتے ہیں اور جناب نے غضب تو یہ کیا کہ پہلے قرآن سے استدلال کرنے کا دعویٰ کیا اور پھر مفسرین کے اس قول کی بھی آڑ پکڑی کہ چرچا کرنے والی عورتیں عزیز مصر کے ہاں کام کرنے والی یا آنے جانے والی تھیں۔ حالانکہ یہ آپ کے اصول کے خلاف ہے اگر آپ مفسرین کے اقوال سے بھی مسائل میں سند لینا چاہتے ہیں تو کوئی جھگڑا ہی باقی نہیں رہتا، اس لئے کہ سب سے زیادہ قرآن کو اگر کسی نے سمجھا ہے تو حضور اکرم صلعم ہیں اور آپ کا ارشاد حسن یوسفی کی تعریف میں موجود ہے یعنی جب حضرت عائشہ صدیقہ نے حسن یوسفی اور حسن نبوی کا موازنہ حضور سے چاہا تو آپ نے فرمایا کہ ہم میں اور یوسف میں ملاحت وصباحت کا فرق ہے۔ پھر حدیث کے ہوتے ہوئے حسن یوسفی سے کون انکار کرسکتا ہے۔ مزید تشریح کے لئے آنحضرت کی معراج[16] والی حدیث ملاحظہ فرمائیے: "قال مررت بیوسف علیہ السلام لیلۃ عرج بی الی السماء فقلت لجبریل علیہ السلام من ہذا فقال ہذا یوسف فقیل یا رسول اللہ کیف رایتہ قال کالقمر لیلۃ البدر نقلہ الرازی" جب حضور صلعم نے یوسف علیہ السلام کے متعلق ہلال بدر فرمایا تو پھر حسن یوسفی میں ہمانا کو شک کی کب

گنجائش ہے۔ خیر یہ تو الفاظ معترضہ تھے۔ اب آپ مکر کو ملاحظہ فرمائیے۔ آپ مکر سے دو مطلب مراد لیتے ہیں اول شہری عورتوں نے زلیخا کی محبت کا چرچا کیا تو زلیخا نے ان کے مکر کو سمجھ کر دعوت دی۔ دوم شہری عورتوں میں اور زلیخا میں یوسف کو رام کرنے کے لئے کوئی حیلہ طے ہو گیا تو عرض یہ ہے کہ ان عورتوں کا محبت کرنا یا زلیخا سے مشورت کے بعد یوسف کو قابو میں لانے کے لئے ہاتھ کاٹ لینا قابل غور ہے۔ گرچہ میں اس کو ہرگز تسلیم نہیں کر سکتا کہ زلیخا اور دوسری محبت کرنے والی عورتوں نے مل کر یوسف کو رام کرنے کی ترکیب کی ہو اس لئے کہ رقابت اس کی ہرگز مقتضی نہیں ہو سکتی ہے اور خاص کر عورتوں کی رقابت کہ اپنے معشوق کو اپنی طرف راغب کرنے کیلئے مجموعی قوت صرف کریں کیونکہ یہ بالکل خلاف فطرت ہے

اب رہی پہلی بات یعنی زلیخا کے ماسوا دوسری عورتوں نے جذبہ محبت سے مجبور ہو کر دیدار یوسفی کے لئے طعنہ زنی کا بہانہ نکالا تو دیکھنا یہ ہے کہ کیا مصر میں کوئی مرد ایسا نہ تھا جس پر یہ عورتیں اپنا دام فریب بچھاتیں۔ صرف یوسف علیہ السلام میں وہ کون سی ایسی خصوصیت تھی کہ وہ عورتیں سارے مصر کے مردوں کو چھوڑ کر یوسف علیہ السلام پہ جان دینے لگیں یقیناً آپ کا غیر معمولی حسن تھا جو اور مردوں میں نہ تھا پس کیا آپ یہ کہنے کو تیار نہیں کہ قرآن سے اشارتاً و کنایتہً بھی حسن یوسفی کا پتہ نہیں چلتا۔ دوسرے غلط راستہ سے کافی ثبوت یوسف علیہ السلام کے غیر معمولی حسین ہونے کا ملتا ہے

اس لئے کہ حرف فا کا استعمال کلام عرب میں تعقیب کے لئے آتا ہے
یعنی تراخی بلا مہلت جس سے ثابت ہو گیا کہ ان کی عورتوں نے دیکھتے ہی
ہی فوراً عالم بے خودی میں اپنے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے اور بول اٹھیں
ما ان ہذا الا ملک کریم یہ انسان نہیں فرشتہ ہے اور حسن حور و پری اور
فرشتہ عوام میں مشہور ہے اور فلما رأینہ یعنی جوں ہی ان پر نظر پڑی قطعن ایدیہن
ان عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے اب آپ کا یہ کہنا کہ یوسف علیہ السلام
کو ڈرانے دھمکانے اور فریب میں لانے کے لئے اپنا ہاتھ کاٹ ڈالا
ہرگز صحیح نہیں جیسا میں اوپر لکھ آیا ہوں کہ حرف فا اپنی حقیقت موضوع لہ
کی بنا پر بغیر بات کئے ہوئے اور ٹھہرے ہوئے ان عورتوں نے پہلی
ملاقات میں اپنا اپنا ہاتھ کاٹ ڈالا تو پھر باعث قطع ید معصومیت و تقدس
قرار دینا سخت غلطی ہے اور تقدس ہی مراد لیتے ہیں تو مجھے بتا دیں کہ آج
تک کسی نے کسی کے تقدس پر جان دی ہو یا کم از کم ہاتھ ہی کاٹ ڈالا ہو۔
یقیناً ادب و تاریخ کے اوراق آپ کے اقوال تغلیط کرنے کے لئے کافی
ہیں۔ ہاں اس واقعہ کے بعد وہ عورتیں آپ کے تقدس کی قائل ہو گئیں
جس کا ثبوت آگے کے واقعہ سے بھی ملتا ہے اور یہ تو عقل سے لگتی بات
ہے کہ یوسف علیہ السلام نے ان عورتوں کے عشق و فریفتگی کو ملاحظہ کیا لیکن
ان کا دل نہ پسیجا تو زلیخا نے مجبور ہو کر اپنی ذاتی رائے سے یا ان عورتوں
کے مشورہ سے یوسف کو قید کروا دیا کہ شاید قید کی پابندیوں سے

عاجز آکر میری طرف راغب ہو جائیں لیکن آپ نے ایسا نہ کیا یہاں تک کہ عزیز مصر نے ان کے علم تعبیر رویا کا حال معلوم کر کے ان کو قید خانہ سے بلا بھیجا تو انھوں نے اپنے تقدس وحیا وصداقت کی شہادت انھیں عورتوں سے چاہی جو ان پر فریب کا جال بچھانے کو تیار تھیں اور جب ان عورتوں سے عزیز مصر نے پوچھا تو انھوں نے صاف لفظوں میں کہدیا کہ ہم نے یوسف میں کوئی لغزش نہیں پائی وہ نہایت صالح و نیک مرد ہیں۔ عزیز کو اسی قدر تحقیق کی ضرورت تھی اور اسی قدر عزیز نے سوال بھی کیا تھا اور اسی کی شہادت یوسف نے بھی دینی چاہی تھی نہ کہ اپنے حسن کی شہادت۔

جب مسلمہ امر ہے کہ نہ تو یوسف علیہ السلام نے حسن جتانا چاہا اور نہ عزیز مصر نے ان کے حسن کو پوچھا تو پھر وہ عورتیں سوال سے غیر متعلق جواب کیوں دیتیں اور یہاں پر تو حسن کے اظہار کی تو کوئی ضرورت ہی نہیں کیونکہ جب آفتاب ہماری آنکھوں کے سامنے چمک رہا ہے تو پھر کسی سے سوال کرنا کہ آفتاب میں چمک ہے یا نہیں؟ کس قدر حماقت و بیوقوفی کا سوال ہوگا؟ لہذا آپ کا یہاں پر جمال یوسفی کی تلاش کرنا مہمل سا معلوم ہوتا ہے۔

اس مختصر تشریح کے بعد غالبا آپ مان گئے ہوں گے کہ قرآن میں کنایتہً اور استعارۃً حسن یوسفی کا تذکرہ موجود ہے اور یہی معجزہ

طرز ادا قرآن کا ہے جس نے ادبا عرب کی زبانیں بند کر دی تھیں اگر استعارہ وکنایہ سے ادا مقصد مخل فصاحت ہوتا تو سرکار کے حسن ظاہری کو بھی خدا صاف لفظوں میں قرآن میں ذکر کرتا لیکن بخلاف اس کے ہر جگہ اپنے حسن وجمال کو استعارہ وکنایہ میں ذکر کیا ہے۔

(جناب مولوی غلام ربانی صاحب عزیز کیمبل پور)

میں اس مضمون پر قلم اٹھاتا تو ہوں لیکن آپ کا یہ فقرہ کہ "حسن یوسف کا بے نقاب کرنے والا دنیائے شعر وادب کی بڑی خدمت انجام دے گا" دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے، اور گو اس وقت میں اتنا عدیم الفرصت ہوں کہ بعض اوقات بڑے بڑے ضروری خطوط کے جواب میں ہفتوں گزر جاتے ہیں اور وقت نہیں ملتا لیکن یہ بحث ہی ایسی چھڑ گئی ہے کہ سمند قلم بے لگام ہوا جاتا ہے اور پھر یہ بھی کچھ کم قابل فخر نہیں اگر میں اس طرح دنیائے شعر وادب کی کوئی خدمت انجام دے سکوں۔

میرا خیال ہے کہ آپ کو اس میں کوئی عذر نہیں ہوگا۔ اگر مکر کے معنی سازش کے لئے جائیں اس لئے لما سمعت بمکرہن کے معنی یہ ہوں گے کہ جب زلیخا کو ان کی سازش کا جس کا آیت ماقبل الذکر میں ذکر ہو چکا ہے علم ہوا تو وہ بہت تہ وبالا ہوئی، اور اس نے انھیں ان کی

غلطی کے احساس اور اپنی مجبوری کے اظہار کے لئے دعوت کا انتظام کیا جب انھوں نے یوسف کو دیکھا تو اس کو بڑا جانا اور اپنے ہاتھ کاٹ لئے مجھے یہاں آپ سے چند باتوں سے اختلاف ہے۔

(۱) کسی شخص کے عشق و محبت کا افسانہ بیان کرتے ہوئے اپنی رائے کا ان الفاظ میں اظہار کرنا کہ ہمارے یہاں اپنے غلام سے عشق کرنا سراسر گمراہی ہے اور زلیخا شدید ترین غلطی کا ارتکاب کر رہی ہے۔ عزیز مصر کی بیوی کے برخلاف خطرناک سازش ہے جس سے اس کے اخلاق اور چال چلن پر ناقابل معافی الزام اور دھبہ لگتا ہے۔

(۲) اور پھر قلمارا آینہ میں لفظ رویت سے صاف ظاہر ہے کہ ان عورتوں نے یوسف کو پہلی بار دیکھا تھا۔ ورنہ لفظ رویت کی تقدیم بیکار ہے بلکہ کوئی ایسا لفظ لگایا جاتا جو موقع کے مطابق ہوتا۔

(۳) مزید براں اکبر کا لفظ نہایت بلند آہنگی سے ان جذبات کی ترجمانی کر رہا ہے جو یوسف کے دیکھنے سے ان عورتوں کے دل و دماغ پر طاری ہوئے۔ اور ظاہر ہے کہ ایسا لفظ تعجب اور حیرت کے موقع پر ہی بولا جاتا ہے۔ اب صرف قابل دریافت یہ امر ہے کہ وہ کون سی چیز تھی کہ جس سے وہ محو حیرت ہو گئیں۔

غالباً آپ اس امر میں مجھ سے متفق ہوں گے کہ ہم فقط دیکھنے سے کسی شخص کے اخلاق اور چال چلن کے متعلق صحیح کیا غلط اندازہ بھی نہیں

لگا سکتے کیونکہ اخلاق کو جانچنے کے لئے کوئی اور معیار درکار ہے اور پھر نہ کسی شخص کے حسن اخلاق سے ہم ایسے سخت متاثر ہو سکتے ہیں کہ ہماری زبان سے اللہ اکبر کا جملہ تڑپ کر نکل جائے پس ظاہر ہے کہ اس قدر مبہوت کن حیران ساز اور آئینہ بنانے والا صرف حسن کا جادو ہی ہو سکتا ہے ورنہ اخلاق میں یہ کہربائی طاقت کہاں ہے۔ آپ نے یہ جملے اپنی طرف سے زائد کر لئے ہیں کہ یوسف ڈرانے دھمکانے پر قابو میں نہ آئے اور انھوں نے ہاتھ بھی کاٹ لئے تب بھی وہ نہ پھسلے اور انھیں ان کے تقدس پر تعجب ہوا۔

قرآن کریم کے الفاظ کی بندش صاف ظاہر کر رہی ہے کہ وہ اس قدر دیکھنے کی تحمل نہیں ہو سکتے کہ انھوں نے رکاوٹ کی اور جب قابو نہ چلا تو ہاتھ کاٹ ڈالے۔

ہاں آپ کا یہ اعتراض بجا ہے کہ یوسف کے حسن کے لئے "ملک کریم" کا لفظ غیر موزوں ہے لیکن میں عرض کرتا ہوں کہ اگر مرحوم آزاد کا یہ خیال درست ہے کہ بچپن کے خیالات تمام دنیا کے تقریباً ایک جیسے ہیں تو پھر یہ مشکل بھی رفع ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں اگر عورتوں کے حسن و جمال کی تعریف کی جائے تو انھیں پریوں سے اور بچوں یا نوجوانوں کے جمال کی تعریف کی جائے تو فرشتوں سے تشبیہ دیتے ہیں اور پھر اگر یہ تاویل آپ کو نہ بھائے تو اس کی ایک اور توجیہہ بھی نہایت موزوں اور مناسب کی جا سکتی ہے۔ یہ قاعدہ ہے کہ عشق میں تمازدگی ہر دو پہلوؤں

کا گوازن رسوائی اور بدنامی میں قائم رکھا جاتا ہے ؎

میری رسوائی پر ان کو خوش نہ ہونا چاہیئے
قیس رسوا تھا تو کیا لیلےٰ کی رسوائی نہ تھی

زلیخا کی رسوائی کے ضمن میں یوسف کی جو رسوائی ہوئی تھی وہ بھی عورتوں کی اسی جماعت کی شرمندۂ احسان تھی جب وہ یوسف کے جمال سے اس قدر حیرت زدہ ہوئیں کہ اللہ اکبر ان کی زبان سے نکل گیا تو انھوں نے جھٹ اس الزام کی تردید بھی کر دی جو بالواسطہ یوسف پر لگایا گیا تھا۔ یہاں بیشک آپ سوال کر سکتے ہیں کہ وہ اس قدر جلدی کیونکر یوسف کی خوبی اخلاق سے متاثر ہو گئیں حالانکہ یوسف کو وہاں آئے ہوئے ایک منٹ بھی نہیں گذرا تھا۔ میرے اس جواب کا تعلق نفسیات سے ہے یہ قاعدہ ہے کہ جب ہم کسی شخص کے حسن و جمال یا رعب جلال سے یوں فوری طور پر متاثر ہو جائیں تو ہمارے دل میں فوراً اس کی خیر خواہی اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں اور ہم بالکل گوارا نہیں کر سکتے کہ اس شخص کے متعلق کسی قسم کے مضر خیال کی اشاعت ہو، زنان مصر کے دل میں بھی یوسف کے متعلق اس وقت وہی جذبہ کارفرما تھا جب انھوں نے اس غیرت ناہید کو دیکھا، ان کے دلوں نے انھیں ملامت کی اور بے اختیار ان کی زبان سے نکل گیا، حاشا للہ ما ہذا بشرا۔ مجھے اس پر بھی حیرت ہے کہ آپ زنان مصر کو زلیخا کے ساتھ شریک جرم قرار دے کر بھی یوسف کے جمال کی تاثیر سے

منگ ہیں ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ یہ عورتیں خواہ یہ کوئی ہوں اور کتنی ہوں ساری کی ساری زلیخا کے ساتھ شریکِ عشق ہیں۔ اگر وہ معمولی حسن و جمال کا مالک تھا تو ان واقعات کو عامتہ الوقوع ہونا چاہیے تھا۔ کیا وجہ ہے کہ ہماری زندگیاں ان رنگینیوں سے خالی نظر آتی ہیں اور حسرتِ جلوۂ لب بام سے مرے جا رہے ہیں۔ اے لبا آرزو کہ خاک شدہ میرا خیال ہے کہ یہ عورتیں میں جمع کی ضمیر نے بھی آپ کی کافی امداد کی ہے۔

یہ قدرتی امر ہے کہ جب یوسف کو زلیخا نے اس مجمع میں بلایا تو یہ تو نہیں ہو سکتا کہ وہ زنانِ مصر بہار خزاں دیدہ ہوں گی بلکہ عام سمجھ کی بات ہے کہ ایسی محفلوں میں وہی نظارہ سوز ہوتی ہیں جو دولتِ حسن کی مالک ہوں۔ یوسف کا ایسے مجمع میں بلانے سے زلیخا کا مطلب خواہ کچھ کیوں نہ ہو لیکن یوسف نے یہی سمجھا ہوگا کہ اس کم بخت نے پھانسنے کے لئے یہ گلدستہ ہائے رنگا رنگ جمع کئے ہیں اور گو زنانِ مصر اول تک یہ خیال نہ کر رہی تھیں لیکن یوسف کے آنے نے سارا نقشہ بدل دیا اور نگاہوں نے غمازیاں کیں۔

چنانچہ یہی خیال ان کے دل میں رہا اور آخر اس نے بادشاہ سے کہہ دیا کہ ما بال النسوۃ اللاتی قطعن ایدیہن۔ علاوہ ازیں زنان مصر کا یہ جلسہ رسوائے عالم نہ ہوا ہوگا اور کیا عوام اس سلسلہ میں یوسف سے بھی بدظن نہ ہوئے ہوں گے اور پھر اس کی قید نے اس کی تائید

نہ کردی ہوگی یہ وہ جوابات تھے جن کے ماتحت یوسف کو اپنی برأت کے لئے ان عورتوں کا ذکر کرنا پڑا۔

"حسن یوسف" کے متعلق میرے اظہار خیال پر آخر کار بعض حسن پرست طبیعتیں بے چین ہو ہی گئیں اور ان کو گوارا نہ ہوا کہ "مذہبی جمالیات" پر کسی قسم کی تنقید کی جائے میرے مضمون کے رد میں متعدد تحریریں موصول ہوئیں جن میں صرف دو درج کی جاتی ہیں باقی تحریریں چونکہ ان سے بھی زیادہ حسن استدلال رکھتی ہیں اور جن میں "نسائیت" کے صرف اس حربہ سے کام لیا گیا تھا جسے گالی کوسنا کہتے ہیں اور جس کے سامنے ایک مرد کو سپر ڈال دینا ہی پڑتی ہے اس لئے ان کو درج کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا مجھے افسوس ہے اور تھوڑی سی حیرت بھی کہ نہ فاضل فرنگی محلی نے میرے مقالہ کو غور سے پڑھا اور نہ مولوی غلام ربانی صاحب نے ——— میں نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ حضرت یوسف حسین نہیں ہو سکتے تھے یا یہ کہ ان کے حسین ہونے میں کوئی استحالہ عقلی ہے بلکہ مدعا صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ کلام مجید سے ان کا ایسا جمیل ہونا کہ اسے "عطایائے نبوت" یا "معجزات خداوندی" میں شمار کیا جائے کسی طرح ثابت نہیں ہوتا۔ پھر جس رسوخ کے ساتھ اس سے قبل میں اس خیال پر قائم تھا اسی طرح اب بھی ہوں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دونوں حضرات کی تاویلیں کیونکر اس صداقت کو محو کر سکتی ہیں جو یقیناً "حسن یوسف" کے افسانہ سے زیادہ حقیقت رکھتی ہے۔

میں جواب کے دو پہلو اپنے پاس رکھتا ہوں ایک تو یہ کہ ان حضرات نے

جو تاویلیں کلام مجید سے حسن یوسف کے ثابت کرنے کے لئے اختراع کی ہیں ان کی حقیقت کو واضح کردوں اور دوسرے یہ کہ ان سب کو نظرانداز کرکے ایک اصولی بحث کے ذریعہ سے یہ بتادوں کہ حضرت یوسف کے جمال کو معجزہ قرار دینا عقلاً محال ہے اور عملاً عبث و بیکار۔ میں اس بحث پر زیادہ صفحات لینا مناسب نہیں سمجھتا لیکن چونکہ اس کے بعد مجھے اس موضوع پر کچھ لکھنا بھی نہیں ہے اس لئے میں کوشش کروں گا کہ جو کچھ مجھے کہنا ہے مختصراً اسی اشاعت میں عرض کردوں اور بحث کے دونوں پہلوؤں کو پیش کرکے ہمیشہ کے لئے خاموش ہوجاؤں پہلے میں اپنے حریفوں کے جواب پر تبصرہ کرتا ہوں۔

فاضل فرنگی محلی فرماتے ہیں کہ برادران یوسف جانتے تھے کہ یعقوب علیہ السلام یوسف اور بنیامین سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ اور یعقوب کی یہ محبت اس بنا پر تھی کہ وہ ذریعہ وحی معلوم کرچکے تھے کہ یہ دونوں بھائی نبوت کے لئے منتخب ہوچکے تھے پھر چونکہ برادران یوسف اس محبت کی بنا پر دونوں بھائیوں سے جلتے تھے اس لئے چاہیئے تھا کہ وہ دونوں کو ہلاک کرتے لیکن انھوں نے صرف یوسف کو کنوئیں میں ڈالا کیونکہ وہ بہت جمیل تھے۔

اس کا جواب بہت مختصر ہے اور وہ یہ کہ جب یعقوب کی محبت یوسف اور بنیامین سے اس بنا پر تھی کہ وہ ان کے آئندہ مدارج سے ذریعہ وحی آگاہ ہوگئے تھے جیسا کہ خود فاضل فرنگی محلی نے ارشاد فرمایا ہے تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ یعقوب کو سے زیادہ محبت یوسف ہی سے ہوگی کیونکہ نبوت تو یوسف ہی کی قسمت میں لکھی تھی۔

نہ کہ بنیامین کے لیے (فاضل فرنگی محلی نے بنیامین کو بھی پیغمبر بتایا ہے مجھے نہیں معلوم کہ وہ کس قوم کے لئے مبعوث ہوئے تھے) اگر بنیامین کو بھی تھوڑی دیر کے لئے نبی مان لیا لیا جائے تو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ یوسف کے مرتبہ کے نبی نہ تھے اور اس لئے یقیناً یعقوب یوسف ہی سے زیادہ محبت کرتے ہوں گے اور اسی بنا پر برادران یوسف نے یوسف ہی کو ہلاک کرنا چاہا۔ حسن وجمال کو وجہ قرار دینا ایک ایسی تاویل ہے جس کی تردید خود فاضل فرنگی محلی کے قول سے ہوتی ہے۔

دوسرا استدلال یہ پیش کیا گیا ہے کہ قافلہ والوں کا یوسف کو کنویں میں دیکھ کر "یا بشریٰ" کہنا ہی ثابت کرتا ہے کہ آپ بہت خوبصورت تھے "یا بشریٰ" کے بعد بیان حسن وجمال کی ضرورت نہیں رہتی۔

میں یہ کسی طرح ماننے کے لئے تیار نہیں کہ "یا بشریٰ" کا لفظ اس قدر حاوی و جامع ہے کہ اس کے ساتھ بیان حسن وجمال کی ضرورت نہیں رہتی۔ لفظ بشریٰ کے معنی صرف بشارت اور خوش خبری کے ہیں اور کلام مجید میں جہاں کہیں یہ لفظ مستعمل ہوا ہے اسی معنی میں ہوا ہے کہیں بھی حسن وجمال کا مفہوم شامل نہیں ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ خاص اس موقع پر یہ معنی متبادر ہیں تو اس کے لئے پہلے حسن وجمال کو ثابت کرنا چاہئے تھا نہ کہ اسی کے ذریعہ سے اس کو ثابت کرنا۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ اس زمانہ میں چونکہ لونڈی غلام کے خرید و فروخت کا رواج کثرت سے تھا اور یہ قافلہ بھی یہی کاروبار کرتا تھا اس لئے جب ایک آدمی نے کنویں کے اندر ڈول ڈالا تو دیکھا کہ اندر ایک لڑکا پڑا ہوا ہے اور اس نے اسی وقت اہل قافلہ کو پکار کر کہا کہ مبارک ہو کنویں کے اندر ایک

لڑکا بھی مل گیا"یعنی ایک مال اور ہاتھ آیا جیسا کہ آگے کی آیت سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ" واسروہ بضاعۃ" (یعنی اس کو بھی مال تجارت سمجھ کر چھپا لیا) ڈول ڈالنے کے ساتھ ہی اس کا یہ کہنا صاف طور پر ظاہر کرتا ہے کہ اس کا مبارک باد دینا صرف اسی بنا پر تھا ورنہ کنویں کے اندر پہلی نگاہ میں وہ حسن یوسفی کی حقیقت کیا معلوم کر سکتا تھا۔ اگر یوسف واقعی غیر معمولی جمیل ہوتے تو صرف "اسروہ بضاعۃ" نہ کہا جاتا بلکہ اسی کے ساتھ ایسے الفاظ بھی ضرور ہوتے جن سے یہ خصوصیت ظاہر ہوتی۔ اس امر کا ثبوت کہ حضرت یوسف غیر معمولی جمیل نہ تھے بعد کی اس آیت سے بھی ملتا ہے" وشروہ بثمن بخس دراہم معدودۃ" یعنی اہل قافلہ نے یوسف کو نہایت کم قیمت پر چند درہموں کے عوض فروخت کر دیا۔ اگر یوسف غیر معمولی حسین ہوتے تو ظاہر ہے کہ اہل قافلہ جو یہی کاروبار کرتے تھے کبھی ایسے "بدلیۂ حسن و جمال" کو اس قدر ارزاں نہ دیدیتے۔

فاضل فرنگی محلی نے "لما بلغ اشدہ آتینہ حکما و علما" کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے اشد کے معنی انتہائی مصائب کے لئے ہیں۔ معلوم نہیں مجھے اس اختراع پر فرنگی محل کے نصاب تعلیم کو مبارکباد دینا چاہیئے یا جناب فخر عالم صاحب کی قوت فکر کو سراہنا چاہیئے اگر وہ اشد کی ضمیر پر غور کر کے اس کا مرجع تلاش کرنے کی زحمت گوارا کرتے تو انھیں خود معلوم ہو جاتا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ خیر اسی سلسلہ میں وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ "اس آیت میں خدا نے علم و حکمت کے ساتھ ساتھ عطائے جمال کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ وہ تو خدا ان کو پہلے ہی دے چکا تھا" حالانکہ اگر میں ان سے پوچھ بیٹھوں کہ کلام مجید کی کس آیت سے وہ اس بات کو ثابت کر سکتے ہیں تو ان کے پاس سوائے سکوت کے کوئی جواب

نہیں ہو سکتا۔ اگر اس کی صراحت کسی جگہ ہوتی تو پھر نزاع ہی کیا تھا۔ ایک ایسی شے کو دلیل میں پیش کرنا جو خود معرض بحث میں ہے طرفہ طرز استدلال ہے۔

اس کے بعد وہ اصل گفتگو آتی ہے جس پر جمال یوسفی کے تصدیق کا انحصار ہے یعنی زلیخا کا فریفتہ ہو جانا اور عورتوں کا آپ کو دیکھ کر بجائے پھلوں کے ہاتھ کاٹ لینا۔ چونکہ اس باب میں اپنے خیالات پہلے ظاہر کر چکا ہوں اس لئے اس کی تکرار مناسب نہیں معلوم ہوتی آج میں بحث کا دوسرا پہلو اختیار کروں گا۔

اس سلسلہ میں جو باتیں جمال یوسفی کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں ان میں سے اہم ترین یہ ہیں:۔

(۱) زلیخا حضرت یوسف پر عاشق ہوئی اور بقول فاضل فرنگی محلی "عورتوں کے عشق کا مدار ہی حسن ظاہری پر ہے"

(۲) بعض زنانِ مصر کا یوسف کو دیکھ کر بجائے پھلوں کے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالنا ظاہر کرتا ہے کہ وہ ان کے حسن سے مسحور ہو گئیں۔

امر اول کے متعلق مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ محبت کا سبب صرف حسن ظاہری کو قرار دینا اس لحاظ سے تو درست ہے کہ چاہنے والے کی نگاہ میں محبوب خواہ وہ کیسا ہی ہو جمیل معلوم ہوتا ہے لیکن یہ کلیہ کہ الفت کا سبب ہمیشہ حسن ہی ہوا کرتا ہے، بالکل غلط ہے، دنیا میں ہزاروں واقعات ایسے پیش کئے جا سکتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض نہایت جمیل عورتوں نے ایسے مردوں سے محبت کی ہے جو نہ صرف یہ کہ حسین نہ تھے بلکہ قبیح بدشکل تھے۔

امر دوم کے متعلق یہ دیکھنا ہے کہ زنان مصر نے یوسف کو دعوت سے قبل دیکھا تھا یا نہیں اگر دیکھا تھا تو اس وقت بھی کیوں ان سے ایسی ہی کوئی حرکت سحوری کی سرزد نہیں ہوئی اور اگر انھوں نے دعوت ہی کے موقع پر اول اول دیکھا تھا تو کیا سبب ہے کہ ان پر تو یہ اثر ہوا اور زلیخا پر جو حقیقتاً نہایت شغف رکھتی تھی نہ دعوت کے وقت نہ اس سے قبل کوئی اثر اس قسم کا ہوا۔ کم از کم ایک بار اگر زلیخا بیہوش ہوجاتی تو بھی کہا جاتا کہ وہ تو یوسف کا حسن ہی ایسا تھا۔

اگر یوسف کا حسن اعجاز کی حد تک پہونچا ہوا تھا اور موسیٰ کے ید بیضا کی طرح وہ بھی ایک معجزہ تھا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ معجزہ آپ کو اس وقت کے تمام اہل عالم کے مقابلہ میں دیا گیا تھا یا صرف مصر والوں کے مقابلہ میں ظاہر ہے کہ تمام اہل عالم کیلئے نہ تھا کیونکہ حسن و جمال کا معیار بالکل مختلف ہے اور ہر قوم و ملک معیار جدا ہوتا ہے اس لئے لامحالہ یہی ماننا پڑے گا کہ مصر والوں کے لئے معجزہ تھا لیکن اس کی ضرورت اس وقت ہوتی جب اہل مصر کو اپنے حسن پر ناز ہوتا حالانکہ یہ نہ تاریخ سے ثابت ہے نہ قرآن سے۔ اسی کے ساتھ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ حسن یوسفی کے معجزہ سے کیا نتیجہ برآمد ہوا اور اس نے اصلاح قوم کی کیا خدمت انجام دی اور اگر اس معجزہ سے مقصود اصلاح اخلاق نہ تھا بلکہ ایک کامل و سحور کن نمونۂ جمال پیش کرنا تھا تو چاہئے تھا کہ جو شخص آپ کو دیکھتا فریفتہ ہوجاتا۔ حالانکہ یہ بالکل خلاف واقعہ ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ آپ کا حسن کوئی معجزہ نہ تھا تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے غیر معجز حسن کے ہوتے ہوئے، تمام اسوۂ یوسفی کو چھوڑ کر صرف اسی کا افسانہ کیوں بار بار

دہرایا جاتا ہے اور کیوں ایسی غیر مہتم بالشان چیز کا ذکر قرآن پاک میں پایا جاتا ہے۔

فاضل فرنگی محلی نے سلسلۂ گفتگو میں دو حدیثوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ میرا موضوع چونکہ احادیث سے بحث کرنا نہیں ہے اس لئے میں اس وقت بھی احتراز کرتا ہوں۔ تاہم یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جس وقت ان احادیث کی حقیقت پر بحث کی جائے گی تو ان سے وہی نتیجہ نکلے گا جو کلام مجید کے آیات پر غور کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔

میرے نزدیک وہ حدیث جس میں رسول اللہ نے اپنے اور یوسف کے حسن کا فرق بتایا ہے ساقط الاعتبار ہے اسی طرح وہ حدیث جس میں بتایا گیا ہے شب معراج میں آپ نے یوسف کو "کالقمر لیلۃ البدر" دیکھا بہت کچھ محل نظر ہے۔

مولوی غلام ربانی صاحب عزیز نے چونکہ اپنے مضمون میں زیادہ تر شاعری سے کام لیا ہے اور شاعری بھی وہ جس کو میں پورے طور پر نہیں سمجھ سکا اس لئے جواب دینے سے معذور ہوں تاہم مجھے یقین ہے کہ ان کی ایرادات کا بھی جواب اس میں آگیا ہوگا۔

فاضل فرنگی محلی نے ایک غلطی اور کی ہے اس کو بھی دور کر دینا مناسب سمجھتا ہوں اور وہ یہ کہ انھوں نے عزیز مصر کو جس نے یوسف کو متبنیٰ کیا تھا اور شاہ مصر کو جس نے یوسف کو قید خانہ سے طلب کیا تھا ایک ہی ہستی قرار دیا ہے حالانکہ عزیز مصر اور تھا اور شاہ مصر اور، مصر کے بادشاہ کا لقب عزیز نہ تھا بلکہ فرعون، چنانچہ اس وقت مصر کا فرعون یا بادشاہ ریان بن ولید بن دومع تھا اور جس شخص نے یوسف کو خرید کر کے متبنیٰ کیا اس کا نام اطفیر یا پوطفیر تھا جسے (POTIPHOR) کہتے ہیں اور عزیز مصر کے لقب سے مشہور تھا۔ (ملاحظہ ہو ابن خلدون، تاریخ کامل وغیرہ)

قارون اور اس کی دولت

(سید علی احمد صاحب زبیری جلگانوی)

جس طرح یوسفؑ کا حسن ضرب المثل ہے، اسی طرح قارون کی دولت بھی بہت مشہور ہے کہا جاتا ہے کہ اس کے خزانہ کی کنجیاں خدا جانے کتنے گدھوں پر لادی جاتی تھیں یہ بھی مشہور ہے کہ وہ حضرت موسیٰ کی بددعا سے مع اپنے تمام خزانے کے زمین میں دھنس گیا اور برابر قیامت تک دھنستا چلا جائے گا۔ جس طرح آپ نے حسن یوسفی کی حقیقت کو آشکارا کیا ہے اسی طرح براہِ کرم قارون کے متعلق بھی کچھ لکھئے۔

قارون کا قصہ ابن خلدون نے تو لکھا نہیں لیکن ابن اثیر جزری نے مختلف روایات کو ملا کر جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:۔ قارون بن یصہر بن قاہث حضرت موسیٰ کا عم زاد بھائی تھا اور اس قدر دولتمند تھا کہ اس کے خزانوں کی کنجیاں چالیس خچروں پر بار ہوتی تھیں، نشۂ دولت سے سرشار ہو کر جب اس نے لوگوں کو ستانا شروع کیا تو اس کو لوگوں نے سمجھایا لیکن اس نے کچھ پروا نہ کی اور کہا کہ اگر خدا مجھ سے راضی نہ ہوتا تو اتنی دولت کیوں دیتا۔ جب موسیٰ نے اس کو زکوٰۃ دینے کا حکم دیا تو اس نے بنی اسرائیل کو جمع کر کے کہا کہ اب موسیٰ تم لوگوں کے مال پر ہاتھ صاف کرنا چاہتا ہے اس لئے کوئی تدبیر ان کو زک دینے کی کرنی چاہیے" اور آخر کار ایک عورت اس

امر پر راضی کی گئی کہ وہ موسیٰ پر زنا کی تہمت رکھے لیکن جب یہ تدبیر کارگر نہ ہوئی اور موسیٰ کو سارا حال معلوم ہوا تو انھوں نے بد دعا کی اور وہ زمین میں دھنس گیا اور اب بھی برابر دھنستا چلا جا رہا ہے۔

اس قصہ میں غور طلب امر صرف دو ہیں ایک یہ کہ خزانہ کی کنجیاں چالیس خچروں پر بار ہوتی تھیں اور دوسرے یہ کہ وہ زمین میں دھنس گیا اور دھنستا چلا جا رہا ہے۔ قرآن پاک میں قارون کا ذکر تین جگہ آیا ہے۔ سورۃ المومن میں، سورۃ العنکبوت اور سورۃ القصص میں، سورۃ المومن میں صرف اس قدر ذکر ہے۔

ولقد ارسلنا موسیٰ بآیاتنا وسلطان مبین۔ الیٰ فرعون وہامان وقارون فقالوا سٰحر کذاب۔

تحقیق بھیجا ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں اور کھلی ہوئی سند لیکر فرعون، ہامان اور قارون کی طرف اور انھوں نے اس کو جھوٹا جادوگر کہہ کر پکارا۔

اس آیت سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ کی تکذیب کرنے والوں میں فرعون وہامان کی طرح قارون بھی بہت اہم اور قابل ذکر ہستی تھا۔

سورۃ العنکبوت میں قارون کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

وقارون وفرعون وہامان ولقد جاءہم موسیٰ بالبینات فاستکبروا فی الارض وما کانوا سابقین، فکلا اخذنا بذنبہ فمنہم من ارسلنا علیہ حاصبا ومنہم من اخذتہ الصیحۃ ومنہم من خسفنا بہ الارض ومنہم من

(اور ہم نے تباہ کیا) قارون، فرعون اور ہامان کو اور تحقیق موسیٰ نشانیاں لے کر آئے لیکن انھوں نے زمین میں غرور کیا اور ہم سے بازی نہ لے گئے پس ہم نے ہر ایک کے گناہ کا مواخذہ کیا پھر انھیں میں سے ایک پر طوفان بھیجا، کسی کو زلزلہ

اغرقنا وکان اللہ لیظلمہم ولاکن کانوا انفسہم یظلمون

نے پکڑا، کوئی زمین میں دھنس گیا اور کسی کو ہم نے غرق کیا۔

اس سورۃ میں بھی قارون کا ذکر فرعون وہامان کے ساتھ آیا لیکن یہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قارون کی ہلاکت کا ذریعہ کیا ہوا۔ زمین میں دھنس جانے کا ذکر قارون ہی کی موت کی طرف اشارہ ہے۔

سورۃ القصص میں قارون کا ذکر زیادہ تفصیل کے ساتھ ہے مسئلہ زیر بحث کے متعلق جس قدر حصہ ہے اسے نقل کرتے ہیں۔

ان قارون کان من قوم موسیٰ فبغیٰ علیہم وآتینہ من الکنوز ما ان مفاتحہ لتنوء بالعصبۃ اولی القوۃ اذ قال لہ قومہ لا تفرح ان اللہ لا یحب الفرحین۔

قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا پس اس نے بغاوت کی اور ہم نے دئیے تھے اس کو خزانے یہاں تک کہ اس کی دولت ایک قوت والی جماعت سے بھی نہ اٹھ سکتی جب اس کی قوم والوں نے اس سے کہا کہ اترا مت اللہ اترانے والوں کو دوست نہیں رکھتا

فخسفنا بہ وبدارہ الارض، فما کان من فئۃ ینصرونہ من دون اللہ وما کان من المنتصرین واصبح الذین تمنوا مکانہ بالامس یقولون ویکان اللہ یبسط الرزق لمن یشاء من عبادہ ویقدر۔ لولا ان من اللہ علینا لخسف بنا۔

پس دھنسا دیا ہم نے اس کو اور اس کے گھر کو زمین میں اور نہ کوئی اس کا مددگار ہو سکا اور نہ وہ خود اپنی مدد کر سکا۔ اور وہ لوگ جو کل اس کی جگہ کی تمنا کرتے تھے کہنے لگے، اللہ جس کو چاہتا ہے اس کے رزق میں وسعت پیدا کر دیتا ہے اگر وہ ہم پر مہربان نہ ہوتا تو ہمیں بھی تباہ کر دیتا۔

کلام مجید میں جہاں اس کے خزانے کا ذکر آیا ہے وہاں لفظ مفاتح بھی موجود ہے اور اسی سے لوگوں کا خیال خزانہ کی کنجیوں کی طرف گیا ہے، حالانکہ مفاتح جس طرح جمع ہے مفتاح (کنجی) کی اسی طرح وہ مفتح (خزانہ) کی بھی جمع ہے اور کلام مجید میں مفاتح کا لفظ مفتح (خزانہ) ہی کی جمع کی صورت میں آیا ہے جس کا ثبوت اس کی ضمیر سے ملتا ہے جو واحد ہے اور جس کا مرجع قارون ہے اگر مفاتح سے مراد کنجیاں ہوتیں تو اس کے بعد ضمیر جمع کی آتی کیونکہ اس کا مرجع کنوز ہوتا جو جمع ہے اس لئے کنجیوں کا مسئلہ تو طے ہو گیا۔ اب رہا زمین میں دھنسنے کا واقعہ سو کلام مجید میں صراحتہً اس کا ذکر موجود ہے مکانوں کا دھنس جانا خاص کر ایسی حالت میں جبکہ نیچے تہ خانے ہوں، بار بار دیکھنے میں آیا ہے اس لئے ایسا تسلیم کرنے میں کوئی استحالۂ عقلی نہیں ہے بعض لوگوں نے اس کا مفہوم محو کر دینا یا تباہ کر دینا" ظاہر کیا ہے جو باعتبار نتیجہ کے تو غلط نہیں ہے لیکن بہ لحاظ واقعہ ضرور نادرست ہے۔ اس امر کی تصدیق کہ قارون زمین کے بیٹھ جانے سے مع اپنے مکان کے خاک میں دفن ہو گیا سورۂ عنکبوت کی ان آیتوں سے بھی ملتا ہے جن کو ہم نے یہاں نقل کیا ہے۔ ان آیات میں قارون، فرعون، ہامان کا ذکر کر کے ہر ایک کی تباہی کی نوعیت کا ذکر علیحدہ علیحدہ کیا ہے، چنانچہ فرعون کا غرق آب اور قارون کا پیوند خاک ہونا وہاں بھی صراحتہً مذکور ہے۔ اب رہا یہ امر کہ خدا نے موسیٰ سے کہا کہ زمین پر میں تجھے اختیار دیتا ہوں اور یہ اختیار پانے کے بعد موسیٰ نے زمین سے کہا کہ قارون کو پکڑ لے پھر قارون کا معافی طلب کرنا، موسیٰ کا نہ ماننا اور خدا کا کہنا کہ اگر قارون مجھ سے معافی طلب کرتا تو میں دے دیتا، یا یہ کہ قارون کا قیامت تک زمین کے اندر دھنستا چلا جانا

یہ سب حکایات یہود کے ٹکڑے ہیں جن کو ہمارے ہاں کے مفسرین بغیر نقد و جرح کے لے لیا کرتے ہیں اور جو پیشہ ور مولویوں اور واعظوں کے ذریعہ سے عوام تک پہونچتے رہتے ہیں۔ ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اور نہ کلام مجید سے ان بے سروپا باتوں کی تصدیق ہو سکتی ہے۔

مسئلہ معاد

(جناب غلام ربانی صاحب عزیز)

نگار کے اکتوبر نمبر میں آپ تصدق حسین صاحب کے نمبر ۲ کے جواب میں فرماتے ہیں کہ بہشت و دوزخ کے بیانات سب تمثیلی ہیں اور دونوں کے سمجھانے کے لئے اصل میں ان کا تعلق صرف روحانی مسرت و اذیت سے ہے"

بیسویں صدی عیسوی کی یہ تاویلات قرآنی میں نے اکثر نہیں بلکہ عموماً اس فرقہ سے جو اس وقت تہذیب و تمدن کا علمبردار ہے سنی ہیں مجھے اس کے متعلق آپ سے کچھ عرض کرنا ہے، غالباً آپ اس پر توجہ فرمائیں گے۔

مسرت و اذیت ہر دو کیفیات احساسی ہیں اور ان کے لئے پہلے محرک اور سبب کا وجود ضروری ہے۔ اگر بہشت و دوزخ سے مراد

مسرت واذیت روحانی بھی ہو تو حسب قاعدہ مسرت واذیت کے محرک اور سبب کا وجود اس سے مقدم ہوگا۔ اب قابل دریافت امر یہ ہے کہ حیات بعد ممات میں وہ محرک اور سبب کیا چیز ہوگی اور کس طرح انسانی روح پر مسرت واذیت کے جذبات طاری ہوں گے۔ کسی مفید اور کارآمد چیز کی یافت سے انسان خوش ہوتا ہے اور اس کے فوت ہو جانے سے غمگین۔ حیات بعد الممات میں کس چیز کی یافت سے ہم مسرور ہوں گے اور کس چیز کی نایافت سے مغموم۔

آپ روحانی مسرت واذیت کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ روحانی مسرتیں اور اذیتیں شدید تر ہیں گو ایسی روحانی خوشی اور اذیت جس کے ساتھ جسمانی خوشی واذیت شامل نہ ہو تجھی قابل اعتنا نہیں تم عشق ضرور رہا ہوگا سے ملوان کے ساتھ ہی اگر سربازار ہر روز بلا ناغہ عاشق پر سربازار کے کوڑے بھی لگائے جائیں تو پھر یہ تکلیف بدرجہا زیادہ اذیت رساں ہوگی۔ لیکن مجھے تو اس میں بھی کلام ہے کہ روح کے لئے ایسی روحانی مسرت یا اذیت کا وجود جب روح جسم سے علیحدہ ہو چکی بھی ہے یا نہیں، کیونکہ ہمارے لئے کسی ایسی حالت کا تذکرہ جب ہماری روح کا پیوند جسم سے نہ ہوا تھا محالات سے ہے۔ پھر آخر بعد ہو دنیاوی زندگی کا اہم ترین مقصد ہے کس طرح ایک ایسی خوشی یا اذیت سے عبارت ہو سکتی ہے جس کو کوئی فرد بشر بھی نہیں سمجھ سکتا اور وہ انسان جو اُدھر میں کا

بندہ اور خواہشات نفسانی کا حلقہ بگوش ہے کیسے فقط مسرتِ روحانی پر اکتفا کرنے کے لئے تیار ہوگا؟

اگر بہشت و دوزخ کے بیانات تمثیلی ہوں اور اس سے مراد روحانی مسرت و اذیت ہو۔ تو ضرور ہے کہ ان روحانی مسرتوں اور اذیتوں سے صرف روح متمتع ہو اور بے چارہ جسم جس نے روح کا دنیا کی ہر دشوار گزار گھاٹی میں ساتھ دیا جس کے سینے دشمنوں کے تیروں اور گولیوں سے چھلنی ہو گئے جس کے ہاتھ پاؤں تباہ کن توپوں اور ہوائی بمبار جہازوں کے نذر ہو گئے اور جس کے سر و دوش اینٹوں سے زخمی اور چور ہو گئے بے یار و مددگار پیکر خاک ہو جائے اور زمانے کے جھکڑ اور آندھیاں اسے اڑا کر نیستی کے سمندر میں غرق کر دیں، کیا اس وقت اسے حق نہ حاصل ہوگا کہ زبانِ حال سے چلا چلا کر گلا پھاڑ پھاڑ کر دربارِ رب لایزال میں رو رو کر یوں عرض کرے "فاذا تکون کریہۃ ادعیٰ لہا، واذا یحاس الحیس یدعیٰ جندب" اس دنیا کے کاروبار میں روح اور جسم مسرت و اذیت میں برابر کے حصہ دار ہیں اور روحانی مسرت سے اگر طبیعت خوش ہوتی ہے تو جسم کا بھی اس میں برابر کا حصہ ہے اور جسمانی اذیت سے روح کے لئے بھی تکلیف و اذیت ہے لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا کہ جب موت کے بعد انسان کے اعمال و افعال کا باقاعدہ جائزہ لیا جاتا ہے اور اسے اعمال کے مطابق مسرت یا اذیت کا حقدار ٹھہرایا جاتا ہے تو اس وقت جسم

کو کیوں نظر انداز کیا جاتا ہے حالانکہ روح کو جس مسرت یا اذیت سے اب دوچار ہونا پڑتا ہے اس کا ارتکاب جسم کی معرفت عمل میں آیا تھا۔ ورنہ صرف روح ہرگز اس قسم کے جرائم یا اعمال حسنہ کا ارتکاب نہ کر سکتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو کیا وجہ ہے کہ جسم کو بھی اس مسرت و اذیت میں برابر کا حصہ دار نہ قرار دیا جائے؟۔

آپ کو یاد ہوگا کہ گزشتہ جنگ بلقان میں بلغاریہ اور سرویہ نے کس طرح اپنے آپ کو جان جوکھوں میں ڈال کر ایڈریانوپل فتح کیا تھا۔ کیا آپ ان کی اس خوشی کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو انھیں اس فتح سے حاصل ہوئی ہوگی لیکن اگر کوئی فیلسوف ان سے اس وقت یہ کہتا کہ جسمانی منافع اور خوشیوں سے روحانی خوشیاں اور منافع بدرجہا دلآویز تر ہیں اور تم حیات بعد الممات کی خوشیوں اور راحتوں کو بھی اس قبیل سے قرار دیتے ہو۔ کیا اچھا ہو اگر تم ان خوشیوں سے مماثلت پیدا کرنے کے لئے ایڈریانوپل کو بعد فتح کرنے کے پھر ترکوں کے حوالہ کر دو کیونکہ انھیں فتح سے جو روحانی مسرت حاصل ہوئی ہے وہ کیا کم ہے۔ اور انھیں جو شکست سے روحانی اذیت اور انفعال حاصل ہوا ہے کیا تھوڑا ہے؟

تو اگر اس وقت کوئی صلیب پرست فلاسفر جواباً یہ عرض کر سکتا ہے کہ ایڈریانوپل کی فتح سے جو مادی نقصانات ہم کو برداشت کرنا پڑے ہیں ان کی تلافی کی کیا صورت ہوگی؟ اور آپ اس پہلو کو کیوں نظر انداز

گئے ہیں؛ تو کیا رب ذوالجلال کے دربار میں جسم کی طرف سے کوئی
دعویٰ پیش نہیں کیا جا سکتا کہ دنیا کے سرد و گرم، تر و خشک خیر و شر میں جب جسم
روح کے برابر شریک تھا تو کیا وجہ ہے کہ اب جسم کو ان لذائذ سے تمتع
کا کوئی موقع نہیں دیا جاتا جس طرح ایڈریانوپل فتح کے بعد تلوار سے
ہی واپس لیا جا سکتا ہے اور فاتح فقط روحانی مسرت پر اکتفا نہیں
کر سکتا۔ بلکہ وہ جسمانی پہلو سے بھی حظ اندوزی کا طلبگار رہتا ہے۔ بالکل اسی
طرح حیات بعد الممات میں بھی جسم روح کے دوش بدوش ہوگا اور اپنے
حقوق کے لئے داد فریاد کرے گا اور کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو صرف روحانی
مسرت کے کھلونے سے بہل جائے۔

اسلام نے راہبانہ زندگی سے اپنے پیروؤں کو اسی لئے منع فرمایا
کہ وہ جسمانی پہلو کو نظر انداز کر کے لذائذ دنیا سے تنفر ظاہر کرتے ہیں حالانکہ
احکم الحاکمین علی الاطلاق کا انسانی تخلیق سے بالکل یہ مدعا نہ تھا کہ وہ اپنے
اس قدر اہم انسانی حصہ کو نظر انداز کر دے۔ بلکہ یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ
ہم نہایت فراخدلی سے جائز طور پر لذائذ دنیوی سے بہرہ ور ہوں اور
نہایت شد و مد سے ہم سے وعدہ کیا جاتا ہے کہ "الذین آمنوا منکم
وعملوا الصالحات لیستخلفنہم فی الارض کما استخلف الذین من قبلہم ولیمکنن لہم دینہم
الذی ارتضی لہم ولیبدلنہم من بعد خوفہم امنا" (۴۔ نور) وعدۂ الٰہیہ کے پہلے
جزو میں ہم کو ایک مادی چیز عنایت فرمائی جاتی ہے جس سے ہمارے

جسمانی پہلو کی رعایت مقصود ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے اس معجون مرکب (انسان) میں، غالباً جسمانی پہلو روحانی پہلو سے زیادہ قابلِ اہتمام ہے۔ وجود کا دوسرا جزو روحانیت اور جسمانیت، دونوں سے مرکب ہے اور تیسرا خالص روحانی ہے لیکن یہ امر کس قدر تعجب انگیز کہ حیات بعد الممات میں جسمانی پہلو کو بالکل بھلا دیا جائے اور ایک نہ ختم ہونے والی زندگی روحانی (فرضی) مسرتوں میں بسر کرنا پڑے، اسی طرح حیات بعد الممات میں اگر جسمانی پہلو بالکل ترک کر دیا گیا ہے۔ تو پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلام راہبانہ زندگی کے برخلاف کیوں زور شور سے پروٹسٹ کر رہا ہے۔ حالانکہ جب اخروی زندگی سراپا روحانی مسرتوں اور اذیتوں سے لبریز ہے تو اس شخص کو کیوں قابل تحسین و آفریں نہیں خیال کیا۔ جو اپنی دنیوی اور اخروی زندگی میں مماثلت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نبی اور مرسل کو روح القدس سے جو قریب کا تعلق ہوتا ہے وہ کسی اہل بصیرت سے مخفی نہیں لیکن جسمانی لذائذ کچھ اس قدر دلربا واقع ہوئے ہیں کہ وہ بھی باقاعدہ ان سے استفادہ کرتے ہیں حالانکہ جب اخروی زندگی بالکل ہی روحانی زندگی ہے تو کیا یہ قرین قیاس نہیں ہے کہ پیغمبر اس زندگی کا مکمل نمونہ ہوتا ہے؛ جبکہ نبی کی بعثت کا مقصود بھی یہی ہوتا ہے کہ وہ دنیا کو اس سفر کے لئے تیار کرے لیکن سنئے دنیا کا سب سے بڑا انسان کیا کہہ رہا ہے۔

"حببت الیَّ من دنیاکم ثلاثۃ۔ الطیب، والنساء، قرۃ عینی فی الصلوٰۃ"
یہاں بھی آپ دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح ترتیب مدارج منظور ہے (۱) عورت (۲) طیب (۳) الصلوٰۃ، اگر بہشت دوزخ روحانی مسرت واذیت کی دوسری تعبیریں قرار دی جائیں تو کیا یہ سراپا ابلہ فریبی نہیں کس قدر مضحکہ خیز امر ہے کہ اسد کہہ کر رجل شجاع مراد ہو اور اس تاویل کے لئے ذرہ بھر بھی گنجائش نہ ہو اور نہ کوئی قرینہ صادقہ موجود ہو۔ روحانی مسرتوں اور اذیتوں کو حور وقصور اور دوزخ وہاویہ سے تعبیر کرنا معنی الشعر فی بطن الشاعر کے قبیل سے ہے۔

۴۰ کروڑ مسلم آبادی میں سے اس وقت فی لاکھ کتنے آدمی ایسے ہوں گے جن کا عقیدہ ہے کہ بہشت ودوزخ سے مراد روحانی مسرت واذیت ہے۔ عوام جن میں یہ خاکسار بھی شامل ہے ہرگز جسمانی پہلو کو نظر انداز کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اگر وہاں بقول آپ کے روحانی مسرتوں اور اذیتوں کا ہی انتظام ہے۔ عوام جن کی ساری عمر دوزخ کے ڈر اور بہشت کے شوق میں بسر ہوئی خدائے متعال کی اس ابلہ فریبی کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے جبکہ ان کی پیاس بجھانے کے واسطے کافی سامان نہ ہوں گے اور کیا اس وقت کہا جا سکتا ہے کہ بہشت ودوزخ سے مراد روحانی مسرت واذیت تھی۔ اگر کسی نے کہہ بھی دیا تو کیا ادھر سے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ "کلم الناس

حل تو تقریباً ممکن ہے آپ یہ فرما دیں کہ قرآن نے تو یہ بھی کہہ دیا
کہ "فاسئلوا اہل الذکر ان کنتم لا تعلمون" لیکن اگر اس وقت اہل الذکر کی
کسی کو جستجو بھی ہو تو ہم گردو مسلم آبادی سے کتنے آپ کے ہم خیال
اہل الذکر پیدا ہوں گے ہاں پھر ارشاد ہے کہ "فاتبعوا السواد الاعظم"
اور "ولا تجتمع امتی علی ضلالۃ"

یہ استفسار یا اعتراض مولوی غلام ربانی عزیز کا دو سال سے میرے پاس محفوظ ہے اور اس درمیان میں بار ہا میری نظر سے گزرا لیکن ہمیشہ میں نے موقوف اسے وقت دیگر پہ رکھا۔ ایک زمانہ سے میرے اوقات کا اکثر حصہ اسی غور و فکر میں بسر ہو رہا ہے کہ خالق و مخلوق کا تعلق کس نوع کا ہو سکتا ہے تخلیق انسان کی غایت کیا ہے؛ قدرت ہم سے کیا توقعات رکھ سکتی ہے اور مذہب کس حد تک اس معمہ کے حل کرنے میں کامیاب ہوا ہے پھر اسی ایک خیال کے تحت چونکہ طاعات و عبادات کے مسائل، معاد و آخرت کے عقاید انبیاء و رسل کے الہامات، عالم کون کے سلسلہ ہائے علت و معلول، اور وہ تمام باتیں جو ایک مذہبی لٹریچر سے متعلق ہو سکتی ہیں سبھی پر غور کرنا پڑا اس لئے ظاہر ہے کہ بہشت و دوزخ کے قصے بھی میرے سامنے آئے ہوں گے اور میں نے ان کے بارے میں بھی کوئی رائے قائم کی ہو گی لیکن میں خود ایک عرصہ تک اس باب میں متفکر و متردد رہا اس لئے جی نہ چاہا کہ خود اپنا اطمینان نفس حاصل کئے بغیر دوسرے کو سمجھانے کی کوشش

کروں قبل اس کے کہ میں اصل مقصود پر آؤں یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرا مسلمان ہونا (اگر میں واقعی مسلمان ہوں) اس بنا پر نہیں کہ میرے آباؤ اجداد اس مذہب کے پیرو تھے بلکہ مسلمان ہوں اس لئے کہ میں نے تمام مذاہب کے لٹریچر کا نہایت غائر اور وسیع مطالعہ کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ انسان کو مذہب کی ضرورت ہے تو اسلام سے بہتر کوئی اور مذہب اس کے لئے نہیں ہو سکتا کیونکہ اس سے زیادہ سادہ لیکن ہمہ گیر تعلیمات اور کہیں نہیں پائی جاتیں پھر ظاہر ہے کہ میرا اسلام کوئی تقلیدی چیز نہیں ہے اور نہ تقلید محض ایک شخص کو کسی مسلک یا مذہب کا سچا پیرو بنا سکتی ہے "نفس مطمئنہ" نام کورانہ اتباع کا نہیں بلکہ اجتہادانہ تفکر و تدبر کا ہے اور یقیناً اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو ہر شخص کو ہر زمانہ میں اجتہاد کی دعوت دے سکتا ہے اور کسی کو مجبور نہیں کرتا کہ بغیر غور کئے ہوئے اس کی تعلیمات کو قبول کرے۔

بہرحال مدعا یہ ظاہر کرنا تھا کہ اس سلسلہ میں جہاں اور بہت سے مسائل پر غور کرنا پڑا میں نے اس خاص مسئلہ پر بھی نہایت آزادانہ رائے قائم کرنے کی کوشش کی اور اگر مجھے اندیشہ نہ ہو کہ لوگ میرے مفہوم کے سمجھنے میں غلطی کریں گے تو میں نہ صرف یہ کہونگا کہ بہشت و دوزخ اصطلاحی الفاظ ہیں روحانی لذت و الم کے لئے بلکہ یہ دعویٰ کروں گا کہ اس مخصوص معنی کے لحاظ سے بھی معاد کا اعتقاد بالکل بے معنی سی بات ہے۔ اور گو اس کی وعظ و تلقین ایک عامی شخص کی صحت اخلاق کے لئے ضروری ہو لیکن ارباب فہم کے لئے اس کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

ہر چند معاد کے مسائل ایسے نہیں ہیں جن پر اس سے قبل گفتگو نہ کی گئی ہو

کیونکہ مذاہب کے قیام و بقا کا انحصار بھی اس پر ہے اور ہر وقت اور ہر قوم میں اس پر بحث کی گئی ہے لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ یہ مسئلہ منجملہ ان بہت سے مسائل کے ہے جن پر تا بقائے نسل انسانی ہمیشہ گفتگو کی جائے گی اور ہمیشہ اختلاف آرا، پایا جائے گا۔ اس لیے میرا اس مسئلہ پر اظہار خیال کسی جدید بحث آغاز تو نہ ہوگا لیکن یہ یقینی ہے کہ جو کچھ لکھوں گا وہ میری تحقیقی رائے ہوگی، میرے نقطہ نظر سے بالکل پرخلوص رائے ہوگی خواہ وہ معتقدات عامہ سے کتنی ہی منحرف کیوں نہ ہو مسئلہ عذاب و ثواب یا بہشت و دوزخ پر گفتگو کرنا اس قدر کثیر ذیلی مباحث کا پیدا کرنے والا ہے کہ اس کے لیے مستقل تصنیف کی ضرورت ہے لیکن چونکہ میرا شعار تمام مذہبی مسائل میں صرف "تمسک بالقرآن" ہوتا ہے اس لیے میں کوشش کروں گا کہ مختصر سے مختصر مقالہ میں اپنے خیال کا اظہار کردوں اور اس بحث کے دیگر "انشعابات" پر اگر نگاہ ڈالنا ضروری ہو بھی تو صرف سرسری نگاہ سے کام لوں۔

سب سے پہلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مسئلہ معاد کوئی نئی چیز نہیں ہے اور قدیم ترین مباحث انسانی میں اس کا بھی شمار ہوتا ہے۔ دنیا میں کوئی قوم قدیم ایام سے ایسی نہیں گزری جس نے اپنے مدارک و مدارج ذہنی کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ "عالم بعد الموت" پر فکر نہ کی ہو اور مذہب کے وجود کی بنیاد صرف اسی عقیدہ پر قائم ہے کہ اس دنیا کے بعد ایک عالم اور بھی ہے جہاں محاسبۂ اعمال ہوگا، عذاب و ثواب ہوگا، بہشت و دوزخ ہوگی وغیرہ وغیرہ مذہب کیونکر عالم وجود میں آیا۔ یہ اب کوئی سربستہ راز نہیں رہا اور نہ اس کی غایت کا علم اب پردہ خفا میں ہے۔ قانون و مذہب میں مقدم وجود قانون ہی کا لیکن واضعان قوانین نے دیکھا کہ اس سے فسادات کا سدباب پوری طرح ممکن نہیں

ہے تو انھوں نے مذہب کو پیدا کیا تاکہ انسان کی طبیعت ہی صلاحیت پسند ہو جائے اور قلب انسانی میں بھی خطرۂ جرم نہ آئے، تصفیۂ اخلاق، تزکیۂ نفس، نظام تمدن، تشکیل ہیئت اجتماعی یہی وہ سب باتیں تھیں جو قانون کے بھی پیش نظر تھیں لیکن جب وہ ان کے حصول میں کامیاب نہ ہوا تو مذہب پیدا کیا گیا اور حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ تدبیر اختیار نہ کی جاتی تو آج بھی دنیا اسی عہد وحشت و بربریت میں ہوتی جو کسی وقت اس سے قبل پایا جاتا تھا۔ تکلیف سے بچنا، آرام و راحت کی طرف دوڑنا فطرت انسانی ہے، اس لئے اگر اس فلسفہ کو پیش نظر نہ رکھا جاتا اور مذہب کو اس سے بیگانہ رکھا جاتا تو وہ بالکل بیجان چیز رہتا اور مقصود حاصل نہ ہوتا اس لئے مذہب کی بنیاد ہی معاد کے خیال، عذاب کے ڈر اور ثواب کی تمنا پر قائم کی گئی، پھر چونکہ اس اعتقاد کے لئے ضروری تھا کہ انسان کی حیات ثانیہ کو ثابت کیا جائے (کیونکہ بغیر اس کے عذاب و ثواب کا مفہوم کوئی اہمیت نہ رکھ سکتا تھا) اس لئے حشر اجساد اور بقائے روح کو ضروری قرار دیا گیا۔ یہ تھی مذہب کی بالکل ابتدائی تحریک جس کو میں انتہائی بھی کہوں گا، کیونکہ اس وقت بھی مذہب انھیں کا تار و پود ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

روح کیا ہے؛ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ آج تک اس کا کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا اور نہ شاید کبھی ہو سکے اس پر مستقل تصانیف روز شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن کوئی تصنیف ایسی نہیں جس کو دیکھ کر کسی شخص کو اطمینان کلی ہو سکے۔ میں اس صحبت میں تمام اکابر و اعاظم کی تحقیق سے بحث نہ کروں گا بلکہ غور کروں گا کہ کلام مجید میں اس کے متعلق کیا بتایا گیا ہے غالباً آپ یہ سن کر متحیر ہوں گے کہ شروع سے لے کر اس وقت تک تمام مفسرین نے

اس باب میں سخت غلطی کی ہے اور کلام مجید کی ان آیتوں سے جن میں لفظ روح پایا جاتا ہے مسئلہ روح کے حل کرنے میں مدد لی ہے حالانکہ "روح انسانی" کے لئے جس کا تعلق حیات وممات سے ہے ایک جگہ بھی کلام پاک میں روح کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔

لفظ روح قرآن پاک میں ہر جگہ "الہام" اور "قوت رشد و ہدایت" کے لئے آیا ہے میں اس جگہ ان تمام آیات کو نقل نہیں کروں گا جن میں لفظ روح استعمال کیا گیا ہے میں سورہ مومن کی کی صرف ایک آیت ایسی پیش کروں گا جس سے یقینی طور پر یہ امر ثابت ہو سکتا ہے کہ لفظ روح سے خدا کا کیا مفہوم ہے وہ آیت یہ ہے:۔

رفیع الدرجات ذوالعرش یلقی الروح من امرہٖ علیٰ من یشاء من عبادہ لینذر یوم التلاق۔

یعنی بلند مرتبہ والا صاحب تخت خدا ڈالتا ہے روح، پیدا کرتا ہے قوت رشد و ہدایت اپنے حکم سے جس پر چاہتا ہے اپنے بندوں سے تاکہ وہ ڈرائے انجام سے۔

اگر روح سے مراد روح انسانی ہوتی تو پھر یہ تخصیص کیونکر ممکن تھی کہ "جس بندہ کو چاہتا ہے یہ روح عنایت کرتا ہے"۔ روح انسانی تو ہر آدمی میں پائی جاتی ہے اور اس سے کوئی خالی نہیں، اس لئے معلوم ہوا کہ روح سے مراد خدا کا الہام یا قوت رشد و ہدایت ہے۔

اسی پر "قل الروح من امر ربی" کا بھی قیاس کیجئے، یہاں روح سے قرآن مراد ہے "یسئلونک عن الروح" (یعنی لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ قرآن جسے تم الہامات ربی کہتے ہو کیا ہے) "قل الروح من امر ربی" (تو اس کے جواب میں اے رسول تم کہدو کہ یہ الہامات سب حکم خداوندی و منشاء ایزدی کا نتیجہ ہیں) "وما اوتیتم من العلم الا قلیلا" جس کے سمجھنے کی

اہلیت تم میں بہت کم ہے)

آپ قرآن پاک کھول کر سورۂ بنی اسرائیل میں اس آیت کے قبل و بعد کی آیتوں پر غور کیجئے، آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ روح سے مراد کیا ہے۔

اسی طرح سورۂ النحل کی ایک آیت سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ لفظ روح سے روح انسانی مراد نہیں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

ینزل الملائکۃ بالروح من امرہ علی من یشاء من عبادہ — یعنی تو ارملکوتی حکم خداوندی سے الہامات پیدا کرتے ہیں اپنے مخصوص بندوں میں۔

یہاں بھی وہی علیٰ من یشاء ہے۔ ہر انسان مقصود نہیں ہے۔ اسی طرح مسیح کے بیان میں لفظ روح سے جو مراد ہو سکتی ہے ظاہر ہے۔

بہر حال روح انسانی کے لئے کلام مجید میں لفظ روح کسی جگہ نہیں آیا ہے اور اس کے سمجھنے میں تقریباً سب نے غلطی کی ہے اس لئے اب غور طلب یہ امر ہے کہ اگر لفظ روح، روح انسانی کے لئے نہیں آیا ہے تو پھر اس معنی میں کس لفظ کا استعمال کیا گیا ہے لیکن مجھے اس سے بھی اختلاف ہے میرے نزدیک کلام مجید میں نفس کا لفظ ضمیر (CONSCIENCE) کے مفہوم میں آیا ہے۔

سورۂ قیامت میں ہے "ولا اقسم بالنفس اللوامۃ" سورۂ الفجر میں ہے "یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ" سورۂ شمس میں ہے "ونفس وما سواھا" ان میں سے ہر جگہ نفس سے مراد ضمیر انسانی ہے اور اگر نفس سے مراد واقعی روح انسانی مراد ہوتی تو اس مفہوم کے علاوہ کسی اور معنی میں یہ لفظ استعمال نہ ہوتا حالانکہ ظاہر ہے کہ "کل نفس ذائقۃ الموت"

میں نفس سے مراد روح انسانی نہیں بلکہ دنیاوی ہستی مراد ہے۔

الغرض میری جستجو کا نتیجہ یہ ہے کہ کلام مجید میں نہ روح کی حقیقت سے کہیں بحث کی گئی ہے اور نہ اس کی فنا یا بقا کا جھگڑا چھیڑا گیا ہے۔ اگر روح کا بقا ثابت ہوتا ہو تو اس کا ذمہ دار کلام مجید نہیں ہے، اور اگر روح فانی ثابت ہوتی ہے تو قرآن کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ اگر حیات بعد الموت کو مذہباً تسلیم کیا جاتا ہے اور حیات بھی بالکل ویسی ہی جیسی اس دنیا پائی جاتی ہے یعنی جسم کے ساتھ تو از روئے نتیجہ یہ ماننا ضروری ہوگا کہ نہ صرف روح انسانی بلکہ انسانی جسم بھی غیر فانی چیز ہے، حالانکہ جسم کی بقا کا کوئی قائل نہیں۔ اگر اس کا جواب یہ دیا جائے کہ جسم از سرنو پیدا کیا جائے گا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ روح کا دوبارہ پیدا ہونا بھی ناممکن نہیں ہے جس طرح اول اول جسم کے ساتھ روح پیدا ہوئی تھی، اسی طرح بعد کو بھی جب جسم پیدا ہوگا، روح بھی اس کے ساتھ وجود میں آجائے گی اس لئے وہ جماعت جو حشر اجساد کی قائل ہے کسی طرح روح کے بقا کو دلائل عقلی سے ثابت نہیں کر سکتی۔

بہرحال قبل اس کے کہ حشر اجساد پر بحث کی جائے، یہ فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ حشر اجساد کا اعتقاد محض لوگوں میں خشیت پیدا کرنے اور ان کے اخلاق درست کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے، حقیقتاً عقل کے نزدیک بھی وہ قابل قبول ہے۔ آئیے پہلے ایک نظر اس سوال پر بھی ڈال لیں۔ جس وقت ہم کائنات اور عالم خلق پر نگاہ ڈالتے ہیں تو سب سے پہلے وہ چیز جو ہماری عقل کو حیران بنا دیتی ہے اس کی وسعت و تنوع ہے۔ کائنات نام اس کرۂ ارض کا نہیں ہے جس کا دور صرف ۲۴۰۰۰ میل ہے اور

اور یہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے ایک معمولی سیارہ ہمارے نظام شمسی کا ہے بلکہ کائنات اور عالم خلق بس تمام وہ فضاء بسیط خالی ہے جس کی وسعت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ جنہوں نے فلکیات کا مطالعہ کیا ہے ان سے یہ امر مخفی نہیں کہ ہمارا نظام شمسی کیا ہے اس میں علاوہ زمین کے اور بڑے بڑے سیارے عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری، زحل وغیرہ بھی ہیں۔ ان سیاروں کے چاند بھی ہیں چھوٹے تارے بھی ہیں، بے شمار شہاب ثاقب اور دمدار تارے بھی پائے جاتے ہیں اور مختصراً یوں سمجھئے کہ نظام شمسی کا محیط ۱۱ ارب میل ہے لیکن باوجود اس قدر عظمت کے یہ سارا نظام شمسی کائنات کی وسعت کے لحاظ سے اسقدر حقیر چیز ہے کہ اگر اس کو آج محو کر دیا جائے تو کائنات کو اتنا بھی نقصان نہیں پہونچ سکتا کہ جتنا سمندر کو ایک قطرہ کے نکل جانے سے۔

خدا جانے کتنے بے شمار نظام شمسی اور کتنے سیارے اس کائنات میں پائے جاتے ہیں جن کے متعلق انسان کو اگر کوئی علم ہو سکا ہے تو صرف اس قدر کہ ان میں سے بعض اتنی دوری پر واقع ہیں کہ ان کی روشنی ہم تک لاکھوں سال میں پہونچتی ہے اور یہ کہ روزانہ خدا جانے کتنے سیارے فنا ہو کر نئے ظاہر ہوتے رہتے ہیں پھر جب فضا کی وسعت کا یہ عالم ہے اور اس کے اندر اجرام اور سیاروں کی کثرت کا یہ حال ہے تو یہ سارا نظام بے جان تو ہوگا نہیں، ان میں خدا جانے کس کس قسم کی مخلوق ہوگی اور اس سے قبل اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کن کن سیاروں میں کس کس نوع کی مخلوق فنا ہو کر بالکل نئی مخلوق پیدا ہوئی ہوگی۔

پھر جب خدا یا قدرت کا یہ معمولی مشغلہ ہے کہ ہزاروں کرّے یا سیارے روز بنائے

اور بگاڑے تو کوئی وجہ نہیں کہ زمین ایسے حقیر کرے کے متعلق وہ کوئی علیحدہ نظام قائم کرے اور یہاں کی مخلوق کو فنا کرنے کے بعد وہ پھر از سر نو زندہ کرے۔ بلحاظ خلق ایک انسان اور حقیر سی چیونٹی دونوں خدا کے نزدیک ایک ہیں، اس لئے اگر وہ حشر و نشر کو انسان کے لئے گوارا کرتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دیگر حیوانات و حشرات کو اس سے مستثنیٰ کر دے جبکہ خلقِ محض کے لحاظ سے خدا کے نزدیک ایک انسان اور معمولی کیڑے کی اہمیت یکساں ہے پھر یہی نہیں بلکہ جملہ کائنات کے تمام ان اجرام کے مخلوقات کا حشر و نشر بھی ماننا پڑے گا جو ازل سے ابد تک پائے جائیں اور چونکہ صفت خالق سے کبھی جدا نہیں ہو سکتی اس لئے ظاہر ہے کہ یہ سلسلۂ تخلیق لا نہایت تک چلا جائے گا اور جملہ مخلوقات کائنات کا حشر و نشر مستلزم ہوگا اس امر کو کہ علاوہ اس کائنات کے ایک اور لا نہایت کائنات تسلیم کی جائے جو عالم خلق سے جدا ہو اور اس کا خلاف عقل ہونا ظاہر ہے۔ خدا پیدا کرتا ہے اور فنا کر ڈالتا ہے انکار نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے ماننے میں کوئی استبعاد عقلی ہے اور نہ محالات کو ممکن ماننا پڑتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ جتنی مخلوقات کو اس نے پیدا کر کے فنا کر دیا ہے (واضح رہے کہ آپ اس میں تخصیص محض انسان کی نہیں کر سکتے اور نہ اس کے لئے آپ عقلی دلیل پیش کر سکتے ہیں) انھیں کو وہ پھر پیدا کر دیگا اور صرف اس لئے کہ ان سے محاسبہ کرے۔ ان کی پہلی زندگی کے اعمال و افعال کا تو اس سے کوئی نتیجہ مترتب نہیں ہوتا کیونکہ خود خدا کو جزا و سزا تنبیہ و تادیب سے کوئی فائدہ نہیں اور جن کو جزا سزا دی جائے گی ان کو پھر پہلی زندگی میں واپس آنا نہیں کہ آئندہ کے لئے وہ اصول عذاب و ثواب کا لحاظ کر کے زندگی بسر کریں

خدا کی عظمت و تقدیس کا حقیقی خیال بالکل اس امر کے منافی ہے کہ وہ اپنی کسی مخلوق سے جو ہر لحاظ سے محتاج، بے نوا، مجبور اور خدا کی عظمت کو دیکھتے ہوئے لاشے محض ہے کسی نوع کا مطالبہ کرے یا اس پر کسی سختی کو روا رکھے ظاہر ہے کہ جو ہدایات انبیا کے ذریعہ سے انسان کو پہونچائی گئی تھیں وہ صرف اسی کے فائدہ کے لئے تھیں۔ خدا کو ان سے کوئی غرض نہ تھی اس لئے اگر کسی نے ان پر عمل کرکے فائدہ اٹھایا تو اپنے لئے اور نقصان کیا تو اپنا، لیکن اس نفع و نقصان کو عالم مابعد الحیات سے متعلق کرنا اور اس میں دوام و خلود کی شان پیدا کرنا اور اسی سلسلہ میں ہزاروں پیچیدہ مسائل پیدا کرکے سادہ فطرت انسانی میں الجھاؤ ڈالنا کسی طرح عقل کے نزدیک قابل قبول نہیں ہو۔

اب اس کے بعد بحث کا پہلو یہ رہ جاتا ہے کہ اگر یہ صورت معاد کی نہیں ہے تو پھر کوئی اور صورت ہو سکتی ہے یا نہیں اور جسم سے جدا ہونے کے بعد روح بھی فنا ہو جاتی ہے یا کیا؟

ہر چند علمی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر بحث کرنا مفید یقین نہیں ہو سکتا کیونکہ انسانی علوم سے تقصا جس درجہ ناقص و ناکمل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں تاہم چونکہ انسان باوجود اس علم کے بھی مجبور ہے کہ وہ اطمینان نفس کے لئے عقل ہی سے کام لے اس لئے اس کو اپنے گزشتہ تجربات پر اعتماد کرکے ہر امر کے متعلق کوئی نہ کوئی حکم لگانا پڑتا ہے کیونکہ بہ حال ریب و شک کی زندگی بسر کرنے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ کوئی ایک مقصود متعین کر لیا جائے خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔

حیات انسانی اور معاد کے مسئلہ کے متعلق طبیعیات سے ہے کیونکہ انسان بھی

اسی عالم طبیعی کا ایک مظہر ہے اور اگر مرنے کے بعد اس کا وجود کسی نہ کسی طرح قائم رہا تو اس کا تعلق بھی اسی عالم سے ہوگا۔ اس لئے جب طبیعیات کے اصول سے اس مسئلہ پر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد ہر چند انسان کی وہ شکل و صورت تو قائم نہیں رہتی جو دنیا میں پائی جاتی تھی لیکن بہر حال اس کا وجود کسی ایک سے زیادہ مختلف صورتوں میں پایا جانا چاہئے کیونکہ عالم طبیعی کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ہر شے سے پیدا ہوتی ہو اور پھر معدوم ہو جاتی ہو، اس کی صورت کا بدل جانا، اس کی صفات کا متغیر ہو جانا، حواس سے اس کا شعور نہ ہونا، نگاہ سے اس کا نظر نہ آنا یہ سب ممکن ہے لیکن اس کا بالکل معدوم ہو جانا طبیعیات کے نزدیک محال ہے۔ جب آواز ایسی چیز جس کا بظاہر کہیں وجود نہیں معلوم ہوتا فنا نہیں ہوتی اور ایتھر کے امواج میں ملی رہتی ہے تو پھر اشیاء مادی کا کیا ذکر ہے۔

الغرض ہمارے حواس کا کسی شے کو محسوس نہ کرنا دلیل اس کے عدم وجود کی نہیں ہو سکتی۔ مادہ و قوت کے ساتھ اثیر کا جو تفاعل ہو سکتا ہے وہ مخفی نہیں لیکن کیا اثیر کے وجود سے انکار ہو سکتا ہے حالانکہ اسے محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ سیارات کا ارتباط یہاں تک کہ نظام شمسی کا وجود، زرد کہربائیت کے مظاہر اور رجوا ہر مادی کا مرتبط ہو کر جسم اختیار کر لینا سب اثیر ہی کا کرشمہ ہے اس لئے جب مادہ و قوت جو حقیقتاً ایک ہی چیز ہیں اور مختلف صورتوں میں باقی رہتی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ انسان کی حیات کے مسئلہ میں وہ فانی مان لئے جائیں اور مرنے کے بعد وہ قوت جس نے اسے زندگی بخشی تھی، باقی نہ رہے لیکن چونکہ مادہ یا قوت تفاعل کے تحت ہمیشہ مختلف صورتیں

اختیار کرتے رہتے ہیں، اس لئے یہ ضروری نہیں کہ انسان مرنے کے بعد انسان ہی رہے اور وہ قوت جو اس میں کام کر رہی تھی کوئی دوسری صورت نہ اختیار کرے۔

یہ ہے رائے اکثر علمائے طبیعیات کی جس سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد انسانی حیات فنا نہیں ہو جاتی بلکہ وہ اور مختلف صورتیں اختیار کر لیتی ہے گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھنا چاہیئے کہ طبیعیات والے بڑی حد تک تناسخ کے قایل ہیں اور ان کے نقطۂ نظر سے بقاءِ حیات کی بہترین صورت یہی ہے۔

اب آیئے کلام پاک سے اس معمہ کا حل چاہیں اور غور کریں کہ قیامت حشر و نشر اور معاد کے متعلق اس نے کیا بتایا ہے۔ کلام مجید میں قیامت کا ذکر بہت کثرت سے آیا ہے لیکن ہم آیات کو یہاں نقل کرنا ضروری نہیں سمجھتے بلکہ ان کا مدعا و مفہوم مختصراً بیان کرتے ہیں۔ کلام مجید میں جن الفاظ کے ساتھ قیامت کا منظر کھینچا گیا ہے وہ اس میں شک نہیں کہ نہایت ہی ہولناک ہے اور بالکل صحیح ہے کیونکہ جس طرح فضا کے اور بہت سے کرے فنا ہو چکے ہیں اسی طرح کرۂ ارض بھی ایک نہ ایک دن فنا ہوگا، خواہ آفتاب اس کو اپنی طرف کھینچ کر خاک سیاہ کر دے خواہ کسی اور سیارہ سے ٹکرا کر تباہ ہو جائے اور ایسی صورت میں خدا کا یہ فرمانا کہ زمین ریزہ ریزہ ہو جائے گی، جو کچھ اس کے اندر ہے اگل دے گی، اس کی حالت بالکل بدل جائیگی وہ کپکپا اٹھے گی بالکل صحیح و درست ہے۔ اسی طرح پہاڑوں کے متعلق یہ فرمانا کہ وہ دھنکی ہوئی اون کے مانند ہو جائیں گے، ریزہ ریزہ ہو جائیں گے، ریت کے ٹیلوں کی طرح نظر آئیں گے بالکل درست ہے۔ اسی طرح خدا نے سمندر کے متعلق

بتایا ہے کہ وہ آگ کی طرح بھڑک اٹھے گا اور یہ بھی یقینی ہے کیونکہ کرۂ ارض کی تباہی
کے وقت ان تمام مناظر کا پیش آنا کھلی ہوئی بات ہے لیکن خدائے پاک نے اس
سلسلہ میں صرف کرۂ ارض ہی کی تباہی کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ "اذا الشمس کورت و اذا
النجوم انکدرت" کہکر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ زمین کی طرح آفتاب اور دوسرے ستارے
بھی تباہ ہو جائیں گے۔

الغرض کلام مجید میں جس قیامت کا ذکر جس نوع کے انداز بیان سے کیا گیا
ہے اس سے مقصود تو وہ عام تباہی ہے جب ہمیشہ کے لئے یہ کرۂ ارض برباد ہو جائیگا
اور اس سے مدعا انسان پر اپنی قوت و جبروت اور اس کی بیچارگی و بے بسی کا ظاہر
کرنا ہے لیکن اس سے یہ مقصود نہیں ہے کہ جب یہ ہوگا اس وقت اعمال کی جزا سزا
ہوگی دوزخ جنت کا قصہ شروع ہوگا

وہ قیامت جس کا تعلق انسان کی جزا سزا سے ہے اسی وقت سے شروع ہو جاتی
ہے جب انسان مرتا ہے اور جس کا ذکر سورۂ قیامہ میں اس طرح لکھا گیا ہے "یسئل
ایان یوم القیامۃ" الخ

یہ اعتقاد رکھنا کہ آغاز عالم سے عام تباہی یا قیامت کبریٰ کے وقت تک
جتنے آدمی پہلے مر چکے ہیں وہ سب کے سب عذاب و ثواب کے لئے قیامت
کے روز قبروں سے اٹھائے جائیں گے صحیح نہیں کیونکہ اس کی کوئی ضرورت محسوس
نہیں ہوتی۔ اگر ایک شخص اپنے اعمال نیک کی وجہ سے جنت میں جانے کا مستحق ہو
تو یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اس کو اس نعمت سے قیامت کبریٰ کی وقوع تک

محروم رکھا جائے۔ اسی طرح ایک مجرم کو اتنی لمبی فرصت دیدی جائے جبکہ تباہی زمین کے لیے ارب درارب سال کی مدت بھی بہت کم کہی جا سکتی ہے

کلام پاک میں بہشت وحشر کا بھی ذکر متعدد مقامات پر آیا ہے لیکن ان سے یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ انسان کا جسم بھی اس کے ساتھ اٹھایا جائے گا کیونکہ انسان سے مراد اس کا بدن نہیں ہے اور معاد کی حقیقت بہشت ونشر کا بیان ان لوگوں کے سمجھانے کے لیے تھا جو ہمارے روح کے قائل نہ ہونے کی وجہ سے سمجھتے تھے کہ عذاب وثواب کا قصہ یونہی سا ہے اور اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ کلام مجید میں اس کا ذکر صراحتہً موجود ہے ارشاد ہوتا ہے:۔

وقالوا ما ہی الا حیاتنا الدنیا نموت ونحیی وما یہلکنا الا الدھر وما لہم بذلک من علم ان ہم الا یظنون ؕ واذا تتلی علیہم آیاتنا بینات ما کان حجتہم الا ان قالوا ائتوا بآبائنا ان کنتم صادقین ؕ

وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہے یہی دنیا کی زندگی ہے یہیں مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم کو زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے۔ اس پر خدا فرماتا ہے کہ ان کو حقیقت کا علم ہی نہیں یہ ان کا صرف وہم وگمان ہے اور جس وقت ان کے سامنے ہماری کھلی ہوئی نشانیاں بیان کی جاتی ہیں تو ان کی حجت صرف یہ ہوتی ہے کہ اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ دادا کو جو مر چکے ہیں لے آؤ۔

یعنی جس وقت ان سے کہا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی ایک زندگی ہوگی جس میں تمہارے اعمال کی بازپرس ہوگی تو وہ کہتے ہیں کہ اگر مرنے کے بعد جی اُٹھنا صحیح ہے تو ہمارے ماں باپ کو لے آؤ جو مر چکے ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

وقالوا ان ہی الاحیاتنا الدنیا وما نحن بمبعوثین ولو تری اذ وقفوا علی ربہم قال الیس بالحق قالوا بلیٰ وربنا۔

یعنی وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہے یہی دنیا کی زندگی ہے اور اس کے بعد ہم اٹھائے جائینگے لیکن جب تم اپنے خدا کے سامنے کھڑے ہوگے تو خدا تم سے پوچھے گا کہ کیا یہ سچ نہ تھا اور وہ کہیں گے کہ ہاں بیشک سچ تھا۔

تیسری جگہ اون منکرین کا اعتقاد اسی طرح بیان کیا گیا ہے کہ:-

ءاذا متنا وکنا ترابا وعظاما ءانا لمدینون

یعنی مرنے کے بعد جب مٹی اور ہڈی کے سوا کچھ نہ رہے تو پھر کیا بدلہ دیئے جائیں گے۔

الغرض اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت لوگوں کا خیال تھا کہ بعث وحشر ناممکن ہے اور مرنے کے بعد سارا قصہ تمام ہو جاتے گا۔ نہ اچھے اعمال پر انعام ہوگا نہ برے اعمال کی سزا ملے گی۔ اسی اعتقاد کی تردید کلام مجید میں کی گئی ہے کہ مرنے کے بعد یقیناً عذاب و ثواب ہوگا لیکن اس کا ذکر کہیں نہیں ہے کہ حشر بالاجساد ہوگا یعنی وہ جسم جو دنیا میں پایا جاتا تھا پھر پیدا ہوگا اور بالکل وہی صورت تعلق جسم و روح کے پائی جائے گی جو دنیا میں تھی۔

اللہ تعالیٰ نے حشر کے مفہوم کو مختلف صورتوں سے سمجھایا ہے کسی جگہ ارشاد ہوتا ہے

واللہ انبتکم من الارض نباتا ثم یعیدکم فیہا ویخرجکم اخراجا

خدا نے تم کو اگایا زمین سے ایک قسم کا اگانا پھر تم کو اسی زمین میں لے جائے گا اور پھر اسی سے نکالے گا ایک قسم کا نکالنا۔

اس آیت میں خدا نے فرمایا ہے کہ ہم نے تم کو زمین سے اگایا ہے حالانکہ حقیقت یہ

ہے کہ انسان کو نطفہ سے پیدا کیا۔ یہ شبہ پیدا ہوتا ہے لیکن خدا کا ارشاد بالکل صحیح ہے کیونکہ ذی حیات چیزیں گو ارتقائی مدارج طے کرکے موجودہ حالت پر پہونچی ہیں لیکن اس میں تو کلام ہو ہی نہیں سکتا کہ ان کی وجہ حیات اصل میں وہی زمین اور اس کے تغیرات ہیں۔ کلام مجید میں جہاں اور آیتوں سے مسئلہ ارتقا ثابت ہوتا ہے وہیں ایک آیت یہ بھی ہے۔

اس لئے جس معنی میں پہلے انسان کا زمین سے پیدا کیا جانا بتایا گیا ہے اسی معنی میں دوبارہ اس کا زمین سے نکلنا ظاہر کیا گیا ہے۔ حقیقتاً نہ پہلے وہ کبھی زمین سے اگا اور نہ بعد میں کبھی زمین سے پیدا ہوگا۔ اس آیت میں نباتا اور اخراجا کے الفاظ خاص طور پر قابل غور ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگانے اور نکالنے سے معمولی صورت مقصود نہیں ہے بلکہ کسی خاص قسم کا اگانا اور نکالنا مقصود ہے اگر حشر میں انسان کی دوسری زندگی بالکل دنیا ہی کی سی زندگی ہوتی اور اسی جسم کے ساتھ ہوتی جس سے روح کو پہلے تعلق رہ چکا ہے تو نباتا اور اخراجا کے الفاظ ہرگز نہ استعمال کئے جاتے۔

علاوہ اس کے سورۂ واقعہ کی بعض آیتوں سے یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ انسان کے دوبارہ زندہ کئے جانے کی کیا حقیقت ہے اور حشر الاجساد سے خدا کا کیا مقصود ہے۔ سورۂ واقعہ میں پہلے منکرین حشر کا عقیدہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے

أئذا متنا وكنا ترابا وعظاما أئنا لمبعوثون — یعنی مرنے کے بعد جب مٹی اور ہڈی ہو جائیں گے تو پھر کیا اٹھیں گے۔

اس کے بعد دوبارہ پیدا کرنے کی حقیقت کو خدا اس طرح بیان کرتا ہے۔

نحن خلقناکم فلولا تصدقون افرأیتم ما تمنون ءانتم تخلقونہ ام نحن الخالقون
نحن قدرنا بینکم الموت وما نحن بمسبوقین علیٰ ان نبدل امثالکم وننشئکم فی ما لا تعلمون

ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ جب ہم نے اول اول تم کو پیدا کیا تو پھر کیوں تصدیق اس کی نہیں کرتے کہ دوبارہ بھی پیدا کر سکتے ہیں پھر جس طرح ہم نے تم کو پہلے پیدا کیا اور مار ڈالا اسی طرح ہم اس پر بھی قادر ہیں کہ مرنے کے بعد ہم تمہارے امثال و اوصاف کو بدل دیں اور ایسی صورت و حالت میں پیدا کریں جس کا تمھیں کوئی علم نہیں ہے۔

ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ مرنے کے بعد جو زندگی ہو گی وہ بالکل مختلف ہو گی اور بعث و حشر کی جو صورت ہو گی وہ کچھ اور ہی ہو گی جس کو ہم اس وقت نہیں سمجھ سکتے۔ "نبدل امثالکم ننشئکم فی ما لا تعلمون" سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اگر حشر انھیں یا ویسے ہی جسموں کے ساتھ ہوتا جو دنیا میں پائے جاتے تھے تو پھر "ما لا تعلمون" کے الفاظ ارشاد نہ ہوتے۔

حشر اجساد کے قائل سب سے بڑی اور زبردست دلیل جو اپنے پاس رکھ سکتے ہیں وہ سورۂ قیامہ کی یہ آیات ہیں۔

ایحسب الانسان ان لن نجمع عظامہ — کیا انسان گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں
بلیٰ قادرین علیٰ ان نسوی بنانہ — کو اکٹھا نہ کریں گے۔ ہم تو اس پر قادر ہیں کہ انگلیوں کی پور تک درست کر دیں۔

لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے حشر اجساد کیونکر ثابت ہو سکتا ہے۔ ان آیات میں خدا نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم ایسا کریں گے بلکہ صرف اپنی قدرت کا اظہار فرمایا ہے

کہ ہم ایسا بھی کر سکتے ہیں۔ اصل مقصود یہ تھا کہ پہلے منکرین بعث و حشر کے دل و دماغ میں خدا کی قدرت و عظمت کا خیال قائم کر دیا جائے اور پھر ان کو بتایا جائے کہ حشر و نشر کے بعد عذاب و ثواب کا جاری کیا جانا ناممکن نہیں ہے اور اس کے لئے خدا کو اختیار ہے جس صورت میں چاہے تمہیں تبدیل کر دے (جیسا کہ اس سے قبل کی آیت میں بتایا گیا ہے) سورۂ حج کی ابتدائی آیات بھی حشر اجساد کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں جن میں "ان زلزلۃ الساعۃ شیٔ عظیم" کہہ کر قیامت کی پیشین گوئی کی گئی ہے اور پھر انسان کی پیدائش، عہد طفلی، جوانی، ضعیفی اور موت کا ذکر کر کے اور سر زمین اور پھر بارش کے بعد اس سے نباتات کے اُگنے کا بیان کیا گیا ہے اور اس کے بعد مردہ کو زندہ کرنے کا دعویٰ کر کے ارشاد ہوتا ہے:۔

وان الساعۃ لاریب فیہا وان اللہ یبعث من فی القبور۔	مخصوص ساعت بیشک آنے والی ہے اور اللہ اٹھائے گا ان کو جو قبروں میں ہیں۔

بظاہر ان آیات سے بالکل کھلے طور پر انسان کا مع جسم کے قبروں سے اُٹھنا ثابت ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان آیات میں کہیں قیامت کا ذکر نہیں ہے بلکہ پیشین گوئی کی گئی ہے اس امر کی کہ رسول اللہ کے دشمن پامال ہوں گے اور آخر کار اسلام کی فتح ہوگی یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جن کی طرف سے ہدایت کی کوئی توقع نہیں ہے وہ بھی راہِ راست پر آجائیں گے "من فی القبور" سے وہ انسان مراد ہیں جو نہایت جہل و تاریکی میں مبتلا ہیں۔ کلام مجید میں اور جگہ بھی یہی مفہوم ان الفاظ سے لیا گیا ہے اور احیا سے صاحب ایمان اور اموات سے کفار مراد لئے گئے ہیں چنانچہ سورۂ فاطر میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وما یستوی الاحیاء والاموات۔ ان اللہ یسمع من یشاء وما انت بمسمع من فی القبور ان انت الا نذیر ؀ | یعنی زندہ اور مردے برابر نہیں ہو سکتے، اللہ جس کو چاہے سنا سکتا ہے اور تم ان کو نہیں سنا سکتے جو قبروں میں ہیں تم تو صرف اطلاع دینے والے ہو۔

نہ صرف اخیر کی آیت بلکہ ما قبل کی آیات سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہاں "من فی القبور" سے مراد کفار و فجار ہیں۔

کلام مجید میں یوم قیامت کے لئے اور بھی بہت سے لفظ استعمال کئے گئے لیکن ان میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ بعث و حشر و نشر و قیامت سے واقعی حشر اجساد مراد ہے۔ وہ لوگ جو معاد کے لئے حشر اجساد کو ضروری خیال کرتے ہیں ان میں زیادہ حصہ ان حضرات کا ہے جو صرف منقولات کو پیش نظر رکھتے ہیں اور بغیر کسی تاویل کے اس کو وہی سمجھنا چاہتے ہیں جو الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے اور کثر حصہ ایسے لوگوں کا ہے جو از روئے عقل بھی اس کو ضروری خیال کرتے ہوں لیکن انھوں نے اگر فلسفۂ لذت و الم پر غور کیا ہوتا تو وہ شاید حشر اجساد کو ضروری نہ قرار دیتے کیونکہ جسم انسانی صرف ایک آلہ ہے جس کے ذریعہ سے روح انسانی یا نفس انسانی تمام کام کرتا ہے اور آلہ کبھی مسئول و ذمہ دار شے قرار نہیں دیا جا سکتا۔ زندگی میں اعمال نیک و بد کا صدور حقیقتاً جوارح سے نہیں ہوتا بلکہ نفس و روح کے ارادہ سے ہوتا ہے اور مسرت و الم، لطف و تکالیف کا احساس بھی اسی کو ہوتا ہے، اس لئے اگر کوئی چیز مستوجب سزا یا جزا کی ہو سکتی ہے تو وہ روح انسانی ہے نہ کہ جسم انسانی۔ مرنے کے بعد جسم موجود رہتا ہے لیکن چونکہ نفس و روح کا تعلق اس سے باقی نہیں اس لئے

وہ بالکل بیکار چیز سمجھا جاتا ہے اور اسے کوئی حس نہیں ہوتی اس لئے حشر اجساد کے قائل وہی لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ روح انسانی اپنے احساس کے لئے جسم کی محتاج ہے اور ادراک محض نام ہے جوارح کے متاثر ہونے کا۔ حالانکہ ہمارا روز کا تجربہ اس کے منافی ہے۔ اگر حشر اجساد کو ضروری خیال کیا جائے اور اس کو صرف کرۂ ارض کے انسانوں تک محدود رکھا جائے تو اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں ایک تو یہ کہ مرنے کے بعد ہی اس کی قیامت کا آغاز مان کر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ وہ مرنے کے بعد ہی پھر اپنے جسم کے ساتھ اُٹھ بیٹھتا ہے لیکن اس کو حشر اجساد والے بھی تسلیم نہیں کرتے اس لئے لازم آیا کہ اس کے لئے اس قیامت کبریٰ کا انتظار کرنا پڑیگا جب یہ سارا کرہ تباہ ہوجائے گا اور کوئی متنفس زندہ نہ رہے گا۔ ایسا ماننے میں سب سے پہلا اعتراض یہ ہوگا کہ اسوقت تک کہ قیامت کبریٰ قائم ہو (جس کو ابھی اربوں سال کا زمانہ ہے) تمام وہ انسان جو آغاز عالم سے اس کی انتہا تک مرچکے ہوں گے کہاں اور کس عالم میں رہیں گے۔ اگر یہ اس وقت روحانی عالم میں رہیں گے تو اپنے اپنے اعمال کے مطابق راحت و تکلیف میں رہیں گے یا نہیں، اس سے انکار نہیں ہوسکتا کیونکہ اتنا بڑا زمانہ بیکار رنالم تعطل میں بغیر کسی احساس لذت و الم کے گزر جانا خلاف عقل ہے اور اگر اس کو تسلیم کیا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اگر اتنا طویل زمانہ عذاب و ثواب یا لذت و الم میں گزر سکتا ہے تو آئندہ بھی حشر اجساد کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

اس کے علاوہ اگر حشر اجساد کو ضروری قرار دیا جائے تو اس کے یہ معنی ہونگے

کہ دنیا کی شروع آبادی سے لے کر اس کے اختتام تک جتنے انسان پیدا ہو چکے ہیں سب کا حشر ہوا اور وہ سب کے سب اپنے جسموں کے ساتھ اٹھیں۔ پھر چونکہ جسم کے لئے مکان ضروری ہے اس لئے کھلی ہوئی بات ہے کہ ہم کے قیام کے لئے تمام اسی فضا کی ضرورت ہوگی جو دنیا میں پائی جاتی تھی اور اگر ایک ایک مردہ کے صرف کھڑے رہنے کے لئے ایک ایک فٹ زمین کی ضرورت ہو تو بھی اتنے آدمی پیدا ہو کر مر چکے ہیں اور آئندہ مریں گے کہ اگر لاکھوں کرۂ زمین ہوں تو بھی وہ کافی نہیں ہو سکتے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ حشر نشر کے لئے اور بہت سے کرّے تیار کئے جائیں گے لیکن آیا وہ اسی نظام شمسی کے تحت ہوں گے یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ نظام شمسی یہ نہ ہوگا کیونکہ کلام مجید میں کرۂ شمس کی بھی تباہی کا بیان ہے۔ اب اگر کوئی دوسرا نظام شمسی ہوگا تو حشر و نشر کے لئے جو کرّے بنائے جائیں گے وہ اسی شمس کے اجزاء ہوں گے جس سے وہ متعلق ہیں یا کسی اور کے۔ اگر وہ اسی کے اجزا ہوں گے تو ظاہر ہے کہ قابل آبادی بننے کے لئے اربوں سال ان پر پہلے گزر چکے ہونگے اور وہ اس وقت بھی موجود ہوں گے اور غالباً کیسی حالت میں ہوں گے۔ بہرحال اگر ہم اس کو تسلیم کرلیں کہ لاکھوں بلکہ کروڑوں کرّے اور حشر و نشر کے لئے مہیا ہو سکتے ہیں تو ہم کو ماننا پڑے گا کہ جس وقت کرۂ زمین تباہ ہوگی تو اس کے سارے مُردے اور لاکھوں کروں میں تقسیم کر دیئے جائیں گے جہاں وہ اپنا جسم لے کر اٹھیں گے اور چونکہ ان کروں میں یہ اہلیت ہوگی کہ انسان کی جسمانی آبادی کو اپنے اندر قائم رکھ سکیں اس لئے ضرورت ہے کہ ان میں بھی پہلے سے آثار حیات و آبادی پیدا ہو چکے

ہوں گے تو کیا زمین کے مردوں کے لئے وہاں کی آبادیوں کو فنا کر دینا پڑے گا اگر اس کا جواب اثبات میں ہوتا تو خلافِ عقل و انصاف ہے اور اگر نفی میں ہو تو پھر مردوں کی سمائی کیونکر ہو گی اور اگر ہم اسے بھی مان لیں کہ خدا محض حشر و نشر انسان کے لئے بہت سے خالی کرے پہلے سے تیار کر رکھے گا تو بھی اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ وہ کبھی کسی نہ کسی دن فنا ہوں گے اور انھیں کے ساتھ جنت و دوزخ فنا ہو جائیں گی، کیونکہ بہرحال عذاب و ثواب کا قصہ بھی انھیں کُروں میں ہوگا اور وہیں تمام درجات بہشت و دوزخ کے قائم کئے جائیں گے۔

الغرض حشر اجساد کے ماننے کے بعد ایک سلسلہ بہت سی خلافِ عقل باتوں کا قائم کرنا پڑے گا جن کی کوئی علمی توجیہ نہیں ہوسکتی، اگر یہ کہا جائے کہ خدا میں قدرت ہے کہ زمین ہی کو اتنا وسیع کر دے کہ سب مُردے اس میں سما جائیں اور پھر اس کو غیر فانی بنا دے تو کہنے والا یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ کیا خدا میں یہ قدرت نہیں ہے کہ بغیر جسم پیدا کئے ہوئے محض روحِ انسانی پر عذاب و ثواب کی کیفیات طاری کر دے۔ خدا کے تمام کام ایک خاص نظام کے تحت ہیں اور اس کی قدرت کا انتہائی منظر یہ ہے کہ وہ کبھی اس نظام میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا۔ اگر اس نے جسم کے لئے مکان کو ضروری قرار دیا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ جسم جب اور جہاں کہیں ہوگا اس کے لئے مکان کی ضرورت ہوگی اور یہ ناممکن ہے کہ حشر اجساد ہو اور مکان کی ضرورت نہ ہو۔ پھر مکان کے وجود کے لئے جو شرائط و اسباب خدا نے ضروری قرار دئے ہیں وہ ہمیشہ ہر مکان کے لئے ضروری رہیں گے اور ان میں کبھی تبدیلی پیدا نہیں ہوسکتی۔ الغرض حشر اجساد

ماننے کے بعد ایک لامتناہی سلسلہ خلاف عقل اور خلاف فطرت باتوں کا ماننا پڑتا ہے اور روحانی عذاب و ثواب کے تسلیم کرنے میں یہ بات پیدا نہیں ہوتی، اگر اجساد کے ساتھ عذاب و ثواب کی کوئی صورت ممکن ہو سکتی ہے تو وہ صرف تناسخ ہے اور حشر اجساد کے تسلیم کرنے سے کہیں بہتر یہ ہے کہ تناسخ کو تسلیم کیا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ کلام مجید میں دوزخ و جنت کا بیان اسی طرح کیا گیا ہے جیسے وہ کوئی مادی چیزیں ہوں لیکن اس بیان کو حقیقت سمجھنا سخت غلطی ہے۔ ان میں اکثر جگہ تو مقصود دنیا ہی کی کامیابی و ناکامیابی کو ظاہر کرنا ہے اور یہیں کے نعائم و لذائذ اور شدائد و مصائب کو خاص انداز سے بیان کیا ہے اور کہیں کہیں اگر یہ بیانات حیات بعد الموت سے متعلق ہیں تو صرف بطریق مجاز ہیں اور لوگوں کو سمجھانے کے لئے۔

عرب کے لوگ عورت، شہد، دودھ، سونا، چاندی اور جواہرات پر جان دیتے تھے اور ان کے نزدیک ان اشیاء سے زیادہ کوئی چیز محبوب تھی ہی نہیں، اس لئے اگر ان کی ترغیب کے لئے صرف یہ کہہ دیا جاتا کہ اچھے کاموں کا بدلہ ایک روحانی مسرت کی صورت میں دیا جائے گا تو وہ بالکل اس کو نہ سمجھتے اور کبھی اچھے کاموں کی طرف مائل نہ ہو سکتے۔ اسی طرح چونکہ وہ فطرتاً بہت سخت مزاج واقع ہوئے تھے اور لوگوں کو سزا دینے کے لئے آگ سے جلا دینا، گرم پتھروں پر لٹا دینا اور اسی طرح کی اور صورتیں اختیار کرنا معمولی بات تھی اس لئے ان کے سامنے دوزخ کا بیان اسی طرح کیا گیا کہ وہاں دہکتی ہوئی آگ ہوگی، اژدہے ہوں گے، انگارے کھانے پڑیں گے، خون پیپ پینا پڑے گا وغیرہ وغیرہ اگر ان سے یہ کہہ دیا جاتا کہ بُرے کاموں کے عوض تم روحانی عذاب مبتلا کئے جاؤ گے تو

ان پر کوئی اثر نہ ہوتا کیونکہ روح کے احساس شدید اور اس کے تاثر و تاذی کی حقیقت سے وہ بالکل ناواقف تھے. چاندی سونے، موتی اور ہیرے قدر تو دنیا میں ہے اور محض اس لئے کہ ان سے ہم کو کثیر مادی نفع پہونچ سکتا ہے لیکن مرنے کے بعد جب مادیت ... ہی ختم ہو جائے گا یہ چیزیں کیا لطف دے سکتی ہیں، شہد، دودھ خدا کی کوئی اتنی بڑی نعمت نہیں ہے کہ ساری چیزوں کو چھوڑ کر انھیں چیزوں کا انتخاب کیا جاتا لیکن چونکہ عرب کے نزدیک وہی سب سے زیادہ محبوب تھیں اس لئے اُن کو سمجھانے کیلئے ان کا ذکر کیا گیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اسلام صرف اہل عرب کے لئے تو نہیں تھا کہ ان کے ذوق کا خیال رکھا گیا تو اس کا جواب نہایت آسان ہے اور وہ یہ کہ جہاں خدا نے دوزخ جنت کی حقیقت کو امثال کی صورت میں بیان کیا ہے وہیں ان کی فلسفیانہ حقیقت کا بھی ذکر کیا ہے، چنانچہ ایک جگہ بہشت کی ماہیت اس طرح بیان ہوتی ہے :۔

فلا تعلم نفس ما اخفی لہم من قرۃ اعین جزاءً بما کانوا یعملون ۞	یعنی خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کے اعمال نیک کے عوض میں کونسی راحت مقرر کی گئی ہے۔

اسی طرح دوزخ کی آگ کی حقیقت کو یوں واضح فرمایا ہے :۔

"نار اللہ موقدۃ التی تطلع علی الافئدۃ" یعنی دوزخ وہ خدائی آگ ہے جو قلوب انسانی کے اوپر مستولی ہوگی۔

اگر دوزخ کی آگ سے مراد یہی ظاہری و معمولی آگ ہوتی تو کبھی ایسا ارشاد نہ ہوتا۔

اگر اسی کے ساتھ احادیث پر غور کیا جائے تو ہمیں ان سے بھی اسی حقیقت کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ کا ارشاد ہے :۔

قال اللہ تعالیٰ اعدت لعبادی الصالحین مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے نیک بندوں کے لئے وہ چیز تیار کی ہے جسے نہ انسانی آنکھ نے دیکھا، نہ کان نے سنا اور نہ کسی کے دل میں اس کا خیال گزرا۔

اگر جنت کی حوروں، شہد، دودھ کی نہروں سے واقعی وہی چیزیں مراد ہوتیں جو الفاظ سے ظاہر ہوتی ہیں تو ان میں سے کونسی چیز وہ ہے جس کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ نہ آنکھوں نے دیکھا اور نہ کانوں نے سنا ولا خطر علی قلب بشر، ظاہر ہے کہ وہ مادی دنیا کی چیز ہی نہیں ہے اور جس کا احساس دنیا سے جدا ہونے پر ہی ہو سکتا ہے، چونکہ انسان اس دنیا کے تجربات لذت والم سے آشنا ہو کر اس قدر تنگ خیال ہو گیا ہے کہ اس کی سمجھ ہی میں نہیں آسکتا کہ جسم سے مجرد ہونے کی حالت میں کیونکر راحت و تکلیف محسوس ہو سکتی ہے اس لئے کلام مجید نے بھی عموماً وہی انداز بیان اختیار کیا جس کو لوگ سمجھ سکتے لیکن چونکہ اسلام کو سارے عالم کا مذہب ہونا تھا اس لئے اہل فہم کے لئے کہیں کہیں وہ نکات بھی بیان کر دئے جو اہل عقل کے لئے باعث رشد و ہدایت ہو سکتے ہیں اور جو واقعی حقیقیات سے بحث کرتے ہیں۔

تفکر فی القرآن

(مسٹر رؤف احمد بی۔اے وکیل لکھنؤ)

میں نے آپ کے نگار ماہ جنوری ۱۹۳۶ء کو دیکھا اور اس میں آپ کا مضمون

بر جواب مضمون عبدالماجد صاحب دریابادی پڑھا جو متعلق وجود خضر ہے تھا۔ عبدالماجد صاحب کے مضمون میں حصہ تمہید سے آپ بہت ناراض ہو گئے اور اس کی تردید میں جو جو دلائل اور اصول بیان کئے ہیں انکو بالکل غلط مید پایا۔ جس طرح آپ نے ماجد صاحب کے نفس مضمون سے علیحدہ ہو کر اس کے صرف ایک حصہ سے بحث کی ہے اسی طرح میں بھی بقیہ تمام مسائل سے علیحدہ ہو کر صرف آپ کے دلائل پر انہیں کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں اور وہ اس واسطے کہ آپ نے جو اصول آزاد خیالی و تنقید مسائل مذہب بیان کئے ہیں ان سے مجھ کو اتفاق نہیں ہے۔

میں یہ تسلیم کرنے کو طیار ہوں کہ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہو گیا اور یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ ہم متقدمین کے نظریہ اور ان کی تحقیقات کو نظر انداز کر سکتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ اس کے خلاف معقول اور زبردست دلائل پیش کر سکیں محض یہ کہہ کر اکتفا کرنا کہ وہ "دفتر بے پایاں ہے" نہ ان کے "پشتاروں کی" اہمیت کو کم کرتا ہے اور نہ ان کی تردید۔

نیاز صاحب۔ معاف فرمایئے گا میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے جو غلو اور جوش اپنے اس مضمون میں ظاہر کیا ہے وہ صرف اس خیال سے جائز کہا جا سکتا ہے کہ آپ ایک ایسے اعتراض کا جواب دے رہے

تھے جو خاص کر آپ کی ذات کے خلاف لکھا گیا۔ ورنہ اگر میزان عقل میں اس کو رکھا جائے تو نتیجہ بالیوس کن ظاہر ہوگا۔ میں تسلیم کروں گا کہ آپ سب سے بڑے مجتہد ہو سکتے ہیں اور میں یہ بھی تسلیم کروں گا کہ آپ کی "فکر و تدبر" بمقابلہ تمامی متقدمین کے بالکل جدید اور حیرت انگیز معلومات دنیا کے سامنے پیش کر سکتی ہے لیکن بایں ہمہ میں یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوں کہ متقدمین کی کتابوں کا "پشتارہ" ایک دفتر بے معنی ہے اور نہ میں اتنا آزاد خیال ہوں کہ "ایک مسلمان کے نزدیک مندر کے ناقوس اور کلیسا کے گھنٹہ کو بھی ویسا ہی عزیز ہونا چاہئے جیسا کہ وہ اذان کو سمجھتا ہے"۔ میں حیران ہوں کہ اس نمونے کی سند آپ کو کہاں سے ہاتھ آئی۔ "اگر ضرورت ہو تو خود (ایک مسلمان کو) ناقوس پھونکنے میں کوئی عذر نہ ہونا چاہئے"۔ غالباً آپ کلام مجید سے اس کی سند پیش کر سکیں گے۔ میری رائے میں یہ تعلیم بالکل وہی ہے اگر ایک گال پر کوئی طمانچہ مارے تو دوسرا گال اس کے سامنے رکھ دینا چاہئے۔ جو بالکل فطرت انسانی کے خلاف عقل کے خلاف اور دنیا کے تجربات کے خلاف ہے۔ یہ مسئلہ آزمایا ہوا ہے لیکن تعجب ہے کہ آپ جیسے محقق کی سمجھ میں کیوں نہیں آیا کہ جب اذان دنا قوس کا مقصد بالکل ایک ہے جب ان دونوں سے مراد نمازیوں یا پجاریوں کو نماز یا پوجا کے لئے بلانا ہے تو پھر یہ نزاع و جدال کیسا؟

غرضکہ اسی طرح آپ نے بہت سے دعاوی ایسے پیش کئے ہیں جن کی نسبت بلا پس و پیش کہنے کو تیار ہوں کہ آپ کی فکر و تدبیر نے قرآن پاک کے سمجھنے میں غلطی کی۔ اگر یہ دریافت کر دوں تو غالباً مضائقہ نہیں کہ اگر آپ کا کلیہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہر مسلمان ناقوس بجانے کو تیار ہو جائے اور روہ نزاع و مجادلہ بھی جو آپ کی سمجھ میں نہیں آتا دور ہو جاوے تو پھر مذہب کیا چیز ہوگا اور پھر کونسا امر امتیازی ایک کو دوسرے مذہب سے علیحدہ کرے گا اور اگر ہوگا تو پھر قرآن پاک کی تعلیم اور دنیا کے کسی مذہب کی کتاب کو زیر بحث لانے کی کیا ضرورت۔ اگر تمام مذاہب صرف ایک منزل پر پہونچنے کے لئے متعدد راستے ہیں تو پھر "اپنی منزل" کے کیا معنی منزل تو عام ہے کوئی خاص نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ موجودہ زمانہ میں معقول کے بغیر صرف منقول سے کام نہیں چلتا لیکن کیا آپ نے یہ غور فرمایا کہ ایک ماہر فن کی رائے کو دوسرے غیر ماہر فن کی رائے پر خواہ آخر الذکر کتنی ہی زبردست فکر و تدبیر کیوں نہ رکھتا ہو ہمیشہ ترجیح دی جاتی ہے اور عقل بھی اس کو قبول کرتی ہے کہ اگر ایک شخص نے اپنی عمر کسی ایک امر کی جستجو اور اس کی تحقیق میں صرف کی تو اس کی رائے بمقابلہ اس شخص کے جس نے محض تفریحاً جب قلم اٹھایا اپنی خدا داد ذہانت کی امداد

سے دس پانچ ورق کاغذ کے سیاہ کرڈالے یقیناً مستحق زیادہ وزن اور اہمیت کی ہے۔ یہ تو آپ تسلیم کریں گے کہ دنیا کا مسلمہ مسئلہ ہے کہ کوئی قوم قابل عزت نہیں سمجھی جاتی اور نہ وہ قوم کہے جانے کے قابل سمجھی جاتی ہے اگر اس کے پاس کوئی اپنے اسلاف کے کارنامے موجود نہیں ہیں۔ دنیا میں ہزاروں قومیں وجود میں آئیں اور نیست و نابود ہوگئیں آج اسلاف کا نام تک کوئی نہیں جانتا۔ لیکن یونانیوں۔ رومیوں اور مسلمانوں کو کون بھلا سکتا ہے۔ یونانیوں کو اپنے متقدمین کے "پشتاروں پر" ناز ہے۔ رومیوں کے "پشتارے" آج بھی دنیا کی رہبری کر رہے ہیں۔ انگریزوں کو اپنے "پشتاروں پر" فخر ہے۔ مسلمانوں کے "پشتاروں" کی آج کل قدرشناس اور علم دوست دنیا قدر کرتی ہے۔ اگر ہم خود اس کی تذلیل روا رکھیں تو افسوس کا مقام ہے۔ پھر اگر یہ سوال کیا جائے تو آپ معاف فرمائیں گے کہ جناب کی "فکر و تدبر" نے احادیث و قرآن پاک کے سمجھنے میں جو کچھ معلومات بہم پہونچائی ہیں اس کا ذریعہ وہی دفتر بے پایاں تھا یا اس سے بے نیاز ہو کر کوئی جدید ذریعہ حاصل کیا تھا۔

"میں مانتا ہوں کہ اسلام بالکل سیدھا سادا مذہب ہے اور قرآن ہندوؤں کا وید نہیں ہے جس کا سمجھنا صرف پنڈتوں ہی کے لئے مخصوص ہو لیکن ساتھ ہی وہ قصۂ الف لیلیٰ یا فسانۂ عجائب بھی نہیں

ہے کہ ہر شخص بغیر سوچے سمجھے رائے زنی کرے (اس سے مقصود
یہ نہیں ہے کہ آپ جیسے محقق کو اس کا حق نہیں ہے) اگر آپ سیل
کی تصانیف کو ملاحظہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اسے قابل فلسفی
و مصنف بھی تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن کی تعلیم ایک فلسفہ ہے اور اس کے
نکات دقیق ہیں جو بغیر حقیقی فکر و تدبر کے حل نہیں ہو سکتے۔

آپ کے مضمون کو پڑھ کر میری رائے کم از کم یہ قائم ہوئی کہ
مذاہب کا اختلاف بالکل لغو ہے اور کسی کو کوئی خاص مذہب اختیار
کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص اپنے خیال و فکر کے مطابق اپنا مذہب
رکھ سکتا ہے اور اپنے لئے اصول وضع کر سکتا ہے لیکن تھوڑی
سی الجھن یہ باقی رہتی ہے کہ آپ خود شاید اس نظریہ کو تسلیم نہیں
کرتے ہیں اور اسلام و نصرانیت و مشرک و منکر کے درمیان امتیاز
قائم کرتے ہیں جیسا کہ خود آپ کے مضمون سے مترشح ہوتا ہے۔ تو پھر
یہ متضاد اصول کیوں؟ میں قطعاً عجز و انکسار سے برتائے رسم و رواج
سے کام نہیں لیتا بلکہ حقیقتاً عرض کرتا ہوں کہ میں نے عربی میں کوئی سند
حاصل نہیں کی اور نہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ قرآن پاک کے نکات سمجھنے میں فکر و تدبر کے
دعوے دار آپ زیادہ ہو سکتے ہیں یا ماجد صاحب اور نہ یہ کہہ سکتا
ہوں کہ مسلم و بخاری یا بیہقی و رازی کو آپ زیادہ آسانی سے
نظر انداز کر سکتے ہیں یا ماجد صاحب لیکن میں صرف اتنا چاہتا ہوں

کہ براہِ عنایت دوبارہ ٹھنڈے دل سے ان مسائل پر غور فرما کر ہم لوگوں کو جو کم مائگی کے معترف ہیں ایک صحیح مشورہ دیجئے کہ در حقیقت یہ قصہ کیا ہے لیکن گزارش یہ ہے کہ اس کے جواب میں غصے کام نہ لیجئے گا جس طرح ماجد صاحب کے خلاف آپ نے تحریر فرمایا ہے۔ میں اس تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں: منتظر ہیں آپ کے جواب کا انتظار کروں گا۔ اگر آپ کو موقع و فرصت ہو۔

آپ کے ایراد و اعتراض یا استفسار و استصواب کو میں نے کئی بار پڑھا اور ہر مرتبہ میں نے غور کیا کہ آپ نے میرے جس مضمون کا حوالہ دیا ہے اس میں واقعی کوئی "ذاتی" مناقشہ کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اور کیا حقیقتاً میں ان اصول سے ہٹ گیا ہوں جن کی میں نے اس وقت تک استفسارات کا جواب دینے میں ہمیشہ پابندی کی ہے!

قبل اس کے کہ میں بتاؤں کہ میرے اس غور کا نتیجہ کیا ہوا یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ "درک حقیقت" اور "رسائی کنہ راز" تو خیر بڑی چیز ہے علم و فضل کے کسی حقیر ترین شعبہ کے متعلق بھی میں وقوف کا دعویٰ نہیں کر سکتا چہ جائیکہ اس میں مہارت و عبور اور اسی طرح بالکل ایک حقیقت کی صورت میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ کسی شخص کے خلاف بغض و کینہ کی پرورش یا کسی کے طرز عمل سے متاثر ہو کر انتقام کی فکر کرنا بالکل میری فطرت کے خلاف ہے۔ اگر یہ صفت، صفات انسانی

میں محمود خیال کی جا سکتی ہے تو میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے اِس کے عطا کرنے میں میرے ساتھ بہت زیادہ فیاضی سے کام لیا ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جس طرح میں اپنے آپ کو "حقائق عالم" "نوامیس فطرت" اور نکات قدرت کے سمجھنے کا نا اہل پاتا ہوں اسی طرح یہ بھی پورا یقین رکھتا ہوں کہ اس وقت تک کوئی بھی ان کا عالم پیدا نہیں ہوا ہے اور انسانی علم کی انتہائی پرواز اس سے زیادہ نہیں کہ وہ اپنے جہل کا اعتراف کرے۔ اس لئے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ کوئی شخص میری تکذیب کرنا چاہتا ہے اس پندار کے ساتھ کہ جو کچھ اس نے سمجھا ہے وہی صحیح ہے تو مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اس خیال سے نہیں کہ اس نے مجھے کیوں نا اہل، نا قابل، جاہل و عامی سمجھا بلکہ صرف اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو کیوں ماہر حقیقت سمجھتا ہے جب کہ اس باب میں ہم اور وہ دونوں ایک ہیں۔ کسی انسان کا خواہ کتنا ہی بڑا محقق و فاضل کیوں نہ ہو ایک لمحہ کے لئے بھی یہ سمجھ لینا کہ اس کا علم صحیح ہے۔ میرے نزدیک اتنا بڑا شرک ہے کہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ علی الخصوص مذہب کے معاملہ میں کہ جہاں جبر و اکراہ کا کام ہی نہیں۔ میں نے قدما کے "پشتاروں" کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اب بھی اس کا اعادہ کرتا ہوں اور میرے نزدیک اسلام نام اس بلندی نظر، اس وسعت آغوش کا ہے جو نا قوس، اذان، مسجد و کلیسا کی پابندی و امتیاز سے بہت زیادہ بلند چیز ہے۔ پھر میں یہ نہیں کہتا کہ آپ بھی اس کو تسلیم کریں لیکن میرا مسلک یہی ہے اور میں اس باب میں کسی کا مقلد نہیں ہوں۔ مذہب اگر کوئی اختیار کروں گا تو خود سمجھ کر کسی کے سمجھانے سے نہیں۔ اپنی فہم کی بنا پر ابو حنیفہ

یا شامی کی تحقیق سے نہیں۔

اب رہا آپ کا یہ اعتراض کہ اگر مذہب میں اس قدر آزادی ہو تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ہر شخص اپنے فکر و خیال کے مطابق اپنا مذہب قائم کر سکتا ہے لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ اگر ایسا ہو بھی تو کیا حرج ہے۔ آپ نے اس سلسلہ میں اس مضرت رساں پہلو کو واضح نہیں کیا جو غالباً آپ کے پیش نظر تھا یعنی یہ کہ اس صورت میں مسلمانوں کی اجتماعیت باقی رہے گی اور شیرازۂ قومی منتشر ہو جائے گا لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا مذہبیت اور قومیت کے شیرازہ سے انسانیت کا رابطہ زیادہ وسیع نہیں ہے اور کیا وجہ ہے کہ آپ رشتۂ قوم و مذہب یا رابطۂ وطن کو تو ضروری سمجھتے ہیں اور اپنی نگاہ کو زیادہ وسیع کر کے اس تعلق کو سامنے نہیں رکھتے جس میں تمام نوع انسانی شامل ہو سکتی ہے اور جو حقیقی ذریعہ امن عام پیدا کرنے کا ہے۔

میں نے جہاں تک اسلام کی تعلیم پر غور کیا ہے اس میں کوئی تنگ نظری ایسی نہیں پائی جیسی آج کل مسلمانوں میں پائی جاتی ہے کیونکہ اس نے عوائد و مراسم کی بیخ کنی کر کے صرف اخلاق کی تعلیم دی ہے اور بتایا ہے کہ حقیقتاً مسلمان وہی ہے جس کے اخلاق پاکیزہ ہوں۔

سب سے پہلی غلطی جو مذہب کے باب میں لوگوں سے ظاہر ہوتی ہے وہ کفر و اسلام شرک و توحید کے مفہوم کے امتیاز میں ہوتی ہے اور چونکہ یہ غلطی صدیوں سے چلی آ رہی ہے اس لئے اس کا دور ہونا آسان نہیں ہے تاہم چونکہ اس وقت بات آ پڑی ہے اس لئے میں مجبور ہوں کہ مختصراً اس مسئلہ پر یہاں روشنی ڈالوں۔ انسان

وخدا یا خالق ومخلوق کا جس حد تک یا جیسا تعلق ہے اس کو دیکھتے ہوئے کوئی شخص اس امر سے انکار نہیں کرسکتا کہ خالق یا خدا کی ذات بالکل بے نیاز ہے اور مخلوق یا انسان کی کوئی بدعنوانی، کوئی نامعقولیت یہاں تک کہ بتوں کا پوجنا بھی اس کو کوئی مضرت نہیں پہونچا سکتا۔ نہ اس کی برہمی انسان کی سی برہمی ہے کہ اس کے جذبات کو ٹھیس پہونچتی ہے اور وہ خفا ہو جاتا ہے اور نہ اس کی مسرت ہماری مسرت ہے کہ کوئی امر مفید کسی سے ظاہر ہوا اور ہم اس سے خوش ہو گئے۔ چونکہ خدا کی ذات ہمارے فلسفۂ مسرت والم سے بلند ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اس کی خوشنودی یا برہمی کا مفہوم بھی کچھ اور ہوگا پھر جب اس مفہوم کی جستجو کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے جس امر کو اپنی خوشنودی سے تعبیر کیا ہے وہ حقیقتاً ہماری بہتری سے متعلق ہے اور جس امر کو وہ اپنی برہمی سے تعبیر کرتا ہے اس کا واسطہ ہماری مضرت سے ہے۔ اس لئے ظاہر ہوا کہ خدا کا منشا صرف یہ ہے کہ انسان اپنے فلاح و اصلاح کی تدابیر اختیار کرے جیسا کہ "ان اریدالا صلاح" سے ثابت ہوتا ہے اور ان مکارم اخلاق سے اپنے آپ کو آراستہ کرے جو تمام نوع انسانی کی ترقی کا باعث ہوتے ہیں۔ اب آپ اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر کفر واسلام، شرک و توحید کے مفہوم پر غور کریں گے تو آسانی سے یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ اسلام و توحید نام ہے صرف "استقامۃ فی العمل" کا، بلندی اخلاق کا، اخوت عامہ کا اور کفر و شرک کہتے ہیں نظم و نسق سے منحرف ہو جانے کو، ترک عمل کو، انحطاط اخلاق کو، تشتت وافتراق کو، فرقہ بندی کو، تفریق جامعۂ انسانیت کو اور انسانی اجتماعیت کے خراب کرنے کو۔

کلام مجید کی یہی تعلیم ہے اور رسول چونکہ اسی مقصد کے پورا کرنے کے لئے آئے تھے اسی لئے ان کو "کافۃ للناس" اور "رحمۃ للعلمین" کے لقب سے یاد کیا گیا۔

رسول نے فرقہ بندی کے خلاف اور تفریق مذاہب کے بجائے "اخوت عامہ" کے موافقت میں جو کچھ کیا یا کہا اس کا ثبوت خود کلام مجید سے ملتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:۔

قل آمنا باللہ وما انزل علینا علی ابراہیم واسماعیل واسحاق ویعقوب
والاسباط وما اوتی موسیٰ وعیسیٰ والنبیون من ربہم۔ لا نفرق بین احد
منہم ونحن لہ مسلمون ۝

پھر کیا نبیوں میں آپ رام، کرشن، بودھ، کنفیوشس وغیرہ کو شامل نہیں کرتے کیا ان کی نبوت سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے "ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولا" (ہم نے ہر امت میں کوئی نہ کوئی نبی مبعوث کیا) ارشاد خداوندی ہے۔ پھر اگر ایسا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ "ونحن لہ مسلمون" میں دنیا کے تمام ممالک و مذاہب کو شامل نہ کیا جائے۔

کلام پاک کے متعدد مقامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ منشاء خداوندی یہی ہے کہ ساری دنیا ایک امت، ایک جماعت ہو کر زندگی بسر کرے اور جو لوگ اپنے عمل سے اس کی مخالفت کرتے ہیں وہ حقیقتاً فطرت کی مخالفت کرتے ہیں۔

"ولو شاء اللہ لجعلکم امۃ واحدۃ ولکن یضل من یشاء ویہدی من یشاء
ولتسئلن عما کنتم تعملون ۝"

یہاں "ولو شاء اللہ" کے معنی یہ نہیں ہیں کہ "اگر اللہ چاہتا" بلکہ مفہوم یہ ہے کہ خدا

کے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ تم سب کو ایک امت بنادے لیکن وہ گمراہ کر دیتا ہے اس کو جو اپنی گمراہی چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے اس کو جو اپنی ہدایت چاہتا ہے، لیکن اے لوگو تم مطمئن نہ ہو خدا تم سے ضرور باز پرس کرے گا تمھارے افعال واعمال پر اور تم سے پوچھے گا کہ کیوں تم نے ہدایت کے مقابلہ میں گمراہی کو اختیار کیا اور کیوں تم نے اپنے عمل سے، اپنی وسعتِ نظر سے، اپنی روا داری سے اور اپنے اصول زندگی سے اُس اخوت عامہ کو دنیا میں پیدا نہیں کیا جو خدا کے نزدیک محبوب ہے۔

"یضل من یشاء" اور "یہدی من یشاء" کے معنی بھی بعض مفسرین اور مترجمین نے صحیح نہیں کئے ہیں۔ اس کا ترجمہ عام پر یہ کیا جاتا ہے کہ "اللہ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے" یعنی انھوں نے یشاء کا فاعل اللہ کو قرار دیا ہے۔ حالانکہ حقیقتاً "یشاء" کا فاعل "من" ہے اگر آپ یہ معنی مراد نہ لیں تو پھر "ولتسئلن عما کنتم تعملون" بالکل بیکار ہو جائے گا، کیونکہ جب ہدایت و گمراہی خدا داد بات ہوگئی تو باز پرس کیوں اور کس سے؟

کلام پاک میں اسلام کے صحیح مفہوم کو ایک جگہ نہایت ہی پاکیزہ انداز میں بیان فرمایا ہے اور اس کی وسعت و ہمہ گیری کو ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے۔

صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ ونحن لہ عابدون ۝

یعنی اے رسول لوگوں سے کہہ دو کہ ایمان و اسلام جس چیز کا نام ہے وہ تو وہی اتحاد و یکرنگی ہے جسے ہم خدائی رنگ کہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس رنگ سے بہتر

کون رنگ ہو سکتا ہے۔ اس لئے اسلام کی دعوت جن مختصر الفاظ میں کی گئی ہے اور جس آسانی کے ساتھ تمام افتراق وانتشار کو مٹانے کی کوشش کی گئی وہ یہ تھی کہ

"قل یا اہل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشہدوا بانا مسلمون ۰"

پس اسلام نام ہوا صرف اس کا کہ سوائے ذات خدا کے اور کسی کی عبادت نہ کی جائے اور نہ کسی اور ہستی کو اس کا مقابل سمجھا جائے۔ یہ تعلیم اس قدر سادہ، اس درجہ آسان اور ایسی قریب الفہم ہے کہ گمراہ سی گمراہ قوم بھی اس کی مخالفت نہیں کر سکتی۔

ایک سوال اس جگہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ خدا کو اپنی عبادت کرانے کا کیوں اس قدر شوق ہے اور وہ شرک وکفر، جحود وانکار سے کیوں اس قدر برہم ہوتا ہے اور میرے خیال میں اسی کے سمجھنے پر نہ صرف اسلام بلکہ تمام مذاہب کے سمجھنے کا انحصار ہے۔

یہ پہلے عرض کر چکا ہوں ہے کہ خدا کی ذات اس تاثر سے بے نیاز ہے جو ایک انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور اس لئے اس کی برہمی یا خوشی کا مفہوم انسانی مضرت ومنفعت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ انسان کا خواہ انفرادی حیثیت سے ہو یا اجتماعی لحاظ سے کسی ایسے امر کا مرتکب ہونا جو اخوت عامہ کو صدمہ پہونچانے والا ہو، جو اجتماعیت عالم کو برباد کرنے والا ہو، وہی شرک وکفر ہے، وہی جحود وانکار ہے، وہی بت پرستی ہے اور ہر وہ چیز جس کو غیر خدا کی پرستش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کیونکہ ایسا کرنا منشاء خداوندی کے منافی ہے اور کسی کے منشاء وحکم کے خلاف کرنا اس کی اہمیت سے انکار کرنا، اس کے وجود کو نظر انداز کر دینا اور اس کی مخالفت پر آمادہ ہونا ہے۔

اسی پر آپ اسلام و توحید کے مفہوم کا بھی قیاس کر سکتے ہیں، ورنہ ظاہر ہے کہ نہ اذان سے خدا کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے نہ ناقوس سے کوئی نقصان، نہ مسجد سے خدا کو کوئی راحت ملتی ہے نہ کلیسا اور مندر سے کوئی تکلیف۔ اگر ایک شخص غیر مسلم (یعنی موجودہ جماعت اسلامی کا فرد نہ ہونے) کے باوجود تمام انہیں مکارم اخلاق اور محاسن فطرت سے آراستہ ہے جن کی محمدؐ نے تعلیم دی ہے تو کیا آپ کو صرف اس لئے کہ وہ آپکی جماعت میں شامل نہیں ہے کافر و مشرک کہہ کر ناری و جہنمی کہدیں گے اور دوسرا شخص جو آپ کی جماعت کا فرد ہے لیکن حد درجہ ظالم، بیرحم، مجرم اور شقی ہے اس کو صرف اس بنا پر کہ اس نام بھی آپ ہی کی طرح ہے، آپ کے اعزہ میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ اس کو نجات و فردوس کا پروانہ دیدیں گے۔

ایک بے رحم قزاق قافلہ کے قافلہ کو تباہ و برباد کر کے متعدد بے گناہ جانوں کے خون سے اپنے ہاتھ کو رنگین کر کے فارغ ہوتا ہے کہ دفعتہً مغرب کی اذان ہوتی ہے، وہ فوراً اپنے ہاتھ اور دامن سے خون کے دھبے دور کر کے نماز میں مشغول ہوجاتا ہے، دوسرا شخص جو تمام دن دھوپ میں محنت شاقہ برداشت کر کے اپنے متعلقین کیلئے حلال روزی فراہم کرتا ہے، گاؤں کے بچوں، بوڑھوں یتیموں، بیواؤں کی خدمت کے لئے اپنی محنت، دولت، زندگی سب کچھ وقف کئے ہوئے ہے لیکن شام کو وہ نماز پڑھنے کے بجائے ناقوس پھونکتا ہے، مسجد میں جانے کے بجائے وہ مندر کا رُخ کرتا ہے۔

اب آپ ایک مسلمان مولوی سے ایک متعصب مدعی اسلام سے دریافت

کیجئے، وہ نہایت آزادی سے بلاپس وپیش کہدے گا کہ بہرحال اس قزاق کو نجات ملی کیونکہ وہ مسلمان ہے اور اس دوسرے کو آخرکار دوزخ میں جاتا ہے کیونکہ اس نے بت پرستی کی اور اسلام کو قبول نہیں کیا۔

پھر اگر اسلام نام اسی وسعت نظر و انصاف کا ہے، اگر صراط مستقیم اسی کو کہتے ہیں اگر یہ واٰمرہم بالقسط کا یہی مفہوم ہے، اگر دین محمدی کا یہی مدعا ہے تو میں مشورہ دوں گا کہ آئیے آپ بھی میرے ساتھ کافر ہو جائیے کیونکہ پھر تو خدا کفر ہی میں تلاش کرنے سے ملے گا۔

مسلمانوں کا یہ یقین کر لینا کہ خدا صرف ہمیں کا ہے اور دوسری قوموں کو اس نے صرف دوزخ کا ایندھن بنانے کے لئے پیدا کیا ہے ایک ایسا لغو و مہمل اعتقاد ہے جو کسی ذی فہم کے نزدیک قابل قبول نہیں ہو سکتا اور نہ اس تعلیم کے ساتھ ہم کسی کو اپنی طرف مائل کر سکتے ہیں۔ اسی لئے میں نے کہا کہ جہاں تک نفس تعلیم مذہب کا تعلق ہے مسجد و کلیسا ناقوس و اذان میں کوئی فرق نہیں ہے، اگر دونوں جگہ مقصود خدا کی عبادت اور اصلاح اعمال ہے یقیناً میں ناقوس پھونکنے کے لئے آمادہ ہوں اور ناقوس پھونکنے ہی کو اسلام سمجھوں گا اگر اس سے میرے اخلاق پر کوئی اچھا اثر پڑے۔

آپ جب تک اس رواداری سے کام نہ لیں گے جس وقت تک خیال میں یہ وسعت نہ پیدا ہو گی آپ کیوں کر دوسروں سے توقع کر سکتے ہیں کہ وہ آپ کی جماعت میں شریک ہو جائیں گے۔ آپ تو ناقوس کی آواز سن کر لاحول پڑھنے لگیں لیکن دوسرا آپ کی اذان سن کر سربسجود ہو جائے، باجہ بجانا چھوڑ دے کیوں؟ آپ میں آخر وہ کون سی خصوصیت ہے جس نے آپ کو خدا کا بیٹا بنا دیا اور دوسرے کو گروہ شیطان کا

لاغوت میں داخل کر دیا آپ کیوں خدا کی ذات کو اپنے اندر محدود دیکھتے ہیں، اس کی صفت خلق و ربانیت کو اپنے لئے کیوں مخصوص جانتے ہیں، بحیثیت انسان ہونے کے ہر شخص خواہ عیسائی ہو یا ہندو، جینی ہو یا بودھ، معتزلی ہو یا اشعری، ناصبی ہو یا خارجی، شیعہ ہو یا سنی خدا کے نزدیک ایک ہے اس کا وہی ایک مطالبہ سب سے ہے، پھر جو اس کو پورا کرے گا خدا اسی کو ترقی و فلاح دے گا اور جو اسے ترک کرے گا خدا بھی اس کو چھوڑ دے گا۔

بیشک یہ میرا ایمان ہے کہ مذہب اسلام یعنی وہ مذہب جسے محمدؐ نے پیش کیا ہے یقیناً بہترین ذریعہ تصفیۂ اخلاق اور تزکیۂ نفس کا ہے اور اس لئے ہر انسان کا فطری فرض ہے کہ وہ اس مذہب کو اختیار کرے لیکن میں اس کی تعلیم و اشاعت کو اس طرح پسند نہیں کرتا کہ دوسرے مذہب کو برا کہوں جبکہ مذہب ہونے کے لحاظ سے وہ بھی سب سچے ہیں۔

آپ اگر ایک ہندو کو تعلیم اسلام دینا چاہتے ہیں تو آپ کا فرض یہ نہ ہونا چاہئے کہ اس کے ارکان پر ناک بھوں چڑھائیں، اس کی طریق عبادت پر نکتہ چینی کرنے لگیں، بلکہ طریقہ یہ ہونا چاہیئے کہ آپ اس کو نفس مقصود مذہب سے آگاہ کر کے آمادہ کریں کہ وہ اپنے طریق مذہب کے ساتھ ہی ساتھ اسلام کو بھی دیکھے اور خود فیصلہ کرے کہ منزل تک پہونچانے کا سب سے زیادہ آسان اور سیدھا راستہ کونسا ہے اور میری رائے میں "جادلہم بالتی ہی احسن" کا یہی مفہوم ہے۔

آپ اگر اپنی حرمت چاہتے ہیں تو دوسروں کی حرمت کیجئے یہ عام اصول اخلاق کا ہے۔ اس لئے اگر آپ اپنے مذہب کا وقار قائم کرنا چاہتے ہیں تو دوسرے مذاہب کی

بھی عزت کیجئے۔ اسلام تلوار سے نہیں پھیلا اور نہ طاقت جبر سے کوئی مذہب شائع ہو
ہو سکتا ہے۔ تلوار ایک آدمی کا نام تو بدل سکتی ہے، وضع و معاشرت میں تبدیلی پیدا کر سکتی
ہے لیکن دل کو نہیں پھیر سکتی، دماغ کو مجبور نہیں کر سکتی، اطمینانِ نفس، طمانیتِ روح، لطف
و راحت، محبت و شفقت ہی سے حاصل ہو سکتی ہے جس کے ثبوت میں اسوۂ نبوی آپ کے
اور ہمارے سب کے سامنے موجود ہے اور یہ چیز مسلمانوں کے پاس ایسی عظیم المرتبت
ایسی جلیل القدر ہے کہ اس کے سامنے سوائے سر جھکا دینے کے اور کوئی چارہ کار
نہیں۔ پھر کتنی حیرت کی بات ہے کہ جو حقیقی دولت آپ کے پاس ہے اسے تو پیش نہیں
کرتے۔ دکھاتے ہیں عزت، پیسوں کو اور دنیا کو مجبور کرتے ہیں کہ انہیں کو جواہر پارے سمجھے

پھر چونکہ یہ تنگ نظری نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ اب کے تمام مذاہب کے مقلدین
میں پائی جاتی ہے اس لئے جو اعتراض میرا اہل اسلام پر ہے وہی ہندوؤں پر ہے
اور وہی دوسرے مذہب والوں پر۔ نہ ہم میں رواداری، نہ ان میں۔ نقصانات نہ ہم
صراط مستقیم پر، نہ وہ راہ راست پر، منزل سے بعید ہونے میں سب کا ایک درجہ ہے
اور گمراہی میں مبتلا ہونے کے لئے سب یکساں طور پر حریص ہیں

یہ ہے میرا اعتقاد و عقیدہ مذہب کے متعلق جسے میں نے صاف صاف الفاظ میں ظاہر
کر دیا اور اگر متقدمین کی تعلیم اس کی منافی ہو تو میں اس کے ماننے کیلئے تیار نہیں بالکل اسی طرح
جس طرح میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتا کہ آپ میرے قول کو صحیح سمجھ لیں لیکن اگر موجودہ حالت
قائم رہی اور رہے گی تو دیکھئے کہ ایک زمانہ آئے گا جب تمام مذاہب محو ہو جائیں گے اور
پھر وہ وقت تجدید اسلام و احیاء دین محمدی کا ہوگا۔

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

سامری

(بہ جواب استفسار سلطان احمد خانصاحب انٹر کالج مسلم یونیورسٹی علیگڈھ)

آپ نے جناب سامری کے حالات دریافت کئے ہیں اور اس کی ساحری کی حقیقت دریافت کی ہے حالانکہ یہ نہ کسی شخص کا نام تھا اور نہ وہ کوئی ساحر تھا۔ کلام مجید میں ایک ہی سورۃ (طٰہٰ) میں تین جگہ لفظ سامری استعمال ہوا ہے۔ اول دو جگہ یہ لفظ الؔ کے ساتھ آیا ہے یعنی (السامری) اور تیسری جگہ صرف سامری بغیر الؔ کے۔ چونکہ عربی زبان میں الؔ معرفہ یا کسی کے نام کے ساتھ نہیں استعمال ہو سکتا اس لئے یہ امر ظاہر ہے کہ وہ کسی شخص خاص کا نام نہ تھا۔ تیسری جگہ اس کو معرفہ کی صورت سے بغیر الؔ کے اس لئے استعمال کیا کہ اول تو اس میں یائے نسبت ہونے کی وجہ سے بغیر الؔ کے بھی وہ معرفہ کے معنی دیتا ہے اور دوسرے اس لئے کہ پہلے دو جگہ اس لفظ کا تعارف اس کی اصلی حالت میں ہو چکا تھا اور اب اس تعریف و تخصیص کی وجہ سے اس نے گویا علم کی صورت اختیار کر لی تھی۔ بہرحال سامری کسی شخص کا نام نہ تھا بلکہ اس سے ایک شخص اہل سامرہ کا مراد تھا۔ سامرہ ایک نہایت قدیم قوم تھی جو بابل اور ایران کی حکومت میں یہودیوں کے دوش بدوش پائی جاتی تھی۔ عہد موسیٰ میں گو یہ بظاہر شریعت موسوی کے پابند تھے لیکن حقیقتاً وہ کسی پیغمبر کے قائل نہ تھے اور جب موقع ملتا تھا فساد پھیلایا کرتے تھے۔

جب تک موسیٰ اپنی قوم میں رہے اہل سامرہ کو کوئی موقع گمراہ کرنے کا نہیں ملا، لیکن جب وہ پہاڑ پر چلے گئے تو اہل سامرہ میں سے کسی ایک نے جس کے لئے السامری کا لفظ استعمال ہوا ہے موسیٰ کی قوم کو بہکا کر ایک بچھڑا تیار کر دیا اور یہ لوگ اس کی پرستش کرنے لگے جب حضرت موسیٰ الزاح لے کر پہاڑ سے واپس آئے اور یہ رنگ دیکھا تو بہت برہم ہوئے بچھڑا بنانے کا سبب یا تو یہ تھا کہ اہل سامرہ کے آباد اجداد خود۔ یاربعام" بادشاہ کے زمانہ میں بچھڑے کی پرستش کرتے تھے یا یہ کہ اس وقت مصر میں خود ایک بت نیوس نامی بچھڑے کی صورت کا تھا بیل نے اعتراض کیا ہے کہ اس وقت اس قوم کا نام سامرہ تھا ہی نہیں اس لئے سامری کو اہل سامرہ سے کہنا صحیح نہیں لیکن یہ اعتراض بالکل لغو ہے کیونکہ جس وقت کلام مجید نازل ہوا ہے اس سے بہت قبل اس جماعت کا نام سامرہ پڑ گیا تھا اور اس لئے کلام مجید میں جن الفاظ کو یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ اسی وقت کے تھے نہ کہ عہد موسوی کے۔

کلام مجید میں اس واقعہ کا بیان حقیقتاً دو باتوں کی تغلیط کے لئے کیا گیا، ایک تو یہ کہ توریت میں ہارون ہی پر بچھڑا بنانے کا الزام عاید کیا گیا تھا اس کو دفع کیا گیا کہ بچھڑا بنانے والا ایک شخص اہل سامرہ کا تھا ہارون نہ تھے اور دوسرے یہ کہ بچھڑے میں کوئی نمائش ساحری نہ تھی جیسی کہ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ حقیقتاً بولنے لگا تھا۔ بلکہ اس سے صرف ایک آواز پیدا ہوتی تھی جو بچھڑے کی آواز سے ملتی جلتی تھی کلام مجید میں اس کے لئے لفظ خوار آیا ہے جو گائے وغیرہ کی آواز کے لئے استعمال ہوتا ہے۔
بعض مترجمین نے اس کا ترجمہ کھوکھلی آواز کیا ہے جو میرے نزدیک درست نہیں کیونکہ

عربی میں عام طور پر "خار البقر" بمعنی خار البقر استعمال کیا جاتا ہے لیکن کلام مجید سے یہ امر کہیں واضح نہیں ہوتا کہ واقعی بچھڑے میں جان پڑ گئی تھی اور وہ اصلی بچھڑے کی طرح بولنے لگا تھا کلام مجید کے الفاظ یہ ہیں۔

"فاخرج لہم عجلاً جسداً لہ خوار" یعنی اس نے ایک بچھڑا اس ترکیب سے بنایا تھا کہ اس کے جسم سے واز پیدا ہوتی تھی۔ چنانچہ بعض اکابر مفسرین نے تو لکھا ہے کہ یہ بچھڑا اندر سے کھوکھلا اس ترکیب سے بنایا گیا تھا کہ جب ہوا اس کے اندر سے ہو کر گزرتی تھی تو ایسی آواز پیدا ہوتی تھی۔ بچھڑے کے متعلق عام طور پر ایک روایت مشہور ہے کہ سامری نے جبرئیل کو گھوڑے پر سوار جاتے ہوئے دیکھ کر اس کے پاؤں تلے کی مٹی لے لی اور بچھڑے میں ڈال دی جس سے اس میں جان پڑ گئی اور وہ بولنے لگا اور روایت کی بنیاد خود کلام مجید کو بنایا جاتا ہے کیونکہ جب حضرت موسیٰ نے سامری سے پوچھا کہ "فما خطبک یا سامری" "یہ امر مکروہ[1] تو نے کیا کیا؟ تو اس نے جواب دیا کہ "بصرت بما لم یبصروا بہ فقبضت قبضۃ من اثر الرسول فنبذتہا وکذالک سولت لی نفسی" عام طور پر اس کا مفہوم یہ بتایا جاتا ہے کہ "میں نے وہ دیکھا جو اور لوگ نہیں دیکھ سکتے اور میں نے فرشتہ کے نشان قدم سے ایک چٹکی مٹی کی لے کر بچھڑے میں ڈال دی اور اس طرح میرے نفس نے مجھے دھوکا دیا" اب یہاں لوگوں میں اختلاف ہے

---

[1] بعض مترجمین نے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ "اے سامری تیرا کیا مقصد تھا لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ عربی زبان کا محاورہ ہے کہ جب کسی سے کوئی امر مکروہ سرزد ہو جاتا ہے یا کوئی نامعقول حرکت کر کے مصیبت اپنے سر مول لے لیتا ہے تو کہتے ہیں "ما خطبک" مولانا محمد علی (قادیانی) نے بھی غلط ترجمہ کیا ہے۔

کہ آیا رسول سے مراد خود حضرت موسیٰ ہیں یا جبرئیل لیکن حقیقتاً نہ اس نے موسیٰ کے نشان قدم سے مٹی اٹھائی نہ جبرئیل کے گھوڑے کے نشان پا سے یہ تبرک حاصل کیا بلکہ اس آیت کا مطلب ہی کچھ اور ہے۔ سامری کا مقصود صرف یہ کہنا تھا کہ میرا نقطۂ نظر اور لوگوں کے نقطۂ نظر بالکل جدا تھا اور میں نے صرف برائے نام آپ کی پیروی کی تھی جس کو چھوڑ بیٹھا اور اس طرح نفس نے مجھے دھوکا دیا۔ اثر الرسول سے سنت رسول یا سنتِ موسیٰ مراد ہے۔ اس لئے "فقبضت قبضۃ من اثر الرسول" کے معنی یہ ہوئے کہ میں نے سنت رسول میں سے صرف تھوڑا سا حصہ اختیار کیا تھا (یعنی پورے طور پر ایمان نہ لایا تھا) اور بعد کو جب آپ پہاڑ پر چلے گئے تو اس کو بھی ترک کر دیا (فنبذتہا) اور یہ میرے نفس کا دھوکا تھا۔

بہرحال کلام مجید سے نہ سحر سامری ثابت ہوتا ہے اور نہ سامری کسی خاص شخص کا نام اس لئے آپ کے سوال کے ایک حصہ کا جواب تو ہو گیا۔ اب رہا دوسرا حصہ کہ ساحری کی حقیقت کیا ہے اور اس وقت اس کا وجود پایا جاتا ہے یا نہیں، یہ ذرا تفصیل طلب امر ہے اور فرصت مفقود، تاہم کوشش کروں گا کہ ایک حد تک آپ کو اس مسئلہ میں بھی مطمئن کر دوں۔

مسئلہ سحر میں تین طرح بحث کی ضرورت ہے، تاریخ مذہب اور علم یعنی تاریخ کے روایات اس باب میں کیا ہیں، مذہب کیا کہتا ہے اور علم و حکمت کے نزدیک اس کی کیا حقیقت ہو سکتی ہے، جہاں تک تحقیق تاریخی کا تعلق ہے، جادو کا عقیدہ بہت زیادہ قدیم نہیں معلوم ہوتا بلکہ اس کا وجود علم طب کی ترقی کے بعد ہوا ہے

یا یہ کہ علم طب کے حیرت انگیز کارناموں کو دیکھ کر سحر و ساحری کا خیال پیدا ہوا کیونکہ سحر اقوام قدیم کے نزدیک بھی اس علم کا نام تھا جس کے ذریعہ سے عجیب غریب باتیں ظاہر ہو سکیں اور علم طب کے کرشمے بھی چونکہ عوام کے نزدیک ایسے ہی محیر العقول تھے اس لئے وہ اس کو بھی سحر و ساحری سمجھنے لگے۔ پھر جب علم نجوم کی بنیاد پڑی تو اس میں بھی اسی عقیدہ کو در خور حاصل ہو گیا۔ چنانچہ آج بھی اس واہمہ کی بناء پر تسخیر سیارگان وغیرہ کے عمل کئے جاتے ہیں۔

جادو کے عقیدے کی بنیاد سب سے پہلے کب اور کہاں پڑی؟ اس کا جواب مشکل ہے لیکن چونکہ عہد تاریخ کی ابتدا بابل اور مصر سے ہوتی ہے اس لئے ظاہر ہے کہ ہماری تحقیق کا دائرہ ان دونوں کے زمانہ سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا نے لکھا ہے کہ کلدانیوں میں دو قسم کا سحر رائج تھا، ایک معدنی قوتوں کا جسے صحیح معنی میں علم الکیمیا کہنا چاہئے اور دوسرا وہ جس کی رو سے دیوتاؤں کے سامنے قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں اور توقع یہ کی جاتی تھی کہ اس طرح وہ خوش ہو کر مصیبتوں کو دور کر دیں گے اور مریضوں کو صحتیاب۔ اس آخری قسم کے جادو کی بنیاد غالباً سب سے پہلے مصر میں پڑی جہاں جادوگروں اور کاہنوں کی جماعت کا بڑا اثر قائم تھا اور وہاں سے یہ عقیدہ تمام مشرق میں پھیل گیا۔ چنانچہ بابل میں گرفتار ہو کر آنے والے یہودیوں میں بھی یہی عقیدہ نظر آتا ہے اور بعد کو جب انجیل مرتب ہوئی تو حضرت عیسیٰ کو بھی جھاڑ پھونک کرنے والے ہی کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ فیثا غورث بھی کالدیا اور مصر سے اسی قسم کا جادو سیکھ کر آیا تھا جس کی تعلیم اس نے افلاطون کے شاگردوں

کو دی۔ پروفرّی کا بیان ہے کہ فیثا غورث کے شاگرد جھاڑ پھونک سے مریضوں کو اچھا کر دیتے تھے نقش و تعویذ وغیرہ کا بھی قدیم مصر میں بہت رواج تھا چنانچہ آپ یہ معلوم کرکے تعجب کریں گے کہ بہت سے تعویذ و نقوش، جو اس وقت بھی پائے جاتے ہیں اب سے ہزاروں سال قبل مصر میں رائج تھے اور چاندی کی تختی پر کندہ کرکے گلے میں لٹکائے جاتے تھے۔ بہر نوع سحر ساحری کا چرچا سب سے پہلے مصر و کالڈیا میں ہوا اور وہاں سے مختلف ملکوں میں پھیلا۔ اگر یہ عقیدہ اسی حد تک پہنچ کر رک جاتا تو چنداں مضائقہ نہ تھا لیکن بعد کو اس کی وجہ سے جو جو مظالم نوع انسانی پر ہوئے ان کی داستان سخت دردناک ہے۔ یورپ کی تاریخ ان سے رنگین ہے سنہ ۱۴۸۴ء میں پاپائے روم کی طرف سے ایک قانون بھی جادوگروں کی سزا کے لئے منضبط کیا گیا اور ہزاروں بے گناہ نفوس (جن میں غریب حاملہ عورتیں اور ننھے ننھے بچوں کی مائیں بھی شامل تھیں) صلیب پر چڑھا دئے گئے۔ اس کے بعد الگزنڈر ششم نے ۱۴۹۴ء میں، لیو دہم نے ۱۵۲۱ء میں، اڈرین ششم نے ۱۵۲۲ء میں اس قانون کو اور زیادہ سخت کر دیا۔ شہر میں جب کوئی واقعہ غیر معمولی ہو جاتا تو اس کو جادو ہی کا نتیجہ سمجھا جاتا اور محض شبہ پر لوگ گرفتار کر لئے جاتے۔ ڈریپر کی مشہور تصنیف (CONFLICT BETWEEN SCIENCE AND RELIGION) ملاحظہ کیجئے اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اس عقیدہ نے صدیوں تک یورپ کے امن کو کس قدر خطرہ میں ڈال دیا تھا جب کسی مرد یا عورت پر جادوگر ہونے کا شبہ کیا جاتا تو وہ گرفتار کرکے سامنے لایا جاتا اور اگر انکار کرتا تو اقبال جرم کے لئے گرم لوہے سے

دیا جاتا شکنجہ میں کس کر تہ خانے میں ڈال دیا جاتا اور وہاں کی سردی، بھوک اور تاریکی کے عذاب سے گھبرا کر وہ اقرار کر لیتا۔ اس کے بعد اس کو صلیب دیدی جاتی یا زندہ جلا دیا جاتا۔ یہ آفت ایک ہی مقام تک محدود نہ تھی بلکہ سارا یورپ اسی جنون میں مبتلا تھا۔ فرانس کے چھوٹے سے مقام لنڈم میں چار سال کے اندر آبادی کا پانچواں حصہ اسی جرم میں جلا دیا گیا۔ جنیوا میں تین مہینے کے اندر پانسو آدمی نذر آتش کئے گئے اور کومو میں ایک ہزار آدمیوں کی قربانی چڑھائی گئی۔ اسی طرح انگلستان میں ملکہ الزبتھ اور جیمس اول کے عہد میں جو کچھ ہوا وہ بھی تاریخ سے ظاہر ہے کہ گاؤں گاؤں یہ آفت برپا تھی اور بستیوں کی بستیاں اسی طرح غیر آباد ہو گئیں۔ لانگ پارلیمنٹ کے زمانے میں اور زیادہ ستم توڑے گئے۔ ڈاکٹر اسپرنگر کا بیان ہے کہ صرف عورتوں کی تعداد جو مذہب عیسوی کی بدولت جادو کے جرم میں زندہ آگ میں ڈالدی گئیں۔ نوے لاکھ تک پہونچ گئی۔

یہ فخر صرف مذہب اسلام کو ہے کہ اس نے دنیا سے تمام اوہام باطلہ کے ساتھ جادو کے عقیدہ کو بھی دنیا سے مٹا دیا۔ بعض احادیث ایسی پائی جاتی ہیں جن سے جادو کے برحق ہونے کا ثبوت ہوتا ہے مثلاً قصہ ہاروت و ماروت لیکن ایسی تمام حدیثیں ناقابل اعتبار ہیں اور صحت سے یکسر دور — خود کلام مجید میں لفظ سحر بہت جگہ استعمال ہوا ہے لیکن اس کا مفہوم جادو کا نہیں ہے۔ کلام پاک میں یہ لفظ دھوکا، مکر و فریب اور پرستش غیر اللہ کے جذبہ کو پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ عربی زبان میں لفظ سحر فساد کا مترادف ہے۔ اس موقع پر غالباً اس سے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ورنہ میں کلام مجید کی

ہر اس آیت کو لے کر جہاں لفظ سحر استعمال ہوا ہے میں اپنے اس دعوے کو ثابت کر دیتا۔

لیکن یہ کہنا کہ خود انسان کے اندر کوئی ایسی قوت نہیں ہے جس کے ذریعہ سے وہ اس قسم کے محیر العقول کارنامے دکھا سکے یقیناً غلط ہے۔ علم نیرنجات، اشراقیت، مقناطیسیت، مسمریزم وغیرہ سب انسانی دماغ کے کرشمے ہیں اور اگر جادو نام ہر اس چیز کا ہے جو لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے تو پھر آج کل کے تمام آلات و ایجادات سب سحر میں داخل ہیں جن کی حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ حال ہی میں ساحرہ ہوڈینی کے حالات آپ نے پڑھے ہوں گے کہ کس قدر عجیب و غریب باتیں اس سے اس سے ظہور میں آتی تھیں اگر ان کو بھی جادو سمجھ لیا جائے تو یقیناً جادو برحق ہے لیکن میں نے اپنے خیالات اس جادو کے متعلق ظاہر کئے ہیں جو زمانہ قدیم سے شرک کی صورت میں چلا آرہا ہے اور جس کا تعلق ارواح خبیثہ یا کسی اور قوت غیر اللہ سے بتایا جاتا ہے۔

علم غیب

(جناب محمد نواز صاحب خلش۔ دیوالہ)

آج کل ضلع میانوالی میں یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ آیا نبی صلعم کو علم غیب جزواً تھا یا کلاً، براہِ نوازش بذریعہ رسالہ نگار مطلع فرما کر ممنون کیجئے۔

اس سوال کے جس قدر مختلف پہلوؤں پر گفتگو ہو سکتی ہے با وضاحت

بیان فرمائیں، یعنی (۱) علم غیب سے کیا مراد ہے (۲) جزاً یا کلاً سے کیا مراد ہے۔ (۳) حضرت آدمؑ کو علم غیب عطا فرمایا گیا تھا یا نہیں۔

کچھ زمانہ قبل یہ مسئلہ شمالی ہند میں اٹھایا گیا تھا اور مولویوں نے خوب داد شجاعت دی تھی۔ زبانی مناظرے ہوئے، تحریری مجادلے ہوئے۔ سب وشتم اور تکفیر کے حربے استعمال کئے گئے لیکن آخرکار جو نتیجہ اس نوع کے نزاع و بحث کا ہوا کرتا ہے وہی ہوا یعنی تھوڑے دنوں کے بعد ہر فریق اپنی اپنی جگہ تھک کر بیٹھ گیا اور کچھ پتہ نہ چلا کہ "نبی آخرالزماں کو علم غیب حاصل تھا یا نہیں؟"

تمام ان مسائل میں جن کا تعلق کلام مجید سے ہو، ہم لوگوں کی بڑی غلطی یہ ہوا کرتی ہے کہ خود کلام پاک سے سمجھنے کے بجائے منقولات، روایات اور تفسیرات وغیرہ کی جستجو کرنے لگتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں باہم تعارض و تضاد پاکر رہی سہی کیفیت طمانیت بھی کھو بیٹھتے ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ ابوحنیفہ کی تقلید کریں یا شافعی کی، امام احمد کا کہنا مانیں یا امام حنبل کا، رازی کے لکھے کو صحیح مانیں یا غزالی کی تحریر کو اور طرفہ تماشہ یہ ہے کہ باوجود تباین و تضاد کے جو ان اکابر کے اقوال یا احادیث کے روایات میں پایا جاتا ہے ایک مولوی اس امر پر بھی مجبور کرتا ہے کہ سب کو صحیح مانو، کسی کو غلط نہ سمجھو، گویا وہ اس بات کا قائل ہے کہ دو نقطوں کے درمیان ایک سے زیادہ خط مستقیم کھینچے جا سکتے ہیں۔

بظاہر اس سے کسی کو اختلاف نہیں کہ اصل چیز کلام مجید ہے لیکن عمل یہ ہے کہ اصل سمجھا جاتا ہے اقوال ... ن کو اور انھیں کے اتباع میں کلام پاک سمجھنے کی کوشش

کی جاتی ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ کلام مجید کا علم آسان نہیں اور ہر شخص کو اس کی جسارت نہ کرنا چاہیئے، لیکن میں اس بت پرستی کو بھی ناجائز سمجھتا ہوں کہ متقدمین کے اقوال کو "دحی یوحیٰ" قرار دیا جائے اور ان کی ہر بات خواہ سمجھ میں آوے یا نہ آوے ضرور تسلیم کر لی جائے کیونکہ جب علم قرآن کی وسعت اتنی زبردست ہے کہ کوئی انسان اس کے تمام رموز کو نہیں جان سکتا تو پھر جس طرح میں اس کے ماہر و عالم ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا اسی طرح صاحب کشاف و جلالین بھی نہیں کر سکتے، البتہ فرق یہ ہے کہ اگر ان سے دس غلطیوں کا امکان ہے تو مجھ سے بیس یا اس سے زائد کا، لیکن اس کے کیا معنی کہ ان کی ہر غلطی "اجتہاد" تسلیم کی جائے اور باوجود غلطی ہونے کے بھی، ثواب کے مستحق ہوں اور میری ہر بات خواہ وہ کتنی ہی قرین عقل و انصاف کیوں نہ ہو محض اس لئے غلط قرار دی جائے کہ اس سے پہلے کسی نے ایسا نہیں لکھا حالانکہ نہیں لکھا تو اس کی ذمہ داری ان پر ہے نہ کہ مجھ پر، لیکن ہم لوگوں کی کورانہ تقلید اس حد تک بڑھ گئی ہے اور اپنے حواس و ادراک کو اس درجہ بیکار بنا لیا ہے کہ اگر کوئی یہ کہے کہ تمہارے چہرے پر بھی آنکھیں ہیں تو ہم اس کا یقین کرنے کے بجائے خود اس کو اندھا سمجھنے لگتے ہیں۔ اگر عقول انسانی کی ترقی کا دروازہ واقعی بند ہو گیا ہے اور مبدا رفیاض اپنے تمام انعامات ختم کر کے بالکل معطل ہو گیا ہے تو خیر، ورنہ ہر شخص کا ایمان خود اس کی ذاتی چیز ہے، اور اس کے اطمینان نفس سے اس کو متعلق ہونا چاہیئے، اگر متقدمین کے اقوال سے اس کو اطمینان قلب حاصل نہیں ہوتا بلکہ خود غور کر کے کسی نتیجہ پر پہونچنے سے حاصل ہوتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ اسے کافر و مرتد کہدیں اور اس کو مجبور کریں کہ نہیں سمجھے تو

"صاحبین" یا "شیخین" ہی کے ساتھ جنت و دوزخ میں جانا ہے اور خدا نے صرف متقدمین ہی کو صحیح راستہ بتایا تھا اور وہی اس کے رازداں تھے

مدعا اس سے یہ ہے کہ چونکہ ہمارے یہاں کے علما اکثر مسائل میں کلام مجید پر غور کرنے کے بجائے منقولات کو لے بیٹھتے ہیں اور خود اپنی عقل اپنے تدبر و تفکر اور اپنے اجتہاد سے کام نہیں لیتے، اس لئے وہ نہ اوروں کو مطمئن کر سکتے ہیں اور نہ خود ہوتے ہیں، یہی حال مسئلہ غیب کے جھگڑے کا ہوا کہ چند دنوں تک باہم دست و گریبان رہنے کے بعد خاموش ہو گئے اور کوئی لٹریچر ایسا نہ چھوڑا جس سے کسی کو اطمینان ہو سکتا۔

میرے نزدیک غیب کا مسئلہ نہایت صاف و آسان مسئلہ ہے اور اس میں کسی کو نہ زیادہ عقل آرائی کی ضرورت ہے اور نہ کسی بحث و نزاع کی۔

لفظ غیب یا غائب لغوی معنی میں ہر اس امر کو کہتے ہیں جو مستور ہو، آنکھوں سے نظر نہ آئے اور جس کا ہم زمان و مکان متعین نہ کر سکیں چنانچہ جب کوئی آواز کسی ایسے مقام سے آتی ہے جس کا پتہ نہیں چلتا یا نظر نہیں آتا تو عربی زبان میں اس کو اس طرح ادا کرتے ہیں:۔

"سمعت الصوت من وراء الغیب"

اب دیکھنا یہ ہے کہ کلام مجید میں اس لفظ کا استعمال لغوی معنی سے ہٹ کر تو نہیں ہوا؟ قرآن میں متعدد جگہ یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ سب سے پہلے تو سورۂ بقر کی بالکل ابتدا میں "یؤمنون بالغیب" نظر آتا ہے بعض مفسرین نے اس آیت میں "غیب"

کے جو یہ معنی لکھے ہیں کہ "آنکھ بند کرکے ایمان لاتے ہیں" ان سے مجھے اختلاف ہے مگر اس کا جو مفہوم علامہ ابن عباس نے ظاہر کیا ہے وہی درست معلوم ہوتا ہے انھوں نے لکھا ہے "الغیب ہو اللہ" یعنی غیب سے مراد خدا کی ذات ہے چونکہ خدا کی ذات مستور ہے اور نظر نہیں آتی اس لئے اس کو لفظ غیب یا غائب سے تعبیر کرنا بالکل لغوی معنی کے لحاظ سے ہے جس میں کسی تاویل کی ضرورت نہیں۔

سورۂ آل عمران میں جب جناب مریم کو ان کی تطہیر و پاکیزگی کا یقین دلاتے ہوئے اطاعت و عبادت کی ہدایت کی گئی تو اس کے ساتھ ارشاد ہوا کہ:۔

"ذالک من انباء الغیب نوحیہ الیک"

یعنی یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تجھے بتاتے ہیں۔ یہاں غیب کے معنی خواہ خدا کے لیجئے یا محض عالم مستور کے (جو "عالم الشہادۃ" کا ضد ہے) کوئی فرق نہیں ہوتا اور وہی لغوی معنی بدستور قائم رہتے ہیں۔

دو مقام پر صاف صاف علم غیب کے متعلق اظہار حقیقت کیا گیا ہے۔ سورۂ انعام میں ارشاد ہوتا ہے:۔ "وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمہا الا ہو"

یعنی خدا ہی کے پاس غیب کے خزانے یا کنجیاں ہیں جن کو سوائے اس کے کوئی نہیں جانتا۔ دوسری جگہ سورۂ جن میں مرقوم ہے:۔

عالم الغیب فلا یظہر علیٰ غیبہ احداً الا من ارتضیٰ من رسول"

یعنی وہ عالم الغیب (خدا) اپنا بھید کسی پر ظاہر نہیں کرتا مگر اس پر جسے وہ رسالت کے لئے چن لے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ انعام اور سورۂ جن کی آیتیں متعارض

ہیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ سورۂ انعام میں جو حقیقت ظاہر کی گئی ہے وہ اپنی جگہ بالکل درست ہے یعنی یہ کہ رموز غیب کا جاننے والا صرف خدا ہے۔ اور سورۂ جن میں یہ ارشاد ہوتا ہے کہ ان رموز کو وہ اپنے رسولوں پر ظاہر کر دیتا ہے۔

اس طرح گویا سورۂ جن سے یہ امر روشن ہو گیا کہ خدا رسولوں کو علم غیب عطا کرتا ہے لیکن فیصلہ کرنے سے قبل دو باتوں پر غور کر لینا ضروری ہے ایک یہ کہ عالم غیب عالم مستور، رموز غیب وغیرہ سے کیا مراد ہے اور علم کی کتنی صورتیں ہو سکتی ہیں۔

عالم غیب اور عالم شہادۃ دو عالم مانے جاتے ہیں۔ عالم شہادت تو وہ جو ہماری نگاہوں کے سامنے ہے یا جس کا ہم کو علم ہو چکا ہے اور عالم غیب وہ جو ہماری نگاہ اور اور ہمارے حواس و ادراک سے پوشیدہ ہے اور یہ امر کسی سے مخفی نہیں کہ عالم شہادۃ بہ نسبت عالم غیب کے نہایت مختصر ہے، انسانی معلومات کا نقص اور اس کی تشنگی ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ جو کچھ انسان کو معلوم ہے اور جن امور کا وہ اپنے آپ کو محقق کہتا ہے وہ بھی اسے اچھی طرح نہیں معلوم، چہ جائیکہ تمام کائنات اور رموز کائنات و آفرینش سے آگاہ ہونا۔ الغرض انسان کے سامنے جو کچھ ہے وہ عالم غیب کا نہایت ہی حقیر و مختصر سا حصہ ہے جس کا علم اُسے حاصل ہو گیا ہے اور جس کو ہم عالم الشہادۃ کہتے ہیں وہ بھی کسی وقت عالم الغیب ہی میں داخل تھا۔

علوم حاضرہ کی تمام تحقیقات، فنون جدیدہ کی تمام معلومات کسی وقت سب عالم غیب ہی میں داخل تھیں جو بعد عالم الشہادت میں داخل ہوئیں، علم الکیمیا کے تمام نظریے

علم طبقات الارض کے تمام انکشافات طبیعیات کے جدید مسائل، الغرض اس وقت کے تمام معلومات سب عالم غیب سے متعلق تھے جو اب عالم الشہادت میں آگئے ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کون سے غیب کے خزانے ہیں جو آئندہ انسان کو عطا ہونے والے ہیں اس لئے یہ کہنا کہ غیب کا علم رسول کو نہیں تھا اس لحاظ سے تو صحیح ہے کہ کل علم کسی انسان کو حاصل ہو ہی نہیں سکتا لیکن جزئی علم ہر انسان کو حاصل ہے چہ جائیکہ انبیاء و رسل جو بہر نوع زیادہ مکمل انسان تھے۔

علم دو طرح کا ہوتا ہے ایک وہ جسے علم کنہہ وحقیقت کہتے ہیں۔ دوسرا علم علت ومعلول قسم اول کا علم تو یقیناً سوائے ذات باری کے کسی کو نہیں ہو سکتا لیکن دوسرے کا علم ہر انسان کو حاصل ہو سکتا ہے اور عقل و دماغ کے تفاوت سے اس میں بھی مدارج ہوتے ہیں اس کی زیادہ تشریح کی زیادہ ضرورت ہوں تو یوں سمجھ لیجئے کہ ایک انسان یہ تو سمجھ سکتا ہے کہ جب دو چیزیں آپس میں ملیں گی تو ایک تیسری چیز رونما ہو گی لیکن وہ "کیوں" کا جواب نہیں دے سکتا، کیوں کا علم صرف خدا کو ہے اور انسان اب تک بقدر یک دانہ ذرل بھی اس کو حاصل نہیں کر سکا۔

اب اگر انبیاء یا رسول اللہ کے متعلق کہا جائے کہ وہ کنہہ وحقیقت کا علم رکھتے تھے تو میں اس کے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں لیکن جس طرح اور دوسرے انسانوں کو بعض نوامیس قدرت کا معلولی علم ہو سکتا ہے، اسی طرح ان کو بھی حاصل تھا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ ان کا علم، ان کی عقول عالیہ اور نفوس زکیہ کی وجہ سے زیادہ بلند و پیچا رہا ہو۔ اب ذرا مادی دنیا سے بالکل جدا ہو کر صرف روحانی عالم میں آئیے

تو یہاں بھی وہی صورت نظر آئے گی۔ اس وقت مسمریزم، ہپناٹزم، قوت مقناطیسی، انباء عن الغیب پیشین گوئی، قراءۃ افکار (دل کا حال معلوم کر لینا) یا اس سے قبل رمل، نجوم وغیرہ کے ذریعہ سے احکام صادر کرنا، یہ سب علم غیب ہی سے متعلق تھے، اور انسان دماغ کو مخصوص طور پر تربیت کرنے کے بعد یہ تمام باتیں بتا سکتا ہے لیکن یہ بھی کنہ حقیقت نہیں ہے بلکہ نتیجہ ہے اس قوت کا جو خاص مشق کے بعد بلا کسی اصول و ضابطہ کے کسی امر کی طرف راہبری کرتی ہے۔ انبیاء چونکہ قدرت کی طرف سے نہایت ہی اعلیٰ دماغ لے کر آئے تھے اس لئے اگر وہ کوئی پیشین گوئی کر دیتے تھے یا کسی امر غیر معلوم کے متعلق کوئی صحیح حکم لگا دیتے تھے تو کوئی حیرت کی بات نہیں اور نہ اس کو غیب سے متعلق کرنے میں کوئی غلطی ہے۔

آپ کے دوسرے سوال کا جواب بھی اس میں آگیا۔ کیونکہ اگر آدم کسی پیغمبر کا نام تھا تو پیغمبر ہونے کی وجہ سے اور اگر اس سے مراد محض انسان ہے تو انسان ہونے کی وجہ سے اس پر بھی عالم غیب کے انکشافات ہونا مستبعد نہیں تھا۔ سب سے پہلے جب انسان نے پتھروں کے اوزار بنا کر ان سے کام لیا تو یہ بھی علم غیب ہی تھا اور آج جبکہ انسان ہوا میں اڑتا پھر رہا ہے غیب ہی کے خزانہ کا عطیہ ہے اور کل جب وہ کرۂ قمر میں اپنی نوآبادیوں کی بنیاد ڈالے گا اور اہل مریخ کے ساتھ لاسلکی ٹیلیفون قائم کرے گا، اس وقت بھی یہ سب عالم غیب ہی کے ایک جزو کا انکشاف ہوگا لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان اگر اس سے زیادہ ترقی کر کے وہ کچھ ہو جائے جسے انسان نہیں کہہ سکتے تو بھی وہ مجبور و جاہل ہی رہیگا اور کنہ حقیقت کا علم یا عالم غیب کی وسعت و پہنائی کا انکشاف اس کے دماغ میں اس ادراک کی اہلیت ہی موجود نہیں۔

حقوق اللہ و حقوق العباد

(بہ جواب استفسار جناب ناظم حسین صاحب۔ گوالیار)

"حقوق اللہ اور حقوق العباد" کا مسئلہ بھی منجملہ اُن دیگر مسائل کے ہے جن کو معتقدات اسلامیہ سے غیر متعلق ہونے کے باوجود غلطی سے جزو ایمان و اسلام قرار دے لیا گیا ہے اور ہر وہ شخص جو اسلام و اسلامیات پر تنقید کرنے کے بعد پورے اطمینان نفس کے ساتھ مسلمان ہونا چاہتا ہے وہ اس مسئلہ میں آپ ہی کی طرح مشوش ہوگا اور ہونا چاہیئے۔

اول اول جب مذاہب عالم کی تفتیش و مطالعہ کے سلسلہ میں، مذہب اسلام میری جستجو و تحقیق کا مرکز قرار پایا اور مہمات سے گذر کر جزئیات تک پہونچا تو میرا ذہن بھی اس مسئلہ میں آپ ہی کی طرح مشوش ہوا اور آخر کار میں نے فیصلہ کیا کہ فرائض انسانی کی یہ تقسیم ممکن ہے کسی مصلحت کے لحاظ سے درست ہو لیکن حقیقت کے اعتبار سے بالکل نادرست ہے۔

قبل اس کے کہ میں ان دلائل کو پیش کروں جن کی بناء پر میں نے یہ فیصلہ کیا ہے یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فرض اور حق میں کوئی فرق نہیں ہے سوائے اس کے کہ جس کی طرف سے ادائے فرض کا مطالبہ ہوتا ہے وہ اس کو حق کہہ کر طلب کرتا ہے اور جو ادا کرتا ہے وہ اسے فرض کے نام سے موسوم کر کے انجام دیتا ہے اس لئے اگر حق کا مفہوم متعین ہو جائے تو فرض کی صورت بھی متعین ہو سکتی ہے اور اس کی غایت

کا بھی علم ہو سکتا ہے۔

ادائے فرض یا حق نام ہے کسی ایثار یا احسان و کرم کے اعتراف کا ایثار کے ذریعے یا کسی ایسے ذریعے سے جسے احسان کرنے والا اپنے لطف کا بدلا و معاوضہ سمجھ سکے ایک شخص کی احتیاج کو ہم پورا کرتے ہیں تو اس کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ کسی وقت ہمارے بھی کام آئے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو تارک فرض کہلائے گا اسی طرح ایک شخص ہم کو قرض دیتا ہے تو ہمارا فرض ہوتا ہے کہ اس کو وقت معین پر ادا کریں اور اس کے احسان کی تلافی کر دیں۔ اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو فرض کے ترک کرنے والے کہلائیں گے ایک صورت یہ ہوئی جبکہ حق کا طلبگار اور ادائے فرض کرنے والا دونوں احتیاج کے لحاظ سے قریب قریب ایک سطح پر ہوں دوسری صورت یہ ہے کہ احسان کرنے والا بہت بلند ہو اور وہ اس کے معاوضہ کا وقت احسان بظاہر محتاج نہ ہو اس صورت میں ایک معنوی اور اخلاقی احساس احسان کا ضرور پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے عوض کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا مثلاً یہ کہ ہم کسی نہایت ہی مفلوک الحال فقیر یا اپاہج کی کچھ مالی اعانت کریں تو اس وقت نہ ہمارا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس کا عوض اس سے کسی وقت چاہیں گے اور نہ اس کے ذہن میں یہ بات آسکتی ہے کہ کبھی اس کا عوض دینا پڑے گا لیکن اگر کسی وقت ہم اس کی طرح مفلوک الحال ہو جائیں اور وہ ہماری طرح دولتمند یا کسی اور صورت سے ہم کو اس کی مدد کی ضرورت لاحق ہو جائے تو پھر اس کے ادا کئے جانے کا سوال از خود پیدا ہو جائے گا گو بحالت موجودہ ہم اور وہ دونوں اس سے خالی الذہن ہیں تیسری صورت ایک اور ہے وہ یہ کہ احسان و کرم کرنے والا

ذات ایک ایسا عمومی مبدء و منبع ہو جو بلا تخصیص و تعیین بلا غرض و سبب لطف عمیم کی عادی ہے، جیسے آفتاب کا وجود کہ اس کی روشنی کوہ و راغ صحرا و باغ، وادی و مرغزار ہر جگہ یکساں جان بخش و حیات افروز ہے، یا پھول کی نکہت کہ اس کی شامہ نوازی کسی مخصوص و محدود زمان و مکان کے لئے مختص نہیں ہے یا ابر مطیر جس کے نزدیک شاہ و گدا نشیب و فراز، شب و روز، صبح و شام کسی چیز کی تخصیص نہیں ہے۔ ایسی صورت میں نہ سوال حق و فرض کا پیدا ہوتا ہے، نہ اس کے ادا کئے جانے کا۔

خدا اور انسان کا تعلق اگر کسی شق میں آسکتا ہے تو وہ یہی تیسری صورت ہے، کیونکہ ذات خداوندی کے انعامات بغیر کسی وجہ و سبب، بلا کسی غرض و غایت کے ہر ایک ہستی و مخلوق پر یکساں ہیں اور اگر آج تمام نوع انسانی بلکہ جملہ مخلوق ان سے منکر ہو جائے تو بھی اس کے الطاف اسی حال سے جاری رہیں گے اور ان کے اعتراف یا عدم اعتراف سے ان کے استمرار و دوام پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ جس کی طرف سے کسی حق کا مطالبہ ہوتا ہے یا جس کا کوئی حق ہم اپنے اوپر تسلیم کرتے ہیں تو گویا ضمنی طور پر اس کا کسی حد تک صاحب احتیاج ہونا بھی تسلیم کرتے ہیں ورنہ مطالبہ و ادائے فرض کا مفہوم بالکل غلط قرار پاتا ہے اس لئے اگر خدا کا کوئی حق بندوں پر ہے اور اس کا ادا کرنا ہم پر فرض ہوتا ہے تو اس کے صرف ایک ہی معنی ہو سکتے ہیں اور وہ یہ کہ خدا کا ہم کو پیدا کرنا، عقل و ادراک کی نعمت بخشنا، دنیا کے نعائم و لذائذ مہیا کرنا، کوئی ایسی غرض و غایت رکھتا تھا جس میں شاید خود خدا کا کوئی فائدہ تھا اور اس لئے ہمارا اس کے فائدہ کو ان احسانات کے عوض میں نظر انداز کر دینا ایک ایسی غلطی و سرکشی ہے جس کی سزا ہمیں ملنا

چاہئے۔ حالانکہ خدا کی ذات اس قدر بلند ہے کہ اس کے ساتھ کسی سبب یا غرض کی نسبت ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ وہ ہر قسم کے تاثرات سے بے نیاز ہے۔

اگر حقوق اللہ میں کوئی چیز ایسی ہو سکتی ہے جس کا احساس فطرت کی طرف سے ہر شخص میں ودیعت کیا گیا ہے تو سب سے پہلے اس کی ذات اور وجود کو تسلیم کرنا ہے لیکن اگر آج کوئی اس سے انکار کر دے بلکہ اس سے زیادہ یہ کہ اس کو گالیاں دینے لگے تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ خدا اس سے ناخوش ہو جائے گا اور اپنے ان انعامات عظیم سے اسے محروم کر دے گا جو بلا کسی سبب کے اس نے ہر شخص کے لئے ارزانی کر رکھے ہیں؟ ہماری بڑی غلطی یہ ہے کہ ہم خدا اور اس کے کاروبار کو بالکل دنیاوی اصول زندگی کے لحاظ سے دیکھتے ہیں اور اس کے مطابق حکم لگاتے ہیں۔ ہم خدا کی حقیقت سمجھنے اور سمجھانے کے لئے بڑے سے بڑے بادشاہ کی مثال پیش کرتے ہیں اور جس طرح یہاں ایک بادشاہ کے حقوق رعایا پر ہوتے ہیں اسی طرح خدا کے حقوق کو بندوں پر ثابت کرتے ہیں ممکن ہے کہ عوام کے سمجھانے کے لئے اور ان کے اخلاق کی تہذیب و تربیت کے لئے یہ ایک مفید طریق کار ہو لیکن جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے معاملہ بالکل اس کے خلاف ہے اور خدا کی حقیقت یا اس کے ساتھ تعلق مخلوق کو سمجھنے کے لئے ہم عالم حواس اور ادراک کی کسی چیز کو مثال یا تشبیہ کی صورت سے پیش ہی نہیں کر سکتے ایک ایسی ذات جو یکسر غنا ہے، جو بے نیازی کے سوا کچھ نہیں ازل سے لانہایت تک ایک قوت کاملہ کی حیثیت میں ذرہ سے لے کر آفتاب تک ہر جگہ کارفرما ہے اس کے متعلق یہ کہنا کہ اس کے بندوں پر حقوق ہیں، یا وہ ہم سے کسی فرض کی ادائی

اپنے لئے باقی ہے میرے نزدیک ذات باری کا امتحان اور معنوی شرک ہے۔

اب آپ اصولی گفتگو سے ہٹ کر نیچے آئیے اور دیکھئے کہ جن باتوں کو خدا کے حقوق سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ کیا ہیں اور ان میں کونسی وہ خصوصیت ہے جو حق اللہ کو بہ ثابت کرتی ہے۔ ہر مذہبی تعلیم دو چیزوں پر مشتمل ہوتی ہے، عبادات و معاملات، معاملات کو تو چھوڑیئے کیونکہ وہ بین طور پر حقوق العباد سے متعلق ہیں۔ رہ گئی عبادات سو حق اللہ کو انہیں سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ درانحالیکہ ان میں سے ایک بھی حق اللہ نہیں ہے اور عبادت خواہ کسی صورت سے ہو حقوق العباد ہی سے تعبیر ہونا چاہئے۔ اب آپ انہیں کی حقیقت پر غور کر لیجئے کہ وہ خدا کا حق کیوں کر ہو سکتی ہیں اور خدا کو ہماری عبادات سے کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے۔

وہ لوگ جو نماز، روزہ اور حج کو حق اللہ میں داخل کرتے ہیں وہ بھی غالباً اس امر کا انکار نہیں کر سکتے کہ ان میں سے کوئی عبادت ایسی نہیں ہے جو صرف ہمارے ہی فائدہ کے لئے نہ بتائی گئی ہو۔ مثلاً نماز لیجئے کہ اس وجہ سے جو طہارت اور پاکیزگی کا خیال ہوتا ہے وہ خود ہماری ہی صحت کے لئے مفید ہے یا جو اجتماع و یکجہتی کی صورت صف بستہ عبادت گذاروں میں پائی جاتی ہے وہ خود ہماری اجتماعی زندگی اور تمدنی ترقی کے لئے کس درجہ کارآمد ہے یا فحشاء و منکر سے باز رہنے کی صورت میں جو تزکیۂ اخلاق رونما ہوتا ہے وہ کس حد تک ہماری قومی و انسانی ارتقاء کا ضروری جزو ہے۔ اس لئے اگر ہم تارک الصلوٰۃ ہیں تو اس کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ ہم اپنی اجتماعی و تمدنی ترقی کے لئے سعی نہیں کرتے، ہم دنیا میں ترقی و خوشحالی حاصل کرنے کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور

اس طرح گویا نماز کا ترک کرنا ان حقوق کا پامال کر دینا ہے جو قوم کی طرف سے اس کی ایک ایک فرد پر عائد ہوتے ہیں اور داعیات قومی کی پروا نہ کرنا یقیناً قوم کا گناہ ہے جسے صرف حق العباد ہی سے متعلق کیا جا سکتا ہے۔ حج چونکہ نماز با جماعت ہی کی ایک زیادہ وسیع صورت ہے اور اس کا مقصود بھی محض اخوت عامہ کی بنیاد کو زیادہ مستحکم کرنا ہے اس لئے اس کا بھی حق العباد میں شامل ہونا ظاہر ہے۔ یہی حال روزہ کا ہے کہ اس کی تاکید بھی صرف اس لئے کی گئی ہے کہ ہم اپنی قوم کے مسکین و بیکس افراد کی حالت کا اندازہ کر سکیں اور ان کی مدد کی طرف متوجہ ہوں اور اگر یہ جذبہ ہم میں پیدا نہیں ہوتا تو روزہ بالکل بے معنی سی چیز ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ عبادت بھی سراسر حق العباد سے متعلق ہے الغرض دنیا میں کوئی عبادت یا کوئی طریق نیایش ایسا نہیں ہو سکتا جو حق اللہ کہلایا جائے کیونکہ خالق و مخلوق کا رشتہ ایک ایسے غنی و محتاج کا رشتہ ہے جس میں حق کے پیدا ہونے یا اس کے ادا کئے جانے کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔

رہا یہ امر کہ جب حقیقت یہ ہے تو کیوں ایسا بتایا گیا اور یہ تقسیم و تفریق حق کی کس غرض سے کی گئی اس کی وجہ بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ مذہب اور فلسفۂ مذہب دو بالکل علیحدہ چیزیں ہیں یعنی یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص فلسفۂ مذہب جاننے کے بعد مذہب اختیار کرے کیونکہ جو نتائج محض کسی مذہب کے اختیار کرنے سے پیدا ہو سکتے ہیں وہ بہر حال بغیر فلسفۂ مذہب کے علم کے بھی مترتب ہو سکتے ہیں اور اس لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص کو پہلے کسی عبادت یا فعل حسن کی فلسفیانہ حقیقت سے آگاہ کر دیا جائے بلکہ اگر ہم یہ دیکھیں کہ کوئی شخص بغیر ان موشگافیوں کے علم کے احکام خداوندی پر اچھی طرح

کاربند ہو سکتا ہے تو ہمارا فرض ہے کہ اس کو اس طرف سے بے خبر ہی نہ رکھیں طبقۂ عوام
میں چونکہ علمی توجیہوں کے سمجھنے کی اہلیت نہیں ہوتی اور نہ وہ ان کی اہمیت سے
واقف ہو سکتے ہیں اس لئے ان کے لئے یہی مناسب ہے کہ ان کو عبادت یا تعلیم
اخلاق کی طرف بالکل ایسے انداز سے راغب کیا جائے جس طرح ہم بچوں کو مختلف پیرایوں
سے کسی امر کی طرف راغب یا کسی بات سے متنفر کرتے ہیں۔ ایک بچہ ہاتھ میں چاقو
لے کر کھیلنے لگتا ہے اور ہم اس سے یہ نہیں کہتے کہ دیکھو اس میں تیز دھار ہے جس کا
استعمال تم نہیں جانتے اور اندیشہ ہے کہ تمہاری بے احتیاطی سے یہ جسم کو مجروح کر دے
بلکہ اس سے گھبرا کر یہ کہتے ہیں کہ چاقو پھینک دو نہیں تو تن کٹی ہو جائے گی یا بلی پکڑ کے جائے گی
کتا کاٹ لے گا وغیرہ وغیرہ اور وہ خائف ہو کر چاقو پھینک دیتا ہے حالانکہ حقیقت ان
میں سے ایک بھی نہیں ہے اور نہ ہمارے اس کہنے کو کوئی کذب و دروغ کہتا ہے ۔
انبیاء کرام اور اکابر دین نے بھی تبلیغ و ہدایت کے لئے یہی فلسفہ اختیار کیا تھا کہ عوام
کی ذہنیت اور ان کے نارسیدہ عقول کو دیکھ کر اعمال و افعال کے عواقب و نتائج
اور اسباب و علل سمجھائے تھے۔ اگر ایک جاہل کے سامنے نماز کی حقیقی روح پر سمجھا دیا جائے
کہ اس میں یوں اجتماعی فوائد مضمر ہیں تو اس کے نزدیک نہ نماز میں کوئی اہمیت باقی رہیگی
اور نہ وہ اس کی پابندی کرے گا لیکن اگر اس سے صرف یہ کہہ دیا جائے کہ دیکھو یہ خدا
کا حکم ہے، خدا کا حق ہے جو تمہیں ادا کرنا ہے تو ایک خاص قسم کی کیفیت اس پر جاری
ہو جائے گی، وہ اس کا پابند ہو جائے گا اور آخر کار وہ نتیجہ از خود بغیر اس کے علم
کے پیدا ہو جائے گا جو نماز کی پابندی سے پیدا ہونا چاہئے۔

اس سلسلہ میں یہ امر بھی بحث طلب ہے کہ کسی معصیت کو خدا کا معاف کر دینا کیا معنی رکھتا ہے۔ میرا مسلک اس باب میں یہ ہے کہ جس طرح خدا کا کوئی حق بندہ پر نہیں ہے، اسی طرح خدا کو عفو و درگزر یا تعذیب و تعزیر سے بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یعنی جس طرح ایک انسان کے اعمال حسنہ خود اس کے لئے مفید ہیں اسی طرح اعمال سیئہ اس کے لئے مضر ہیں اور اس فائدہ و مضرت کا دوسرا نام ثواب و عذاب ہے۔ خدا کی شان اس سے بہت بلند و ارفع ہے کہ وہ ہمارے اچھے کاموں کی تحسین اور بُرے کاموں کی تشنیع کے لئے کوئی اہتمام کرے۔ ہمارا عذاب و ثواب، ہماری دوزخ و جنت خود ہمارے اندر اور ہمارے ساتھ ہے جو بالکل اسی طرح لازمی طور پر ظہور پذیر ہو جاتی ہے جس طرح دوا و درد کا نتیجہ چار۔ اگر ہم ان ہدایات پر عمل نہیں کریں گے جو شارع نے بتائے ہیں تو اس کا نتیجہ از خود ہمارے اور ہماری قوم کے حق میں بُرا پیدا ہوگا اور اگر اُن پر کاربند ہوں گے تو ہم خود اس سے فائدہ اٹھائیں۔ خدا نے جو سلسلہ اسباب و علل اور نتائج کا پیدا کر دیا ہے اس کے مطابق تمام مظاہر رونما ہوتے ہیں اور ہوتے رہیں گے جس میں خدا کی معافی یا سرزنش کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس جگہ یہ شک پیدا ہوتا ہے کہ کلام مجید میں اکثر جگہ خدا نے عذاب و ثواب کو اپنے سے متعلق کیا ہے۔ اس مسئلہ پر غالباً اس سے پہلے اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہوں لیکن مختصراً پھر بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ صرف مذہبی زبان کا انداز بیان ہے تاکہ عوام پر اس کا اثر ہو بلکہ ایک لحاظ سے حقیقت بھی ہے کیونکہ خدا کے بتائے ہوئے اصول سے منحرف ہو کر یا ان پر کاربند ہو کر نقصان یا نفع اٹھانا گویا اس کے مقرر کردہ نتائج کو

حاصل کرنا ہے جسے ہم بجا طور پر ہر وقت خدا سے منسوب کر سکتے ہیں۔

دوسرا شبہ یہ بھی وارد ہو سکتا ہے کہ خدا نے جا بجا "مغفرت ذنوب" کا بھی ذکر کیا ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہمارے کسی گناہ کا برا نتیجہ نہ پیدا ہوگا۔ بلکہ اس سے مدعا صرف یہ ہے کہ اگر ہم معاصی سے باز آ جائیں گے تو ان کے اثرات بھی رفتہ رفتہ محو ہو جائیں گے اور یہی گناہوں کی بخشش و معافی ہے۔

وحی کی حقیقت

(بہ جواب استفسار جناب محمد نذیر صاحب دہارادی بمبئی)

تین لفظ ہیں جو تقریباً ایک ہی معنی میں مستعمل ہوتے ہیں۔ وحی، الہام، القا۔ لغت میں وحی کہتے ہیں اشارہ کرنے کو، پیغام پہونچانے کو، جلدی کرنے کو اور لکھنے کو۔ وحی کے بعد اکثر صلہ الیٰ کا استعمال ہوتا ہے اور کبھی بغیر کسی صلہ کے بھی مستعمل ہوتا ہے۔ صلہ الیٰ کے ساتھ جب استعمال ہوتا ہے تو اس کا مفہوم اشارہ کرنا اور بھیجنا ہوتا ہے مثلاً وحی الیہ (اشارہ کیا اور پیام بھیجا اس کی طرف) وحی الیہ کلاماً (اس سے خفیہ بات کی) وحی الذبیحۃ (جانور کو جلدی ذبح کیا) وحی الکتاب (خط بھیجا) وحی مکتوب کے معنی میں بھی آتا ہے اور واحی جلدی کرنے والے کو کہتے ہیں۔ الہام تعدیہ مزید ہے لہم کا جس کے معنی نگلنے کے ہیں۔ اس لئے الہام کے معنی نگلوانے کے ہوئے۔ القا کے معنی ڈالنے اور پہونچانے کے ہیں

چنانچہ القی الیہ القول بات پہونچانے کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔

ان تینوں الفاظ میں ایک مفہوم بقدر مشترک موجود ہے یعنی خلاف معمول خارج سے کسی شے کا حاصل ہونا۔ اسی لئے جب ان الفاظ کے اصطلاحی معنی پیدا کئے گئے تو ان میں بھی خارج کی رعایت ملحوظ رہی اور چونکہ مذہب و نبوت کے باب میں تمام تعلیمات و تلقینات کا منبع ذات خدا ہے اس لئے وہ خارج از فضا ذات خدا سے متعلق کی گئی اور وحی، الہام، و القاء کے معنی ہوگئے اُن ہدایات و اشارات کے جو خدا کی طرف سے نبی کی طرف بھیجے جاتے ہیں۔ کلام مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی و الہام کا غیر ذات نبی کے لئے بھی استعمال ہوا ہے اور خدا نحل (شہد کی مکھی) کی طرف بھی وحی بھیجتا ہے (فاوحی ربک الی النحل) اور حضرت موسیٰ کی ماں کو بھی وحی بھیجی حالانکہ وہ نبیہ نہ تھیں (واذ اوحینا الی امک ما یوحی) اور حواریین مسیح کو بھی وحی بھیجی حالانکہ وہ نبی نہ تھے (واذ اوحیت الی الحواریین ان آمنو بی و برسولی) اس سے بھی زیادہ یہ کہ وہ شیاطین و اعدا نبی کو بھی وحی بھیجتا ہے (وکذالک جعلنا لکل نبی عدوا شیاطین الانس والجن یوحی بعضھم الی بعض زخرف القول غرورا) یہی حال الہام کا بھی ہے کہ فاجر و متقی دونوں کا فجور و تقویٰ الہامی چیز بتایا گیا ہے (فالھمھا فجورھا و تقواھا) اس سے یہ امر ثابت ہوگیا کہ وحی و الہام نام ہے اُس صلاحیت کا جو ایک مخصوص قوت ادراک کی وجہ سے ایک شخص کو کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر آمادہ کرتی ہے پس جس شخص میں یہ قوت دماغی ساخت کے لحاظ سے جتنی اچھی یا بُری، قوی یا ضعیف ہوگی، اسی قدر وہ ایک شخص متقی یا فاجر، ذکی الحس یا بلید الادراک ہوگا۔ گویا وحی یا الہام نام ہے۔ صرف ایک مخصوص

فطری حس (INSTINCT) کا جو ایک شخص قدرت کی طرف سے لے کر آتا ہے اور اسی کے زیر اثر اس سے مخصوص افعال سرزد ہوتے ہیں پھر چونکہ نبوت بھی اکتسابی چیز نہیں ہے بلکہ نبی پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنی دماغ کی ساخت، قوت ادراک کی نوعیت اثر و تاثر کی شدت، فطانت و ذکاوت کے لحاظ سے عام انسانوں سے بہت بلند ہوتا ہے اس لئے اس میں وہ کیفیت بہت شدید ہوتی ہے جسے وحی و الہام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انسان پر کسی خاص جذبہ یا کیفیت کا طاری ہونا حقیقتاً ایک نوع کی مقناطیسیت ہے جس سے انسان پہلے خود متاثر ہوتا ہے اور پھر دوسروں کو متاثر بناتا ہے پھر یہ کیفیت جتنی زیادہ قوی ہوگی اسی قدر وہ خود بھی متاثر ہوگا اور دوسروں کو بھی متاثر کرے گا۔ ہم ایک غمزدہ انسان کو دیکھ کر کیوں ملول ہو جاتے ہیں۔ ایک سوگوار ماں کا بین سن کر کیوں رنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ ہم ایک معصوم بچے کو دیکھ کر کیوں بچوں کی سی حرکتیں کرنے لگتے ہیں؟ اس لئے کہ اس کا غم، اس کی سوگواری اور اس کی معصومیت ایسا شدید حال ہے۔ ایسی قوی مقناطیسیت ہے کہ دوسروں کا اس سے متاثر ہو جانا ناگزیر ہے۔

جب کسی شخص پر کوئی خاص کیفیت طاری ہوتی ہے تو اس کی تمام قوتوں میں ایک مخصوص قسم کی تحریک پیدا ہوتی ہے اور بعض اوقات اس کے وہ قوائے کامنہ بھی ظاہر ہو جاتے ہیں جو اس سے قبل پوشیدہ و خوابیدہ تھے۔ مخصوص کیفیات کے تحت مخصوص افعال اس سے سرزد ہونے لگتے ہیں، مخصوص الفاظ اس کے منہ سے نکلنے لگتے ہیں اور دیکھنے سننے والوں کو حیرت ہوتی ہے کہ ایسا کیونکر ہوا۔ غصہ کی حالت میں کمزور انسانوں

کی طرف سے بھی غیر معمولی قوت کا اظہار دیکھا جاتا ہے اور انتہائی جوش وتاثر کے عالم میں جو الفاظ واعظ کی زبان سے نکل جاتے ہیں، وہ یوں معمولی حالت میں ممکن نہیں۔

نبی چونکہ فطرت سے نہایت ہی روشن دماغ اعلیٰ صلاحیت، غیر معمولی ذکاوت حس اور روحانی بلندی لے کر آتا ہے اس لئے اس کے اندر ہمیشہ نیک جذبہ پیدا ہوتا ہے اور جو جذبہ پیدا ہوتا ہے وہ انتہا درجہ کا قوی اور بڑی زبردست مقناطیسی قوت رکھنے والا ہوتا ہے۔ خود اس کے اوپر ایک کیفیت محویت واستغراق (TRANCE) کی طاری ہوتی ہے اور اس حالت کے تحت مخصوص نوع کے الفاظ اس کی زبان سے ادا ہوتے ہیں جن میں قصد وارادہ کو دخل نہیں ہوتا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اور قوت اس سے یہ سب کچھ کہلوا رہی ہے۔ اس حالت میں جو کچھ ایک نبی کی زبان سے نکلتا ہے اُسے وحی والہام کہتے ہیں اور اس قوت وصلاحیت کو مذہبی زبان میں لوگوں کو سمجھانے کے لئے روح القدس یا جبرئیل سے موسوم کیا جاتا ہے۔ وہ لوگ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ الہامی کتاب اسی معنی میں خدا کا کلام ہے جیسا کہ عام طور پر انسان کی گفتگو، حقیقتاً غلطی میں مبتلا ہیں، خدا جس طرح زمان ومکان کی قید سے آزاد ہے اسی طرح وہ الفاظ وکلام کی پابندی سے مبرا ہے۔ اس کی زبان کائنات کا ہر ہر ذرہ ہے اور اس کی گفتگو جابجا درخت کا ایک ایک پتہ۔ اس نے اپنی کلام کرنے کے طریقے خود بتائے ہیں اور نوع انسانی سے اس کا کلام جس انداز سے ہوتا ہے اس کا بیان قرآن پاک میں اس طرح کیا گیا ہے۔

"وما کان بشران یکلمہ اللہ الا وحیًا او من ورای حجاب او یرسل رسولا"

(انسان کی حیثیت یہ نہیں ہے کہ خدا اس سے کلام کرے۔ اب اس کے کلام کرنے کی صورت یہی ہے کہ یا تو اس پر کوئی وحی نازل کرتا ہے یا پردہ کی اوٹ سے خطاب کرتا ہے، یا کسی پیامبر کو بھیجتا ہے) یعنی یا تو وہ انسان میں کوئی خاص قوت یا ملکہ ایسا پیدا کر دیتا ہے جو اس کی رہبری کرے یا حجابات مادی اٹھا کر مظاہر و آثار پر غور و تدبر کرنے کی صلاحیت تفویض فرما دیتا ہے جس سے وہ غایت آفرینش کو سمجھ کر اشاراتِ قدرت کے مطابق عمل کرنے لگتا ہے یا پھر وہ کسی رسول کے ذریعہ سے تمام ہدایات انسان تک پہونچاتا ہے۔

وحی و الہام کے لئے کسی ملک و زمانہ کی قید ہے نہ قوم و ملت کی، وہ ہر شخص اور ہر ملک والے کے لئے ہے بشرطیکہ قدرت نے اس میں اس کی صلاحیت ودیعت کر دی ہو اور وہ اس صلاحیت سے فائدہ اٹھانا چاہے

قرآن مجموعہ ہے انھیں تمام الہامات کا جو وقتاً فوقتاً خاص کیفیت تاثر کے ماتحت رسول اللہ کے قلب پر نازل ہوئے اور جو مخصوص محویت و استغراق کے عالم میں آپ کی زبان سے نکلے۔ اس لئے جس مجموعہ کو قرآن کہتے ہیں وہ یقیناً کلام انسانی ہے (کیونکہ انسانی زبان سے متعلق ہے) لیکن ملا ہوا ہے الہام سے، وحی سے، اور انھی تاثرات روحانی سے جو حجابات کے اٹھ جانے کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ خدا نے قرآن کا جو مفہوم بتایا ہے وہ اس بیان کی تائید کرتا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :-

"وکذٰلک اوحینا الیک روحاً من امرنا" (اسی طرح ہم نے اپنے منشا سے تیری طرف اشارۂ روحانی کیا ہے) یعنی جسے کلام خدا کہا جاتا ہے وہ نتیجہ ہے صرف اشارۂ روحانی کا، ہدایت غیبی کا جو مخصوص الفاظ کی صورت میں رسول اللہ کی زبان سے ادا ہوئے۔

اس میں شک نہیں کہ وحی و الہام رسول اللہ سے پہلے بھی اور انبیار پر ہوا اور بعد کو بھی ایسے لوگ پیدا ہوئے اور ہوتے رہیں گے جو الہامات ربانی کے مہبط قرار دئے جا سکتے ہیں لیکن اس سے وہ تفاوت مراتب محو نہیں ہو سکتا جو قدرت نے تخلیق کے وقت ودیعت کر دیا تھا اور اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ کس نبی کے الہامات کس مرتبہ کے ہیں اور کس شخص میں کتنی صلاحیت ہدایات ربانی کے قبول کرنے کی پائی جاتی تھی۔

علمائے متقدمین نے وحی و الہام کے متعلق جو بحثیں کی ہیں ان کا ذکر اس موقعہ پر بیکار ہے کیونکہ انھوں نے جو کہا اس وقت کی ذہنیت کے لحاظ سے کہا اور اب ان کا اعادہ مفید یقین نہیں ہو سکتا لیکن اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ روایات اسلامی میں وحی و الہام کے متعلق جتنا حصہ جبرئیل سے متعلق ہے وہ سب تشبیہی انداز بیان کے ذیل میں داخل ہے اور جبرئیل سے مراد صرف وہ ملکہ و قوت فطری ہے جو رسول اللہ میں قبول وحی و الہام کے متعلق پائی جاتی تھی ورنہ کلام مجید نہ عرش پر منقوش تھا جسے پڑھ کر جبرئیل آتے اور رسول اللہ کے کان میں ڈال دیتے تھے اور نہ خدا کی زبان ہے جسے الفاظ کا محتاج ہونا پڑے۔

تعدد ازواج

(بجواب استفسار جناب ڈاکٹر سید ارشاد علی صاحب نکہت ہاپوڑی بھاگپور)

اس مسئلہ پر اس درجہ خامہ فرسائی کی گئی ہے کہ اس کا لطیف پہلو اب کاوش و سعی کے بعد بھی نگاہ کے سامنے نہیں آتا۔ اس لئے یہ صرف آپ کی خاطر ہے کہ میں اس پر گفتگو کرنے کے لئے آمادہ ہوتا ہوں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس کے تصور سے بھی غثیانی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ تعلیم اسلام پر منجملہ اور بہت سے اعتراضات کے ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ اس نے تعدد ازدواج کو جائز رکھا۔ اس کے جواب بھی اتنے دیے گئے ہیں کہ دفتر کے دفتر ان سے مرتب ہو سکتا ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ نہ معترضین نے حقیقت پر غور کیا اور نہ جواب دینے والوں نے اس کی طرف صحیح رہنمائی کی۔ میں اس جگہ اس کی تفصیل نہ بیان کروں گا، کیونکہ اول تو آپ کا استفسار اس کا مقتضی نہیں دوسرا سبب یہ ہے کہ اگر ایسا کروں بھی تو کوئی نتیجہ نہیں ہے تاہم اشارتاً اس قدر رمز و عرض کروں گا کہ شریعت اسلام میں ان مسائل کی نسبت جن کا تعلق تمدن و معاشرت سے ہے ہمیشہ ضرورت کے لحاظ سے تغیر و تبدل کی اجازت دی گئی ہے اور ایسا ہونا چاہئے تھا کیونکہ زمانہ کے ساتھ ساتھ قانون معاشرت کا بدلنا ضروری ہے اور بانی اسلام کو ایک غیر مسلم بھی کم از کم اتنا دانشمند تو ضرور جانتا ہوگا کہ وہ نظام تمدن کے اس اصول اور ہیئت اجتماعی کے اس اقتضاء سے واقف تھے پھر چونکہ نکاح کا مسئلہ ذی معاشرت کا حد درجہ

ضروری و اہم مسئلہ ہے اس لئے کہ ظاہر ہے کہ ہر ملک و زمانہ کی خصوصیات تمدن کے ساتھ ساتھ اس کے احکام میں بھی تغیر ہونا ضروری ہے لیکن اس نکتہ کی طرف اعتنا ذرا کہیں توجہ ہوتی ہے بلکہ خود ہمارے ہاں کے اکابر و اعاظم اس کو نظر انداز کر چکے ہیں۔ خیر یہ ایک نہایت دردناک داستان ہے اپنی کم فہمیوں اور ناعاقبت اندیشیوں کی، کہاں تک میں کہوں گا اور کب تک آپ سنیں گے۔ اسے کسی اور وقت کے لئے ملتوی کیجئے اور ابھی آپ اپنے استفسار کے متعلق میرا جواب سن لیجئے۔ آپ کا اعتراض یا اشتباہ یہ ہے کہ کلام مجید میں سورۂ نساء کی ایک آیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر تم عدل کر سکو تو چار تک شادیاں کر سکتے ہو اور دوسری جگہ اسی سورت میں یہ بھی لکھا ہے کہ تم عدل کسی طرح کر ہی نہیں سکتے۔ اس لئے منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ ایک سے زائد شادی ممنوع ہے۔ اذا فات الشرط فات المشروط۔

سورۂ نساء کی وہ آیت جس میں چار شادیاں تک کرنے کی اجازت دی گئی ہے یہ ہے:۔

وان خفتم الا تقسطوا فی الیتامیٰ فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ وثلٰث ورباع فان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ او ما ملکت ایمانکم ذٰلک ادنیٰ الا تعولوا۔

یعنی اگر تمھیں اندیشہ ہے کہ یتیموں کے باب میں تم انصاف نہ کر سکو گے تو جو عورتیں تمھیں اچھی معلوم ہوں ان میں سے دو تین چار تک شادی کر سکتے ہو لیکن تمھیں خوف ہے کہ تم ان کے درمیان عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی شادی کرنی چاہئے۔

یہاں سب سے پہلے غور طلب امر یہ ہے کہ ایک سے زائد نکاح کرنے کی اجازت دیتے وقت پہلے یتیموں کا ذکر کیوں کیا گیا ہے اور نکاح سے ان کا کیا تعلق ہے۔ یہ امر متفق علیہ ہے کہ سورۂ نساء جنگ احد کے بعد نازل ہوئی تھی اور اس لڑائی سے مسلمانوں

پڑ جو اثر پڑا تھا اس کے متعلق بعض ہدایات اس میں کی گئی ہیں جن میں ایک مسئلہ نکاح بھی تھا۔

چونکہ جنگ احد میں بہت سے مسلمان شہید ہو گئے تھے اور آئندہ جنگوں میں بھی ان کی جانیں ضائع ہونے کا احتمال تھا اس لئے یہ سوال قدرتاً پیدا ہونا چاہئے تھا کہ یتیموں اور بیواؤں کا کیا انتظام کیا جائے۔ وہ بیوہ عورتیں جن کے کوئی اولاد نہ تھی ان کے متعلق تو نکاح ثانی کا دروازہ آسانی کے ساتھ کھلا ہوا تھا اسی طرح وہ یتیم بچے جن کی مائیں نہ تھیں پرورش کے لئے لوگوں میں تقسیم ہو سکتے تھے لیکن مشکل تھی ان بیوہ عورتوں کی جو اپنے ساتھ بچے بھی رکھتی تھیں کیونکہ حسبۃ للہ بغیر کسی غرض کے صاحب اولاد عورتوں کی کفالت آسان نہ تھی۔ اس لئے خدائے کریم نے ہدایت فرمائی کہ تم یتیموں کے ساتھ اچھا سلوک نہ کر سکتے ہو تو ان کی ماؤں سے دو تین چار تک نکاح کر سکتے ہو۔ اس ہدایت سے یہ مقصود تھا کہ جب لوگ یتیم بچوں کی ماؤں کے ساتھ شادی کر لیں گے تو قدرتاً ان کی اولاد سے بھی دلچسپی پیدا ہو جائے گی اور ان سب کی پرورش ان پر اخلاقی و معاشرتی حیثیت سے فرض ہو جائے گی لیکن اس کے ساتھ عدل و انصاف کی بھی شرط لگا دی تاکہ اس اجازت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر لوگ محض ہوس رانی اپنا شعار نہ بنا لیں اور پھر اصل مقصود (یعنی یتامیٰ کے ساتھ دلسوزی و ہمدردی) فوت ہو جائے۔

مسلم کی ایک روایت کے مطابق اس آیت کا مطلب یوں بھی بیان کیا گیا ہے کہ اگر تم ڈرتے ہو کہ یتیم لڑکیوں سے نکاح کر کے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہ کر سکو گے

تو دو دو عورتوں سے چار تک نکاح کر سکتے ہو لیکن یہ مفہوم درست نہیں کیونکہ اول تو یہ معنی لینے میں بہت سے محذوفات تسلیم کرنے پڑیں گے اور دوسرے یہ کہ جو مقصود ہدایت کا ہے وہ پورا نہیں ہوتا کیونکہ اور عورتوں سے نکاح کی اجازت دینے میں یتیموں کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے اور پھر اس صورت میں تین تین چار چار نکاح کرنے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے اور اس کی اجازت بالکل بے محل سی بات ہے۔

آپ نے ایک دوسری آیت کا بھی حوالہ دیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عدل ممکن نہیں اور اس لئے ایک سے زائد نکاح بھی جائز نہیں ہو سکتا۔ آپ نے پوری آیت پر غور نہیں کیا ورنہ مطلب واضح ہو جاتا۔ پوری آیت یہ ہے:

ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النساء ولو حرصتم فلا تمیلوا کل المیل فتذروھا کالمعلقۃ وان تصلحوا وتتقوا فان اللہ کان غفورا رحیما یعنی اگر تم چاہو بھی تو عورتوں کے بارے میں عدل نہیں کر سکتے پس ان سے بے تعلق نہ ہو جاؤ اور نہ انہیں چھوڑ بیٹھو

اس کا تعلق بھی پہلی آیت سے ہے جس میں عدل کی شرط کے ساتھ چار نکاح تک جائز قرار دیئے گئے ہیں جب پہلی آیت میں عدل کی شرط تعدد ازواج کے لئے قرار پائی تو یہ سوال پیدا ہوا کہ صحیح معنی میں عدل کیسے ہو سکتا ہے جبکہ قلب انسانی محبت کے معاملہ میں مجبور ہے اور وہ اس کا برابر تجزیہ نہیں کر سکتا۔ اس سوال کا جواب دوسری آیت سے دیا گیا ہے اور بتایا گیا کہ عدل کا جو مفہوم تم نے قرار دیا ہے بیشک نا ممکن العمل ہے لیکن عدل سے مراد صرف یہ ہے کہ تم اپنی بیویوں کے حقوق برابر ادا کرو اور ان سے ایسا سلوک کرو جس سے یہ نہ معلوم ہو کہ تم نے انہیں چھوڑ دیا ہے یا بالکل

لغزش کرنے لگے ہو۔

نتیجہ یہ نکلا کہ سورۂ نسا میں جن عورتوں کے ساتھ چار نکاح تک کی اجازت دی گئی تھی وہ صاحب اولاد بیوہ عورتیں تھیں جن کے شوہر جنگ احد میں مارے گئے تھے تاکہ یتیموں کی پرورش ہو جائے اور رہا ہم عدل کی شرط صرف اس حد تک تھی کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے اور محبت سے مجبور ہو کر ایک کو دوسرے پر اس حد تک ترجیح نہ دی جائے کہ کسی سے قطع تعلق کی نوبت آ جائے جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ نکاح بھی منجملہ دیگر معاملات معاشرت کے ہے اور اس میں وقت و ملک کے لحاظ سے تغیر ہونا چاہیئے چونکہ اس وقت خاص سبب کی بنا پر تعدد ازدواج کی ضرورت لاحق ہو گئی تھی اس لئے اجازت دی گئی اور اب بھی جب کوئی اسی قسم کی صورت پیدا ہو کہ تعدد ازدواج معاشرت و تمدن کے مصالح کو پورا کرنے والا ہو تو اس کی اجازت ایسا فرد کے لئے ہو سکتی ہے جس کے ذریعہ سے یہ ضرورت پوری ہو سکے، یوں بلا ضرورت محض ہوس رانی کی بنا پر ایک شخص کیلئے ایک سے زیادہ شادی کرنا ہرگز درست نہیں ہو سکتا علی الخصوص اس وقت جبکہ موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے ہمارے لئے ایک بیوی کے حقوق ادا کرنا بھی دشوار ہو گیا ہے۔

دُعا اور توبہ

(سید ذاکر علی صاحب۔ شاہجہانپور)

"مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ہر دعا مقبول ہوتی ہے اور خدا دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے، اسی طرح توبہ کے لئے بھی کہا جاتا ہے کہ جب تک آفتاب مغرب سے نہ نکلے توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ آپ کی اس مسئلہ میں کیا رائے ہے اور دعا و توبہ کا صحیح مفہوم کیا ہو سکتا ہے؟"

دعا اور توبہ کا مسئلہ بھی منجملہ ان تمام مسائل کے ہے جن کا مفہوم مسلمانوں میں، عام طور پر بالکل غلط لیا گیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس غلطی نے بڑی حد تک اس قوم کے قوائے عمل کو مضمحل کر دیا ہے، دعا کے لغوی معنی پکارنے، طلب کرنے، مدد مانگنے اور طلب خیر کے ہیں۔ مذہب کی اصطلاح میں بھی معنی یہی رہتے ہیں لیکن ندا و استعانت کا تعلق خدا سے ہو جاتا ہے یعنی دعا نام ہے اُس التجا یا پکارنے کا جو خدا کے حضور میں پیش کی جائے۔ اس حد تک دُعا کا مفہوم اس قدر بلند، اس درجہ برتر و اعلیٰ ہے کہ شاید ہی اس سے بہتر طریقہ "خود اعتمادی" پیدا کرنے کا اور کوئی ہو لیکن ہمارے عقاید جس معنی میں اس سے متعلق ہیں وہ بہت پست و دنی ہے۔

عام طور پر مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ مصیبت و تکلیف میں، ہر کلفت و آزار میں خدا سے اس کے دور کرنے کی التجا کرنا کافی تدبیر ہے، اور اگر کوئی خواہش کسی چیز کے حصول کی

پیدا ہو تو ہم خدا سے اُسے طلب کر سکتے ہیں اور وہ ہمیں دینے کا ذمہ دار ہے کیوں کہ ادعونی استجب لکم کی نص قطعی قرآن میں موجود ہے حالانکہ دعا کی حقیقی روح یہ نہیں ہے اور نہ ایسا ہونا خدا کے بتائے ہوئے قانون فطرت کے موافق ہے۔ اس غلط فہمی نے رفتہ رفتہ ایسی نامعقول صورت اختیار کر لی کہ صحت و بیماری، ولادت و موت، دولت و افلاس سب کچھ دعا پر منحصر ہو گیا، اور دعا، گنڈا، تعویذ وغیرہ کی بنیاد پڑ گئی جو حد درجہ لغو و مہمل چیز ہے یہی نہیں بلکہ خود قرآن بطور تعویذ کے استعمال ہونے لگا۔ لاکٹ کے اندر بند کر کے گلے میں لوگ اس کو لٹکانے لگے اور اس طرح آخر کار خدا، قرآن اور دعا سب کا مفہوم واہمہ پرستی ہو کر رہ گیا ہے۔

نظام عالم ایک خاص اسلوب و قانون کے تحت چل رہا ہے اور تمام حوادث و واقعات اسی کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ اگر اس اصول کے خلاف ساری دنیا سر پٹک کر مر جائے تو بھی کوئی نتیجہ مترتب نہیں ہو سکتا اس لئے یہ سمجھنا کہ خدا ہر شخص کی دعا سن کر قبول کر لیتا ہے حد درجہ سفیہانہ اعتقاد ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو آج تک نہ کسی ماں کا بیٹا مرتا اور نہ کسی بیوی کا شوہر فنا ہوتا۔ علاوہ اس کے خدا سخت خلجان میں پڑ جاتا کہ وہ دو متضاد دعاؤں میں سے کس کو منظور کرے اور کس کو نامنظور۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب خدا کسی کی دعا قبول کرنے کا ذمہ دار نہیں ہے تو کیوں اس سے دعا کی جائے۔ اس کا جواب صرف یہی ہے کہ اگر دعا کا مفہوم یہی ہے کہ وہ ہر خواہش کو پورا کرتا ہے تو یقیناً دعا فعل عبث ہے، اور اس سے زیادہ احمقانہ حرکت کوئی نہیں ہو سکتی۔

ممکن ہے کہ اسلام سے قبل جو مذاہب رونما ہوئے ان میں دعا کا مفہوم یہی

رہا ہو اور روز کی خوراک بھی اسی سے طلب کی جاتی ہو مگر اسلام نے کبھی اس کاہلی کی تعلیم نہیں دی اور اس نے عملی زندگی کا وہ زبردست قانون سنا کر پیش کیا جسے کہیں "فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ۔ ومن یعمل مثقال ذرۃ شراً یرہ" سے تعبیر کیا گیا ہے کہیں "لا تزر وازرۃ وزر اخری" سے۔ میں اس کو اسی دنیا کے انجام سے متعلق سمجھتا ہوں اور جس چیز کا نام آخرت ہے وہ ہماری اس دنیا وی زندگی سے علیحدہ کوئی چیز نہیں ہے۔

جن لوگوں نے تعلیمات اسلام کا مطالعہ کیا ہے، اُن سے مخفی نہیں کہ اس سے زیادہ عملی زندگی پیدا کرنے والا کوئی مسلک نہیں، نہ وہاں واہمہ پرستی ہے نہ رسم و رواج نہ قانون فطرت کے خلاف کوئی تلقین کی گئی ہے اور نہ محض دعا سے اعتقاد آسانی برکات کے نزول کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اسلام کا ایک اور صرف ایک سادہ فلسفہ یہ ہے کہ:۔

"سپند وار بروں شو، سمند وار بیا"

اضطراب عمل، حرکت، ارتقاء، اقدام، اصلاح اس کا تنہا مقصود ہے۔ اور ترقی تمدن تہذیب اخلاق و تشکیل اجتماعی اس کا مقصد فرید۔ لیکن اسی کے ساتھ اس نے خدا سے بے نیاز و بے پروا ہو جانے کو بھی کبھی روا نہیں رکھا۔ اور اس میں بھی ایک خاص نفسیاتی نکتہ پنہاں ہے جو آسانی ہر شخص کی سمجھ میں آسکتا ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ جب وہ کوئی کام کرتا ہے، کسی سعی و عمل میں مصروف ہوتا ہے تو قدرتاً اس کا بھی متمنی ہوتا ہے کہ اس کا نتیجہ جلد پیدا ہو اور وہ اس سے متمتع ہو، لیکن چونکہ اسباب و حالات پر نہ اس کا اختیار رہتا ہے نہ پوری نظر، اس لئے بعض اوقات جب وہ اپنی کسی کوشش میں ناکام ہوتا ہے تو تو اس پر مایوسی و تعطل کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اور قوائے عمل میں اضمحلال، اس لئے

ضرور تھا کہ اس جذبہ کو فنا کیا جائے اور اسی بنا پر یہ تعلیم دی گئی کہ تمام حوادث طبیعی کی طرح انسانی مساعی کے نتائج بھی خدا ہی پیدا کرتا ہے اور ہر حال میں خواہ ہم کامیاب ہوں یا ناکام، اس کی مصلحتیں ہمارے لئے زیادہ مفید ہیں۔ اور اگر یہاں نہیں تو دوسرے عالم میں ان کا نتیجہ پیدا ہوگا۔ یہ ایک ایسی تعلیم ہے جو انسان پر کبھی مایوسی طاری نہیں ہونے دیتی اور اس کی عملی زندگی ہمیشہ تازہ رہتی ہے۔ ہر چند دوسرے عالم سے حیات بعد الممات کا عالم مراد لینا میرے نزدیک درست نہیں اور اس سے مقصود صرف یہ کہنا ہے کہ کوشش کرتے رہو، اگر آج نہیں تو کل کامیاب ہوگے لیکن چونکہ انسان زمانۂ نامعلوم سے مذہبی زندگی کا عادی چلا آ رہا ہے اور ہمیشہ مذہب ہی کی سمجھ میں آنے والی توجیہ کے ذریعہ سے اصلاح اُمم کا کام لیا گیا ہے اس لئے اسلام نے بھی اسی مصلحت اندیشی سے کام لیا۔ اور وہی تعلیم دی جو نفسیات مذہب کے تحت انسان کے دل و دماغ کو متاثر کرنے والی تھی۔

دعا بھی منجملہ ان دیگر تدابیر کے ہے جو کہ نوع انام کی اصلاح کے لئے اختیار کی گئیں۔ دعا کا مفہوم بھی صرف طلب خیر ہے یعنی خدا سے نیکی اور عمل کی توفیق طلب کرنا تاکہ اپنے اندر ولولہ پیدا ہو اور پورے جوش کے ساتھ ہم میدان عمل میں آ سکیں، اس میں نفسیاتی نکتہ یہ ہے کہ جس وقت انسان خدا سے دعا کرتا ہے تو اس کے اندر ایک کیفیت یقین تکمیل آرزو کی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ کیفیت اس میں خاص جوش پیدا کر دیتی ہے جو اصل راز کامیابی کا ہے۔ اس سے زائد دعا کا کوئی مصرف نہیں ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دعا کا مفہوم خدا پر بھروسہ کر کے ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھ جانا ہے وہ سخت غلطی پر ہیں اور اسی طرح وہ لوگ

بھی بیاستی پر نہیں ہیں جو یہ یقین کرتے ہیں کہ بغیر کوشش کے خدا ہماری آرزوؤں کی تکمیل کا ذمہ دار ہے۔

توبہ اور دعا میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ دعا نام ہے آیندہ کے لئے طلب خیر کا اور توبہ کہتے ہیں گزشتہ غلطیوں کے اعتراف اور ان سے احتراز کرنے کو۔ دعا کرنے والے کے دل میں توبہ کا خیال آنا ضروری ہے اور جو شخص توبہ کرتا ہے وہ معناً گویا طلب خیر بھی کرتا ہے۔ جو مدعا ہے دعا کا۔ رہا یہ امر کہ جب تک آفتاب مغرب سے نہ نکلے توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ انسان ہمیشہ اور ہر وقت توبہ کر سکتا ہے کیونکہ آفتاب مغرب سے کبھی نہ نکلے گا اور جب مغرب سے نکلے گا تو وہی مشرق ہو جائے گا۔ اسی قسم کی باتیں ہر زبان کی انشا میں پائی جاتی ہیں اور محاورات میں لغوی معنی مراد لینا درست نہیں۔

نفس و روح

(جناب سید علی متقی صاحب حیدرآباد)

کیا آپ اس مسئلہ پر روشنی ڈال سکتے ہیں کہ نفس انسانی اور روح میں کوئی فرق ہے اور اگر کوئی فرق نہیں ہے تو کلام مجید میں روح اور نفس کا علیحدہ علیحدہ ذکر کیوں آیا ہے۔ اگر یہ دونوں چیزیں علیحدہ ہیں تو ان دونوں میں کیا فرق ہے یعنی مرنے کے بعد نفس باقی رہتا ہے یا روح

موت کے بعد بقائے روح کی صورت کیا ہے اور کلام مجید میں جو روح انسانی کی حقیقت "قل الروح من امر ربی" کہہ کر بتائی گئی ہے وہ نفس انسانی سے متعلق نہیں ہو سکتی۔ الغرض میں نفس و روح کا فرق اور بقائے روح کی بابت آپ کے خیالات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

آپ کا استفسار بہت دلچسپ لیکن بہت تفصیل کا محتاج ہے۔ اگر میں اس مسئلہ میں تمام اکابر کے خیالات پیش کروں لیکن چونکہ میں کسی اور کی رائے سے استناد نہیں کرنا چاہتا بلکہ خود اپنی رائے اس باب میں ظاہر کروں گا، اس لئے غالباً زیادہ شرح وبسط کی ضرورت نہ ہوگی۔ البتہ آپ کے سوالات کی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھوں گا اور عمومی طور سے اس مسئلہ پر اس طرح اظہار خیال کروں گا کہ آپ کے سوالات کا جواب کسی نہ کسی طرح آجائے خواہ ترتیب کچھ ہو۔

قرآن میں نفس و روح دونوں لفظ آئے ہیں لیکن قبل اس کے کہ قرآنی مفہوم سے بحث کی جائے ان دونوں الفاظ کے لغوی معنی معلوم ہونا چاہیئے۔

لفظ نفس عربی زبان میں مونث و مذکر دونوں طرح استعمال ہوتا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ جب وہ مونث استعمال ہوتا ہے تو اکثر و بیشتر اس کے معنی روح یا جان کے ہوتے ہیں چنانچہ "خرجت نفسہ" روح یا جان نکلنے کے محل پر بولتے ہیں اور جب وہ مذکر استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد ذات یا شخص ہوتی ہے۔ نفس کے معنی مقصد و ارادہ کے بھی آتے ہیں۔ خون کے معنی میں بھی یہ لفظ مستعمل ہے اور جسم کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ اسی طرح

عظمت، ہمت اور رائے کا مفہوم بھی اس لفظ سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ روح کے معنی عربی میں اس چیز یا کیفیت کے ہیں جس سے حیات قائم رہتی ہے اور وحی والہام کے معنی میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے یعنی لغوی لحاظ سے نفس کا لفظ زیادہ وسیع المعنی ہے جس میں روح کے معنی بھی شامل ہیں اور لفظ روح سے وہ تمام معنی ظاہر نہیں کئے جاتے جو نفس کے ماتحت ہم نے ابھی ظاہر کئے ہیں۔ اب قرآن کو دیکھئے کہ اس میں یہ دونوں الفاظ کہاں اور کن معنی میں استعمال کئے گئے ہیں۔ میں نے جہاں تک غور کیا ہے کلام مجید میں لفظ نفس (باوجود اس کے کہ وہ مؤنث استعمال ہوا ہے) ہر جگہ ذات، ضمیر، حیز، اصلی جوہر اور نوع کے معنی میں آیا ہے اور لفظ روح: الہام و وحی، فراست و ذکاوت، قوت استیلا یا استعداد و ترقی کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے یعنی قرآن میں کسی جگہ نہ لفظ نفس بول کر اور نہ لفظ روح کہہ کر وہ روح مراد لی گئی ہے جس کے متعلق بقا یا عدم بقاء کا سوال پیدا ہوتا ہے گویا قرآن اس باب میں بالکل ساکت ہے اور اس نے اس روح سے متعلق بحث نہیں کی جو مابعد الطبیعیات سے متعلق ہے۔

سورۂ نسا میں ارشاد ہوتا ہے "خلقکم من نفس واحدۃ و خلق منہا زوجہا" (پیدا کیا تم کو ایک نفس یعنی ایک نوع سے اور پھر اس سے جوڑے پیدا کئے) میرے نزدیک اس جگہ نفس واحدۃ سے مراد کوئی مخصوص ذات یا ہستی نہیں ہے کیونکہ اگر یہاں نفس سے مراد کوئی خاص ذات مشخص ہستی ہوتی تو اس کا استعمال مذکر صورت میں ہوتا اور اس کی صفت واحدۃ کی بجائے واحد آتی۔ وہ مفسرین جو اس سے مراد آدم و حوا لیتے ہیں میرے نزدیک غلطی پر ہیں کیونکہ کلام مجید نے آدم و حوا کی انجیلی روایت کی بحیثیت واقعہ

ہونے کے کہیں تصدیق نہیں کی بلکہ اس کو صرف استعارہ و تشبیہ کے مفہوم میں ظاہر کیا ہے۔

سورۃ الفجر میں ارشاد ہوتا ہے "یا ایہا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ" (اے نفس مطمئن اپنے رب کی طرف مائل ہو اس حال میں کہ تو اس سے اور وہ تجھ سے خوش ہے) اس جگہ نفس کے معنی ضمیر (CONSCIENCE) کے لئے گئے ہیں نہ کہ روح کے جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ سیاق و سباق سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے جو میں نے بیان کیا کیونکہ اس صورت میں بدکاروں اور نیکوکاروں کے انجام سے بحث کی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ نیکی کے انجام کی مکمل ترین صورت یہی ہو سکتی ہے کہ انسان کا ضمیر مطمئن ہو کر حقیقی مسرت سے وابستہ ہو جس کو "ارجعی الی ربک" سے ظاہر کیا گیا ہے۔

لفظ نفس کا ضمیر کے معنی میں مستعمل ہونا سورۃ القیامۃ سے بھی ظاہر ہوتا ہے جہاں "ولا اقسم بالنفس اللوامۃ" کہہ کر نفس لوامہ سے ملامت ضمیر مراد لی گئی ہے۔ سورۃ الشمس میں بھی "و نفس وما سواہا" سے ضمیر انسانی مراد ہے جس کی تصدیق بعد کی آیت سے "فالہمہا فجورہا وتقواہا" سے ہوتی ہے۔

اب لفظ روح کے متعلق غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ قرآن میں کسی جگہ اس سے مراد وہ روح نہیں ہے جو عام طور پر سمجھی جاتی ہے

سورۃ الشعراء میں ارشاد ہوتا ہے "انہ لتنزیل رب العالمین، نزل بہ روح الامین" یہاں روح الامین سے وحی و الہام مراد ہے

سورۃ السجدہ میں خلقت انسانی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے "ثم سواہ ونفخ فیہ من روحہ" یہاں لفظ روح سے استعداد و ترقی و ملکہ ارتقا مراد ہے۔ عیسیٰ کے بیان میں جہاں

جہاں نفخ روح کا ذکر ہے اس سے مقصود وہی استعداد مراد ہے جو انسان میں اخلاق بلند و تزکیۂ نفس کا باعث ہوتی ہے

اس امر کا ثبوت کہ کلام مجید میں لفظ روح، عام متعارف روح کے معنی میں نہیں آیا ہے سورۃ النحل اور سورۃ المومن کی ان آیات سے ہوتا ہے

(۱) ینزل الملائکۃ بالروح من امرہ علیٰ من یشاء من عبادہ" (یعنی یہ ملکۂ قبول وحی و الہام ہر شخص میں پیدا نہیں ہوتا بلکہ جس کو اللہ چاہتا ہے عنایت کرتا ہے)

(۲) یلقی الروح من امرہ علیٰ من یشاء من عبادہ" (یعنی اللہ جس کو چاہتا ہے اس میں یہ روح یا استعداد پیدا کر دیتا ہے)

اگر روح سے مراد وہی انسانی روح ہوتی تو یہ نہ کہا جاتا کہ جس کو چاہتا ہے عنایت کرتا ہے کیونکہ وہ روح تو ہر شخص میں پائی جاتی ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل میں ایک آیت ہے "ویسئلونک عن الروح، قل الروح من امر ربی" (یعنی تجھ سے لوگ روح کے متعلق سوال کرتے ہیں سو کہہ دو کہ روح میرے خدا کے حکم سے ہے) عام طور پر سب نے یہی سمجھا ہے کہ اس آیت میں روح انسانی سے بحث کی گئی ہے اور روح کی حقیقت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے حالانکہ میرے نزدیک روح انسانی کا ذکر اس جگہ بھی نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہاں بھی روح سے مراد وحی و الہام ہے۔ اس کا ثبوت خود اس آیت کے سیاق و سباق سے ہوتا ہے۔

اس آیت کے بعد ہی یہ آیتیں نظر آتی ہیں "ولئن شئنا لنذہبن بالذی اوحینا الیک ثم لا تجد لک بہ علینا وکیلا۔ قل لئن اجتمعت الانس والجن علیٰ ان یاتوا بمثل ہذا القرآن

لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضہم لبعض ظہیرا۔

ان آیتوں سے یہ امر بخوبی واضح ہوتا ہے کہ رسول سے لوگوں نے روح انسانی کے متعلق نہیں دریافت کیا تھا بلکہ یہ پوچھا کہ "تم جو قرآن کی بابت کہا کرتے ہو کہ روح الامین اس کو لاتا ہے، اس کو خدا نازل کرتا ہے، الہام ربانی ہے، القاء خداوندی ہے۔ سو اس کی حقیقت کیا ہے یعنی تم نے جو اس کا نام روح رکھا ہے سو اس کی اصلیت کیا ہے" اس کا جواب دیا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہے اس کے حکم سے ہوتا ہے جس کو تم نہیں سمجھ سکتے۔

ظاہر ہے کہ اگر اس آیت سے مراد روح انسانی ہوتی تو فوراً ہی اس کے بعد قرآن اور وحی کے ذکر کا کوئی موقعہ نہ تھا۔ قرآن اور وحی کے ذکر ہی سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ یہاں روح سے مراد روح انسانی نہیں ہے بلکہ قبول وحی والہام کا ملکہ مقصود ہے اور اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ یہاں روح سے مراد روح انسانی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کو من امر ربی کہکر کسی حقیقت کا انکشاف نہیں کیا گیا اور جس طرح دنیا کے اور تمام مظاہر وآثار کو حکم ربانی کا نتیجہ بتایا گیا ہے اسی طرح روح کے متعلق بھی کہہ دیا ہے

حقیقت یہ ہے کہ روح کا مسئلہ جس قدر اول دن دقیق تھا اسی قدر آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا، کیونکہ اس کی بنیاد اگر مفروضات پر نہیں تو قیاسات پر ضرور رہے اور چونکہ یہ قیاسات ہماری اسی دنیاوی زندگی کے مراحل ومنازل تاثرات وکیفیات کو دیکھ کر قایم کئے گئے اس لئے وہ ہمیشہ معرض بحث میں رہیں گے اور کسی پر درجہ یقین کی

حد تک اعتبار نہیں کیا جا سکتا اور اگر کوئی یقین کی صورت ہے تو صرف یہ کہ ہم مرنے کے بعد تمام کارگاہ کو اسی دنیا کی طرح تصور کریں لیکن ایسا تصور کرنے کے کیا وجوہ ہو سکتے ہیں؛ یہ بھی سوائے قیاسات کے اور کچھ نہیں ہیں۔

متقدمین و متاخرین نے سینکڑوں کتابیں اس مسئلہ روح پر تصنیف کر ڈالی ہیں اور اگر ہم پہلے ہی سے یہ یقین کر لیں کہ ان کے لکھنے والے یکسر حقیقت نگار ہیں تو بیشک اس اعتقاد کی بنا پر ہم انھیں صحیح سمجھ سکتے ہیں لیکن اگر آپ اس اعتقاد سے خالی الذہن ہو کر یہ معلوم کرنا چاہیں کہ انھوں نے اپنے نظریات اس مسئلہ میں کیوں کر قائم کئے یا ان کی علمی توجیہہ کیا ہو سکتی ہے، اور ہم کیوں ان کو باور کریں تو اس کا جواب ان کی کتابیں کیا معنی اگر وہ خود زندہ ہو کر سامنے آ جائیں تو کوئی نہیں دے سکتے۔

بقائے روح کا خیال جیسا کہ ہم نے اپنے مضمون "مذہب کی ضرورت" میں بیان کیا ہے بہت قدیم چیز ہے اور ابتدائے آفرینش سے وہم و خیال کی صورت میں اس کا وجود چلا آتا ہے کیونکہ انسان کے جذبۂ محبت کا بھی اقتضا یہی تھا کہ جو محبوب ہستیاں اس سے جدا ہو چکی ہیں ان کی یاد قائم رکھنے کے لئے کسی حقیقی تصور کو پیدا کرے اور خوف کا بھی یہی تقاضا تھا کہ جو متسلط یا منکر ہستیاں گزر چکی ہیں ان سے ڈرتے رہنے کے لئے ان کے اثرات کو قائم و محفوظ سمجھے۔ اس خیال کو پیش نظر رکھ کر انسان نے بقائے روح کا عقیدہ پیدا کیا اور جب مذاہب اخلاق کی بنیاد پڑی تو مصلحین قائدین مذہب نے انسان کے اس قدیم خیال سے فائدہ اٹھا کر معاد کی صورت پیدا کی جس میں نہ صرف روح انسانی بلکہ اس کے جسم کا بھی مبتلائے عذاب و مستحق ثواب ہونا ظاہر کیا اور چونکہ انسان

صرف انھیں باتوں سے متاثر ہو سکتا ہے جن کا اس کو تجربہ ہوتا رہتا ہے اس لئے عذاب و ثواب کی صورتیں بھی وہی بیان کی گئی جن سے ہم اس دنیائے آب وگل میں متاذی یا مسرور ہوتے ہیں۔

الغرض بقائے روح کا مسئلہ علمی دنیا کا کوئی جدید مسئلہ نہیں ہے، بلکہ دورِ جہل و تاریکی کا عقیدہ ہے جس سے اہل مذہب نے فائدہ اٹھانے کے لئے مسلمات عالم اور حقائق ثابتہ میں داخل کر دیا درانحالیکہ اس کی بنیاد صرف وہم و خیال پر قائم ہوئی اور آج بھی کوئی علمی اور اخلاقی سبب اس کو حقیقت ثابت کرنے کے لئے پیش نہیں کیا جا سکتا۔

اسی سلسلہ میں یہ گفتگو ہو سکتی ہے کہ چونکہ انبیائے کرام علم لدنی رکھتے تھے اور ان کو براہِ راست اس معدن فیض و علم سے معلومات حاصل ہوتی تھیں جسے خدا کہتے ہیں اس لئے ان کی تعلیمات کو صحیح نہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے لیکن اس میں وہی اعتقاد کی روح کام کر رہی ہے۔ علم لدنی یا علم وحی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جب وہ کسی امر کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے تھے تو فوراً آنکھ بند کرتے ہی ان پر تمام حالات منکشف ہو جاتے تھے، بلکہ اس سے مقصود یہ ہے کہ فطرت کی طرف سے وہ اچھا سوچنے والا دماغ لے کر آتے تھے اور جس حد تک درستیٔ اخلاق یا انتظام تمدن کا تعلق ہے وہ اپنے وقت و زمانہ کے لحاظ سے اچھا قانون بنانے والے اور بہتر تعلیمات پیش کرنے والے تھے۔ علوم دنیا یا حقائق اشیاء سے انھیں کوئی واسطہ نہ تھا اور ان امور سے بحث کرنا ان کے فرائض میں داخل تھا۔ اگر انھوں نے بقاء روح کے خیال کو شائع کر کے معاد کا یقین لوگوں کو دلایا تو اس لحاظ سے بالکل صحیح و

درست سمجھا جائے گا کہ اس سے درستیٔ اخلاق پر اثر پڑا لیکن جس وقت محض حقیقت کے لحاظ سے اس پر گفتگو کی جائے گی تو ہم اس کے ماننے پر صرف اس لئے مجبور نہ ہوں گے کہ فلاں پیغمبر یا فلاں ولی نے ایسا بیان کیا ہے بلکہ ہم یہ معلوم کرنے کے مستحق ہوں گے ہم اسے کیوں ایسا سمجھیں اور اس کے صحیح سمجھنے کے لئے کیا دلائل ہو سکتے ہیں؟

جو لوگ بقاء روح کے قایل ہیں ان کی سب سے زیادہ زبردست دلیل یہ ہے کہ اگر ہم اس کے قایل نہ ہوں گے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا نے یہ سب کچھ عبث پیدا کیا۔ حالانکہ اس سے زیادہ کمزور دلیل کوئی نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کو عبث کہنا بھی اپنے ہی اصول حیات و معاشرت کے لحاظ سے ہے کہ جب ہم کوئی کام کرتے ہیں تو اس کے نتیجہ کے منتظر ہوتے ہیں۔ ورنہ جس وقت آپ خلاقِ آفریدگار کی بے نیازیوں پر نگاہ ڈالیں گے تو معلوم ہوگا کہ جس کا شغل ہی ہر وقت بنانا بگاڑنا ہے جو ہر لحظہ بے شمار دنیائیں پیدا کر کے فنا کرتا رہتا ہے، وہ نتیجہ، علت، وجہ، سبب اور اس فانی دنیا سے بالکل بے نیاز ہے اور اگر وہ انسان کو فنا کرنے کے بعد بالکل کالعدم کر دے اور کوئی چیز از قسم روح یا نفس اس کی یادگار باقی نہ رہے تو اس میں کونسا استحالۂ عقلی پایا جاتا ہے بلکہ اگر غور کیا جائے تو یہی زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔

وہ شخص جو بقائے روح یا قیام معاد کا قایل ہے وہ ایسے مفروضات و مباحث کا سلسلہ قائم کر دیتا ہے جو کبھی ختم ہونے والے نہیں اور ذہن انسانی کو مشوش کر دیتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اگر روح قدیم ہے تو اس کے قیام کی کیا صورت ہے۔ زمان و مکان سے اس کا تعلق ہوگا یا نہیں جسم سے علیحدہ رہنے کی حالت میں اس کے تاثرات کی کیا کیفیت ہوگی؟ پھر بقاء اگر

انکار کر دیجیے کیونکہ عذاب و ثواب جس چیز کا نام ہے اس کو ہم بغیر بقاء روح تسلیم کئے ہوئے بھی اس دنیا میں متعین کر سکتے ہیں جو زیادہ قریب الفہم اور کار آمد بات ہے۔

اس سلسلہ میں یورپ کے موجودہ روحانیین اور ان کی تحقیقات کا ذکر فضول ہے کیونکہ اس وقت تک کوئی ثبوت ان کی طرف سے بقائے روح کا پیش نہیں کیا گیا اور جو واقعات و حالات بیان کئے جاتے ہیں اول تو ان میں اکثر مکر و فریب ہے اور بعض ایسے ہیں جو نتیجہ ہیں خود اپنے فکر و اعتقاد کا اور حقیقت سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔

مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں

(جناب محمد علیم الدین صاحب۔ مدراس)

عرصہ ہوا آپ نے صفحات نگار میں عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا جس کی کافی مخالفت ہوئی تھی لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے آپ کی اس تحقیق کا تعلق صرف قرآنی روایات اور مذہبی عقاید سے تھا لیکن ضرورت اس کی معلوم ہوتی ہے کہ مذہب سے بالکل علیحدہ ہو کر شخص ثالث کی حیثیت سے غور کیا جائے کہ تحقیق تاریخی اس مسئلہ میں کیا کہتی ہے اگر وقت ہو تو کبھی اس طرف بھی توجہ فرمائیے۔

آپ کا یہ استفسار بہت زمانہ سے میرے پاس محفوظ تھا اور چونکہ آپ نے

بمعنی خلود ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اس کو خدا کا ہمسر بنا دیا گیا۔ اگر خلود نہ ہوگا تو پھر اس بقا کے بعد فنا کیوں اور کیسی؟ عذاب و ثواب سے کیا فائدہ ہے جبکہ دوبارہ اس روح کو دنیائے عمل میں لوٹ کر آنا نہیں ہے، کیوں ہم ہاویہ، فردوس، پل صراط، میزان، حور و قصور کوثر و سلسبیل، حساب و کتاب وغیرہ کو صحیح باور کریں، کون سے عقلی دلائل ان کے حق میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ اگر ان سے انکار کیا جائے تو خدا کا کیا نقصان ہوتا ہے، اس پر کیا الزام آتا ہے۔ الغرض اسی طرح کے ہزاروں مسائل و مباحث ایسے پیدا ہو جاتے ہیں نہ جن کو آج تک حل کیا گیا اور نہ آئندہ ممکن ہے لیکن دوسرا شخص جو بقاء روح کا قائل نہیں اور مرنے کے بعد نسیاً منسیا کا ماننے والا ہے وہ ان تمام مباحث کے دروازہ کو بند کر دیتا ہے اور کوئی اعتراض اس کے اس عقیدہ پر عقل کی طرف سے وارد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جہاں تک قدرت خداوندی کا تعلق ہے اس صورت میں اس کا ظہور زیادہ روشن ہو جاتا ہے اور کائنات کی وسعت، عالم تخلیق کی بے پایانی کو دیکھتے ہوئے یہی عقیدہ قرین عقل و انصاف معلوم ہوتا ہے کیونکہ خلق و فنا کا سلسلہ اسی طرح ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے اور چلتا رہے گا اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ جن مخلوقات کو وہ فنا کر دے، ان کے اثر یا کسی جزو یا کسی کیفیت و تاثر کو باقی رکھے۔ اس کا کام یہی ہے کہ جس کو مٹا دیتا ہے، بالکل محو کر دیتا ہے اور اسے کوئی غرض نہیں کہ اس کا سلسلہ پھر کسی صورت سے قائم رکھے۔

یہ ہیں دونوں صورتیں بقاء روح اور عدم بقاء روح کے ماننے کی اس لئے آپ مجھ سے کیا دریافت کرتے ہیں کہ حقیقت کیا ہے اگر آپ بقاء روح کے خیال کو ضروری سمجھتے ہیں اور آپ کا اطمینان نفس اسی طرح ہوتا ہے تو مانئے اور اگر نہیں ہوتا تو بیشک

ایک نہایت ہی اہم مسئلہ کی طرف توجہ دلائی تھی اس لئے میں وقت و موقع کا منتظر رہا۔ دسمبر [illegible]ء کی نصف شب گزر چکی تھی۔ کلیساؤں کے گھنٹے سال نو کی آمد کا اعلان کر رہے تھے کہ دفعتہً آنکھ کھلی اور میرا خیال اس رسم کلیسائی سے مذہب عیسوی کی طرف منتقل ہوا اور پھر جناب مسیح کی مقدس ہستی سامنے آئی۔ اسی کے ساتھ آپ کے اس استفسار کا خیال اور میں نے یہی مناسب سمجھا کہ سال نو کا آغاز اسی گفتگو سے کیا جائے اور اس نے اس اولین ساعت میں اس کی طرح ڈالدی گئی

چونکہ بحث نہایت اہم و تفصیل طلب تھا۔ ضرورت وقت و فرصت کی تھی اور بدقسمتی سے زمانہ میرے لئے بہت زیادہ مصروفیت و انہماک کا ہوتا ہے اس لئے میں نہ جلد اس کو ختم کر سکا اور نہ شاید کر سکوں۔ بہرحال تعمیل ارشاد میں اس کی ابتدا اس ہفتے کرتا ہوں اور نہیں کہہ سکتا کہ کب تک اس کا سلسلہ قائم رہے لیکن چونکہ گفتگو غیر دلچسپ نہ ہوگی اس لئے امید ہے کہ آپ اور دیگر حضرات اس سے گھبرائیں گے نہیں اور کافی غور و تامل کے ساتھ بحث کے تمام پہلوؤں پر نگاہ ڈالیں گے کیونکہ مقصود صرف تحقیق حق ہے جو عصبیت و ذہنیت کی قیود سے بہت بلند چیز ہے۔

مذاہب عالم کی تاریخ میں سب سے زیادہ عجیب غریب اور پر لطف واقعہ جو اس وقت بھی بعض زندہ مذاہب سے عقاید و تعلیمات کا ایک جزو ضروری سمجھا جاتا ہے مسیح ناصری کے وجود کا ہے۔ ان کے واقعہ پیدائش سے لے کر صلیب پر چڑھائے جانے تک بلکہ اس کے بعد بھی ان کے آسمان پر اٹھا لئے جانے اور پھر دوبارہ رہنے

زمین پر نزول اجلال فرمانے تک جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ اس قدر دلچسپ ہے کہ بسا اوقات اس کی اہمیت مشتبہ معلوم ہونے لگتی ہے اور ذہن مجبور ہو جاتا ہے کہ اس کی نسبت روایات سے علیحدہ ہو کر بھی غور کرے کہ جو کچھ مسیح کے متعلق مذہبی کتابوں میں بیان کیا جاتا ہے اس میں واقعی کوئی اصلیت ہے یا صرف "دیو پری" کی سی کہانیاں ہیں جو غلطی سے داخل مذہب ہو گئی ہیں۔

اس مسئلہ پر گفتگو کے دو طریقے ہیں: ایک تو یہ کہ ہم اپنے آپ کو عیسوی مذہب یا کسی اور اپنے مذہب کا سچا معتقد سمجھ کر جو اس واقعہ کی صحت کا موید ہے پہلے ہی سے یقین کر لیں کہ جو کچھ ان مذاہب کی کتابوں میں بیان کیا گیا ہے وہ حقیقت ہے اور بغیر کسی تاویل و حجت یا تبصرہ و تنقید کے مان لینے کے قابل۔ اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مذہب و مذہبیت سے بالکل خالی الذہن ہو کر تاریخی و علمی تحقیق کو ذریعہ یقین بنائیں۔ اس میں شک نہیں اول الذکر صورت ضمیر انسانی کے لئے بہت محفوظ و معصوم کیفیت رکھتی ہے لیکن جس حد تک علم و تحقیق کی جستجو متعلق ہے اس کی کمزوری کسی سے مخفی نہیں اور وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس ذہن کو مطمئن نہیں کر سکتی جس کو خود سمجھ کر کسی بات کے ماننے کا چسکا پڑ گیا ہے۔

کئی سال ہوئے نگار کے باب الاستفسار میں مسیح کے متعلق قرآن کے بیانات سے بحث کر کے اپنے خیالات ظاہر کر چکا ہوں جس نے مسلمان و عیسائی دونوں طبقوں میں ہیجان برپا کر دیا اور اس کے جواب میں بعض مشنری سوسائٹیوں نے مطبوعہ پمفلٹ ملک کے عرض و طول میں ہر جگہ تقسیم کئے۔ کیونکہ جو کچھ میں نے لکھا تھا وہ ان عام قصص و روایات کے خلاف تھا جو یہ دونوں جماعتیں صحیح باور کرتی ہیں اور میری تحریر ان کے نزدیک اصول مذہب کو درہم برہم کرنے والی تھی۔

میں نے جو کچھ کہا تھا وہ یہ تھا کہ قرآن سے ان روایات کی تصدیق نہیں ہوتی جو جناب مسیح کی پیدائش، وفات، احیاءِ ثانیہ وغیرہ کے متعلق عیسائیوں میں پائی جاتی ہیں لیکن چونکہ قرآن سے تاویل کے بعد یا بغیر تاویل کے ایک شخص اُن روایات کی صحت بھی کر سکتا ہے؛ اس لیئے ضرورت اس امر کی ہے کہ مذہبی روایات سے ہٹ کر تاریخی و علمی جستجو کی جائے کہ حقیقت کیا نکلتی ہے۔ اگر نتیجہ وہی نکلے جو پہلے عرض کر چکا ہوں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ قرآن کی آیات کا مفہوم جو میں نے ظاہر کیا ہے وہی صحیح ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ بیان کیا جاتا ہے درست نہیں کیونکہ اس صورت میں علم و تاریخ دونوں کی شہادت میرے بیان کو قوی تر بنا دے گی اور پھر غالباً کسی کو انکار کی گنجائش نہ ہوگی آج کی صحبت میں اسی نقطہ نظر سے بحث کروں گا امید ہے کہ قارئین بحث کے ہر ٹکڑے کو پڑھیں گے اور خود بھی اپنی جگہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ میں جس نتیجہ پہ پہنچا ہوں وہ غلط تو نہیں۔

چونکہ یسوع ناصری کی حیات و وفات کے متعلق جو حالات دنیا کو معلوم ہوتے ہیں وہ اناجیل اربعہ یا صحائف (عہد نامہ جدید) کے ذریعہ سے معلوم ہوتے ہیں اس لئے سب سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ خود اناجیل اربعہ کی کیا اہمیت ہے اور ان پر کس حد تک اعتبار کیا جا سکتا ہے۔

آپ کسی بڑے سے بڑے ماہر انجیل یا عیسائی سے دریافت کیجئے کہ انجیلوں کا مصنف کون تھا تو وہ کوئی یقینی جواب نہ دے سکے گا کیونکہ حقیقتاً آج تک یہی نہیں معلوم ہو سکا کہ انجیل کا اصل لکھنے والا کون ہے کیونکہ ہر انجیل کے عنوان پر "بقول متی" یا "حسب بیان متی" درج ہے اور یہ کہ مصنف متی ہے کہیں نہیں لکھا گیا بعض کا خیال ہے کہ تیسری انجیل واقعی لوقا کی ذاتی تحقیق کا

نتیجہ تھی لیکن خود لوقا کا بیان یہ ہے کہ میں ان بیانات کا عینی شاہد نہیں ہوں بلکہ جس طرح مجھ سے قبل اور بہت سے آدمیوں نے یسوع کے حالات قلمبند کئے ہیں، اسی طرح میں بھی لکھتا ہوں۔"

انجیلیں چار ہیں۔ مرقس، متی، لوقا، یوحنا۔ ان میں سب سے پرانی انجیل مرقس کی مانی جاتی ہے جو مسیح کے تقریباً ستر سال بعد لکھی گئی اس کے بعد متی اور لوقا کی انجیلیں ہیں جو ۹۰ سال بعد مرتب کی گئیں اور پھر یوحنا کی انجیل ہے جو دوسری صدی کی پیداوار ہے۔ اچھا اب آئیے ان روایات پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالیں جو مسیح کے باب میں ان انجیلوں کے اندر پائی جاتی ہیں۔

کنواری کے پیٹ سے پیدا ہونا اور مرکر دوبارہ زندہ ہونا یہی دو خاص واقعے مسیح کے متعلق ایسے ہیں جو معجزہ کی صورت سے بیان کئے جاتے ہیں لیکن ان دونوں باتوں کی جو شہادتیں اناجیل میں پائی جاتی ہیں ان میں باہم سخت اختلاف ہے۔ انجیل مرقس کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ یہ سب سے پرانی انجیل ہے اور اس میں سب سے زیادہ صاف حال بیان کیا گیا ہے لیکن شاید یہ سن کر حیرت ہوگی کہ یہی انجیل تحریفات کا دفتر بے پایاں ہے۔ اس انجیل کا قدیم ترین نسخہ وہ ہے جو باب ۱۶ آیت ۸ پر ختم ہوتا ہے اور آخری باب کا باقی حصہ کسی اور شخص نے بعد میں اضافہ کیا ہے، کیونکہ اس حصہ کا طرز تحریر نہ صرف یہ کہ ابتدائی حصہ سے بالکل علیحدہ ہے بلکہ اس کی تردید بھی کرتا ہے۔ مثلاً ساتویں آیت میں ایک فرشتہ عورتوں سے کہتا ہے کہ تم جاؤ اپنا راستہ لو، اس کے شاگردوں اور پطرس سے کہہ دو کہ وہ تم سے پہلے شہر گلیل کو جائے گا اور تم اسے وہیں

دیکھو گے جیسا کہ اس نے تم سے کہا تھا۔" قدیم مصنف انجیل کا بیان ہے کہ یہ بات ان تینوں عورتوں سے کسی نے نہیں کہی کیونکہ وہ ڈرتی تھیں لیکن جدید مصنف کا بیان ہے کہ ایک عورت کو یسوع کا دیدار ہوا اور اس نے یسوع کے شاگردوں سے یہ ماجرا بیان کیا لیکن کسی نے یقین نہیں کیا چنانچہ اس کے بعد یسوع نے کسی دوسرے پیکر میں اپنے شاگردوں سے گفتگو کی مگر کسی کو یقین نہیں آیا حالانکہ بقول مرقس یسوع نے ان لوگوں سے اپنے دوبارہ جی اٹھنے کی پیشین گوئی کر دی تھی۔

افسوس ہے کہ انجیل مرقس کا ابتدائی حصہ بھی قابل اعتبار نہیں۔ اسی حصہ میں بیان کیا گیا ہے کہ "تین عورتیں اتوار کے دن علی الصباح گئیں تاکہ (خداوند) کے جسم پر خوشبودار مسالے ملیں" لیکن مصنف مذکور کو اس بات کا خیال نہیں رہا کہ یہودیہ (JUDEA) جو ایک نہایت گرم ملک ہے اور جہاں لاش دن کے دن سڑ جاتی ہے اپریل کے مہینہ میں مرنے سے دو روز بعد لاش پر خوشبودار مسالہ ملنے کا خیال کسی شخص کے دل میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ علاوہ ازیں ان عورتوں کی نسبت یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ یہ بات جانتی تھیں کہ یسوع کی قبر کے منہ پر ایک بھاری پتھر رکھا ہوا ہے جسے وہ ہٹا نہیں سکتیں۔ باوجود اس علم کے بھی وہ کسی مرد کو اپنے ساتھ نہیں لے جاتیں اور وہ حیران ہو کر یہ بھی سوچتی ہیں کہ غار کے دہانہ سے پتھر کی سل کیونکر ہٹائیں گے۔ پھر ان عورتوں کو قبر کے اندر ایک نوجوان مرد بیٹھا ہوا نظر آتا ہے۔ باوجود ان تمام واقعات اور حوادث کے وہ یہودی عورتیں خاموش رہتی ہیں حالانکہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ تمام ماجرا لوگوں سے بیان کریں مگر وہ گھر جا کر کسی سے یہ حال نہیں کہتیں حتی کہ یہاں تک بھی بیان نہیں کرتیں کہ خداوند کی لاش

غائب ہو گئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انجیل مرقس میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ تحریف و تضاد کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ اسی سلسلہ میں اور بھی قابل غور ہیں یعنی (۱) یوسف (اریمتیاہ) نے دفن کرنے کے لئے لاش کو پوری طرح تیار کر لیا تھا (ملاحظہ ہو باب ۱۵ آیۃ ۴۶) (۲) صلیب کی حفاظت کے لئے جو رومی سپاہیوں کا دستہ تعینات تھا اس کے افسر سے بھی یسوع کی شان میں یہ کہلایا گیا کہ "یقیناً یہ شخص خدا کا بیٹا تھا" (۳) یسوع کے رشتہ دار اور شاگرد عرصہ دراز تک اس کی کرامتیں اور معجزے دیکھ چکے تھے وہ یہ بھی جانتے تھے یسوع خدا ہے جس نے جسد خاکی قبول کر لیا ہے۔ اور ان کا یہ بھی ایمان تھا کہ اس نے بنی نوع انسان کے گناہ کا کفارہ بن کر صلیب پر اپنی جان دی مگر با ایں ہمہ وہ لوگ خوش ہونے کے بجائے خوف زدہ تھے اور پھوٹ پھوٹ کر روتے تھے

متی کی انجیل بلحاظ قدامت انجیل مرقس کے بعد انجیل متی کا نمبر آتا ہے لیکن اس شخص نے وفات اور احیاء ثانیہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے بیان مرقس کی تردید ہوتی ہے۔ مثلاً قبر یسوع کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ یہودیوں نے قبر کو بند کر کے اس پر پہرہ لگا دیا تھا اس کے معنی یہ ہیں کہ یہودی علماء کو خیال تھا کہ چونکہ یسوع اپنے احیاء ثانیہ کی نسبت پیشین گوئی کر چکا ہے اس لئے ممکن ہے کہ اس کے شاگردوں میں سے کوئی شخص یسوع کی لاش کو قبر سے باہر نکال لے جائے اور پھر یہ اعلان کر دے کہ وہ مر کر جی اٹھا اس کے بعد متی نے ایک شدید زلزلہ کا ذکر کیا ہے جس کا حال کسی تاریخ میں درج نہیں ہے لیکن جب قبر یسوع کا پتھر ہٹانے کے لئے زلزلے سے بھی کام نہ چلا تو

متی نے ایک فرشتہ پیدا کیا جس نے پتھر کو لڑھکا دیا اور پھر اُسے اس پتھر پر بٹھا دیا (مرقس نے فرشتہ کو قبر کے اندر بٹھایا تھا) اس فرشتۂ خداوندی کا جلال دیکھ کر رومی سپاہ کا دستہ لرزہ براندام ہو جاتا ہے (انجیل مرقس میں عورتوں کے فرشتہ کے بجائے ایک اجنبی نوجوان مرد دیکھا تھا جس کے حکم کی وہ تعمیل تک نہیں کرتیں)

متی کی انجیل میں دو عورتیں (مرقس کی انجیل میں عورتوں کی تعداد تین ہے) جو خوف زدہ ہونے کے بجائے فوراً خوش خوش دوڑ جاتی ہیں تاکہ شاگردانِ یسوع سے تمام حال بیان کریں۔ اسی دوران پر ایک حاشیہ یہ بھی بڑھا دیا گیا کہ یسوع ان کو یروشلم جاتا ہوا ملا۔ (مرقس میں یسوع کی صورت ایک عورت کو عرصہ بعد نظر آئی تھی) پھر رومی سپاہیوں کی نسبت یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ جاتے ہیں اور بڑے بڑے مقتدایانِ یہود سے تمام ماجرا بیان کرتے ہیں بعد ازاں وہ مقتدایانِ دین سپاہیوں کو رشوت دے کر یہ کہلا دیتے ہیں وہ سب کے سب پہرہ پر سو گئے تھے لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ باب ۲۷ آیت ۶۵ میں بیان کیا گیا ہے کہ رومی گورنر پلاطس نے فوجی سپاہیوں کے دینے سے انکار کر دیا تھا اور مقتدایانِ دین یہود کو ہدایت کی تھی کہ وہ اپنی پولیس کے آدمی تعینات کریں اور انھوں نے ایسا ہی کیا تھا۔ مگر باب ۲۸ آیت ۱۴ میں وہی پولیس کے آدمی رومی سپاہی بن جاتے ہیں جو صرف گورنر کے سامنے جوابدہ ہیں۔ (حالانکہ گورنر صاف کہہ چکا تھا کہ وہ اس معاملہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا) اور پھر یہی رومی سپاہی چند روپیہ رشوت لے کر سزا کے موت قبول کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں کیونکہ رومی فوج پہرہ پر سو جانے کی سزا قتل تھی

متی کی انجیل میں یسوع کے شاگردوں سے کہا جاتا ہے کہ اگر وہ مر کر زندہ ہو جانے

والے خدا سے ملنا چاہتے ہیں تو جلیل کے پہاڑ پر کسی مقررہ اور پوشیدہ جگہ پر جا کر ملیں اور اگرچہ ان شاگردوں کو یسوع کے احیاء ثانیہ کا ذرہ برابر بھی یقین نہیں مگر وہ پھر بھی جاتے ہیں اور اپنے خداوند سے ملتے ہیں۔ یہ ہے حال انجیل متی کے خرافات کا۔

لوقا کی انجیل

اس کے بعد لوقا طبیب کی انجیل پر توجہ فرمائیے۔ یہ شخص پہلے تو یہ بیان کرتا ہے کہ ارمتیاہ کے یوسف نے یسوع کی لاش کی تکفین کر کے اسے دفن کر دیا لیکن بعد میں وہ عورتوں کو (جن کے ساتھ بعض اور آدمی بھی شامل ہو جاتے ہیں) مرہم اور خوشبودار مسالہ دے کر قبر یسوع پر بھیجتا ہے۔ ان عورتوں کو (جیسا کہ متی نے بیان کیا) قبر پر بیٹھا ہوا کوئی درخشاں صورت فرشتہ دکھائی نہیں دیتا (جو بقول متی قبر سے باہر پتھر پر بیٹھا ہوا وہی سپاہیوں کے خوف زدہ دستے پر سکرار ہا تھا) اور نہ انہیں کوئی "اجنبی نوجوان" قبر کے اندر بیٹھا ہوا نظر آیا (جیسا کہ مرقس کا بیان ہے) بلکہ دو آدمی زرق برق لباس پہنے دفعتاً نمودار ہوتے ہیں اور وہ ان عورتوں سے تمام ماجرا بیان کرتے ہیں۔ یہ عورتیں اپنے گھروں کی طرف دوڑ جاتی ہیں اور یسوع کے شاگردوں کو یاد دلاتی ہیں کہ یسوع نے واقعی پیشین گوئی کی تھی کہ وہ مر کر پھر زندہ ہو جائے گا لیکن یسوع کے شاگرد یہ ماجرا سن کر بھی اسے بچوں کی کہانی سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ یسوع ہرگز ایسا نہیں تھا جو مر کر دوبارہ زندہ ہو جاتا)۔

اس کے بعد ایک نیا بیان مرتب کیا جاتا ہے کہ ایک نئی جماعت جو پولوس کے مخالف پطرس کی پیرو ہے۔ پطرس کو قبر یسوع کی طرف لے جاتی ہے حالانکہ یہی پطرس ہے جس نے عورتوں کے بیان کو بچوں کی کہانی سمجھ کر ٹال دیا تھا۔ الغرض پطرس قبر یسوع پر

پہونچتا ہے اور وہاں اُسے یسوع کا کفن ملتا ہے۔ اس وقت پطرس تنہا تھا۔

لیکن کلیسائے مسیحی میں جو جماعت یوحنا کی پیرو ہے وہ یہ بات نہیں مانتی انجیل یوحنا میں (باب ۲۰ آیۃ ۴) پطرس اور یوحنا کی بھاگ دوڑ ہوتی ہے جس میں پطرس ہار جاتا ہے۔ علاوہ ازیں انجیل یوحنا میں کفن سے متعلق تفصیلات بھی زیادہ نظر آتی ہیں۔ اناجیل کے بیانات میں یہ عجیب خصوصیت ہے کہ وفات یسوع سے جس قدر بُعد کسی مصنف کو ہوتا جاتا ہے اسی قدر اس کا علم واقعات کے متعلق دیگر مصنفین سے زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ پولوس کو بہت کم حالات معلوم ہیں۔ مرقس بمقابلہ پولوس کے زیادہ حالات جانتا ہے۔ متی اور لوقا (جو صدی کے آخر میں ہوئے ہیں) وہ اور بھی زیادہ حالات سے واقف ہیں لیکن یوحنا جو سب سے بعد (یعنی دوسری صدی عیسوی میں آتا ہے) وہ ہر بات سے واقف ہے۔

بہرحال لوقا کے نزدیک یسوع (جس میں اب کوئی عنصر خاکی نہیں رہا) اپنے دو شاگردوں کے ساتھ چند میل تک چلا جاتا ہے اور وہ بھی اس قدر طبعی طور پر کہ ان شاگردوں کو لمحہ بھر کے لئے بھی اس کے وجود میں کوئی شک وشبہ نہیں ہوتا۔ حالانکہ یسوع طویل گفتگو کے بعد ان پر ثابت کرتا ہے کہ اس کا مرنا اور جی اٹھنا لازمی تھا (گویا یسوع نے ان کے ساتھ کئی گھنٹے تک خاک چھانی) بہرحال دو شاگرد بڑے جوش میں گھر پہونچتے ہیں اور جان لیتے ہیں کہ جس شخص سے اثنائے راہ میں ملاقات ہوئی تھی وہ خدا تھا پھر وہ یہ حال دوسرے لوگوں سے بیان کرتے ہیں

واضح ہو کہ پہلی دو انجیلوں میں یسوع اپنے شاگردوں سے یروشلم میں ملاقات

کرنے سے انکار کر دیتا ہے اور گلیل کی پہاڑی پر کوئی خفیہ جگہ ملاقات کے لئے مقرر کرتا ہے لیکن اب ان کے سامنے شہر یروشلم میں نمودار ہو جاتا ہے۔ اور باوجودیکہ اس کے شاگرد اس کے ہاتھوں اور پاؤں پر صلیب کی میخوں کے نشانات دیکھتے ہیں مگر وہ پھر بھی اس کی ہستی پر شبہ کرتے ہیں اور صرف اس بات سے اپنا اطمینان کرتے ہیں کہ وہ شہد اور مچھلی کھاتا ہے یا نہیں۔ اس انجیل میں ایک اور بات پہلی انجیلوں کے خلاف یہ ہے کہ یسوع اپنے شاگردوں کو یروشلم چھوڑنے سے منع کرتا ہے لیکن وہ دلیری کے ساتھ ہیکل کی طرف دوڑ جاتے ہیں اور گلا پھاڑ پھاڑ کر تمام ماجرا لوگوں سے بیان کرتے ہیں۔

انجیل یوحنا

اب اس کے بعد ہمارے خیال میں انجیل یوحنا پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کیونکہ دس بیس برس انھیں قصوں میں اور چار چاند لگ جاتے ہیں۔ انجیل یوحنا میں ہم پڑھتے ہیں کہ نیکو دیمس اور یوسف نے واقعی یسوع کی لاش پر بمقدار کثیر مسالے ملے تھے کیونکہ انجیل یوحنا باب ۱۹ آیۃ ۳۹ و ۴۰ میں لکھا ہے کہ وہ لاش پر ملنے کے لئے سو من کے قریب مُر اور عود لائے تھے اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مریم میگدلینی کوئی مسالہ نہیں لے گئی تھی وہ تنہا اور خالی ہاتھ گئی تھی علاوہ ازیں نہ اسے کوئی فرشتہ نظر آیا اور نہ کوئی پوس والا دکھائی دیا۔ وہ گھر کی طرف دوڑ جاتی ہے اور پطرس (غالباً یوحنا) سے بھی بیان کرتی ہے جو قبر کی طرف دوڑ جاتے ہیں لیکن وہاں ان کو بھی کوئی فرشتہ نظر نہیں آتا۔ بہرحال مریم میگدلینی تنہا جاتی ہے اور دو فرشتے دیکھتی ہے۔ وہ روتی اور فریاد کرتی ہے کہ یسوع کی لاش کو کوئی شخص چرا لے گیا۔

اس کے آگے جو آیت آتی ہے اس میں یسوع مریم میگدلینی کو بھی دکھائی دیتا ہے وہ یہ سمجھتی ہے کہ شاید یہ کوئی باغبان ہے اور اسی نے یسوع کی لاش چرائی ہے۔ پھر یسوع مریم میگدلینی سے باتیں کرتا ہے لیکن اپنے جسم کو ہاتھ لگانے نہیں دیتا۔ بعد ازاں وہ عورت یہ تمام حال یسوع کے شاگردوں سے بیان کرتی ہے۔ یوحنا اور مرقس برخلاف لوقا اور متی کے اس بات پر ہم خیال ہو جاتے ہیں کہ یسوع یروشلم میں اپنے شاگردوں کو ضرور نظر پڑا۔ گویا جلیل کے پہاڑ والا واقعہ بالکل غلط ہے۔

بقول یوحنا یسوع اپنے شاگردوں کو دو بار نظر آیا۔ اگرچہ وہ ایک مقفل دروازہ سے گزر جاتا ہے لیکن طامس یقین نہیں کرتا کہ وہ خداوند ہے جب تک وہ اس کے پہلو میں زخم نہیں دیکھ لیتا۔ اس کے بعد یوحنا ان کو جلیل میں بھیج دیتا ہے مگر باوجود اس امر کے یسوع ان پر روح القدس دم کر چکا تھا (باب ۲۲) ان لوگوں کو گنہگاروں کو پاک کرنے کی قوتیں عطا کر چکا تھا وہ لوگ خلاف توقع اپنا وہی ذلیل پیشہ یعنی ماہی گیری اختیار کر لیتے ہیں۔

ناظرین کرام نے مندرجہ بالا بیانات سے معلوم کر لیا ہوگا کہ اناجیل اربعہ تضاد کا کس قدر خوفناک طومار ہے اور بنظر غائر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ داستان ہو نہ ہو پہلی صدی مسیحی کی گڑھنت ہے۔ خرافیات قدیمہ میں جیسی لغو باتیں ہوتی ہیں ویسی ہی داستانیں اناجیل میں درج ہیں۔ اصل واقعہ کے متعلق جو مختلف بیانات ہیں اور ان میں اور بعد میں جو تحریفات اور وضعیات کئے گئے ان میں کوئی بھی مطابقت یا ربط نہیں ہے

پولوس کا بیان عہد نامہ جدید میں اناجیل اربعہ کے بعد حالات مسیح کے سلسلہ میں تصانیف پولوس کا نمبر آتا ہے اور خصوصاً اس کی کتاب اعمال۔

اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چلتے چلتے ایک تنقیدی نظر پولوس پر بھی ڈال لی جائے۔ کتاب اعمال کے مصنف نے بھوتوں، موہوم خیالی یا اشکال ہیولائی کے متعلق انھیں باتوں کا ذکر کیا ہے جو وہ انجیل لوقا میں لکھ چکا ہے۔ ہاں مسئلہ رفع الی السماء پر وہ ضرور کسی قدر اضافہ کرتا ہے اور اس باب میں جو کچھ اس نے لکھا ہے وہ کسی دوسرے مصنف انجیل کو معلوم نہیں ہے۔

مصنف کتاب اعمال بیان کرتا ہے کہ یسوع اپنے شاگردوں کو لے کر ایک پہاڑ پر گیا اور وہاں سے وہ ہوا میں بلند ہوا حتیٰ کہ وہ ایک بادل میں غائب ہو گیا۔

پولوس کے خطوط سب سے پرانی تحریریں ہیں جن میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ پیروان یسوع اس واقعہ پر ایمان رکھتے تھے کہ یسوع مر کر پھر جی اٹھا۔ اور چند سال بعد تک اپنے مختلف دوستوں کے سامنے ظاہر ہوتا رہا اور پطرس اور دیگر گیارہ (بعض جگہ بارہ لکھا ہے) حواریین نے اسے دیکھا۔ کتاب اعمال میں ایک تقریر پولوس کی زبان سے ادا کی گئی ہے جو مقام انطاکیہ معبد الیہود میں کی گئی تھی۔ اس تقریر میں پولوس نے صاف طور سے بیان کیا ہے کہ جن لوگوں نے یسوع کی تجہیز و تکفین کی وہ یہودی ارباب حکومت تھے اور واقعی طبعی حالات میں یہی توقع بھی کی جا سکتی تھی۔ اگر یہی واقعہ ہے تو یسوع کو بھی اسی گڑھے میں جو مصلوب شدہ مجرموں کے لئے تیار کیا گیا تھا دفن کیا گیا ہوگا (ملاحظہ ہو کتاب اعمال باب ۱۳ آیۃ ۲۷ لغایۃ ۲۹)

"کیونکہ انھوں نے جو یروشلم میں رہتے ہیں اور ان کے حاکموں نے اسے نہ پہچانا اور نہ انبیاء کی وہ باتیں سمجھیں جو ہر یوم السبت کو پڑھی جایا کرتی تھیں اسے قتل

انھوں نے اس کے خلاف فتویٰ دے کر ان باتوں کو پورا کر دیا اور جب وہ ان تمام باتوں کو جو اس کی نسبت تحریر تھیں پورا کر چکے تو انھوں نے اس کو دار پر سے اتار لیا اور اسے ایک قبر میں دفن کر دیا۔"

مندرجۂ بالا بیان سے ان تمام دلچسپ تفصیلات کی تردید ہو جاتی ہے جو اناجیل میں نظر آتی ہیں۔ اگر یہ حال (جیسا کہ عام خیال ہے) پولوس کے کسی ساتھی نے لکھا ہے تو یسوع کے مر کر جی اُٹھنے کا اولین تعصہ ان قصوں سے قطعی مختلف ہوگا جو اناجیل میں درج ہیں۔ پولوس مذہباً یہودی تھا اور وہ شریعت موسوی سے بمقابلہ مصنفین اناجیل کے زیادہ واقف تھا۔ یہودیوں کا یوم السبت شنبہ ہے اور سبت کے روز کام نہ کرنے کا حکم از روئے شریعت موسوی بعد غروب آفتاب ختم ہو جاتا ہے پھر اتوار کی صبح تک انتظار نہ کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی (جیسا کہ انجیل مرقس میں بیان کیا گیا ہے۔)

علاوہ ازیں پولوس ہی ایک ایسا شخص ہے جو اس امر کا مدعی ہے کہ پانچ سو آدمیوں نے بیک وقت یسوع کو دیکھا، حالانکہ فی الحقیقت مسیح کے احیار ثانیہ کا دیکھنے والا ایک گواہ بھی نہیں ہے اور نہ ان عورتوں اور مردوں میں سے جو یسوع کی قبر پر گئے تھے کسی نے اس واقعہ کی نسبت اپنی کوئی تائیدی یا تصدیقی شہادت پیش کی۔

بعد کو ایک مصنف نے یوحنا کے نام سے ایک انجیل بنائی اور پھر کسی اور نے پطرس کے نام سے تیسری انجیل تصنیف کی جس میں یسوع کے احیار ثانیہ کی ایسی مضحک تفصیلات درج کیں کہ پہلے زمانہ کے عقیدتمند عیسائیوں نے بھی ان کو قبول نہ کیا اور روایت ترک کرنا پڑی جس کی رو سے پانچ سو آدمیوں نے یسوع کو دوبارہ زندہ ہوتے

دیکھا تھا۔

اناجیل کے قدیم ترین ترجموں میں لکھا ہے کہ جب یسوع گرفتار ہوئے تو ان کے حواریین منتشر ہوگئے اور اپنا پرانا مشغلہ ماہی گیری کا اختیار کرلیا۔ کچھ دنوں بعد انھوں نے دعویٰ کیا کہ انھوں نے "خداوند" کو دیکھا ہے (اس سے زیادہ کوئی تفصیل بیان نہیں کی) اور تبلیغ مذہب کرنے لگے۔ اگر ان کے اس دعویٰ کو تبلیغی مصلحت نہ سمجھا جائے تو بھی ایسے لوگوں کا جن کے دل مذہبی جوش سے معمور ہوں، مسیح کی روح کو دیکھ لینا حیرت انگیز امر نہیں کیونکہ روحانیات کا یہ معمولی مسئلہ ہے کہ جب کسی خیال کی طرف توجہ قوی ہوتی ہے تو خود انسان کا ذہن خلاق اُسے مرئی صورت میں پیش کر دیتا ہے۔ اس کا ثبوت اس واقعہ سے بھی ملتا ہے کہ سوائے رومن کیتھولک عیسائیوں کے کسی ایک پروٹسٹنٹ کو بھی مسیح گوشت و پوست کے ساتھ نظر نہیں آئے۔

مسیح اور پولوس جن حضرات نے تاریخ مسیحیت کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ابتدائی تین صدی میں مسیحیت جو کچھ پائی جاتی تھی اس کا بانی دراصل پولوس تھا، اس کے بعد جو مسیحیت پورے طور پر منظم ہوکر قائم ہوئی اس کا بانی سنٹ امبروز تھا۔ وہ زمانہ ایسا تھا کہ تمام دنیا مذہب پر گفتگو کر رہی تھی، پرانے فرقے نابود ہو ہوکر جدید مذہبی فرقے پیدا ہوتے اور مٹتے جاتے تھے، پولوس حقیقتاً نہایت پرجوش شخص تھا اس کے دل میں بھی مختلف مذہبی خیالات پیدا ہوئے اور آخرکار وہ یسوع کا معتقد ہوکر پورے جوش کے ساتھ مسیحیت کی تبلیغ کرنے لگا پھر یا تو اس کا غیرمعمولی جوش تھا یا عوام پر اثر ڈالنے کا خیال کہ اس نے آخرکار یسوع کو ابن اللہ بناکر چھوڑا

مروجہ بائبل میں اناجیل کا جس قدر حصہ پایا جاتا ہے ان کی نسبت کوئی ثبوت اس امر کا بھی نہیں بہم پہونچ سکتا کہ وہ پہلی صدی میں موجود تھیں اور اس لئے ان پر اعتبار کرکے مسیح کے صحیح حالات یا ان کی سیرت مرتب کرنا حسن عقیدت سے زیادہ نہیں ہیں۔

اناجیل میں یسوع مسیح کی کوئی تصویر دوسری سے نہیں ملتی کہیں تو وہ بچوں سے محبت کرتا ہے اور کہیں ان کی ماؤں سے نفرت، کسی جگہ اُسے بازاری عورتوں کا دوست دکھایا گیا ہے اور کہیں متنفر، الغرض جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، یسوع ناصری کی مختلف تصویریں بنتی رہیں، کبھی وہ یسوع تارسوس بنا، کبھی یسوع ایگی ہوس، کبھی یسوع کا رنتھ ہوا اور کبھی یسوع انطاکیہ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب عیسائی دنیا میں یسوع مسیح کی ہستی وہم وخیال سے زیادہ کچھ نہیں رہی اور برنارڈ شا وغیرہ تو اسے "پاگل آدمی" سمجھنے لگے۔ یورپ میں عوام کو جس قدر بیگانگی جناب مسیح سے پیدا ہو گئی ہے اس کا اندازہ ذیل کے ایک لطیف واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک بار کوئی پادری مزدوری پیشہ حلقہ میں مذہبی کتابوں کا ایک بنڈل باندھ کر گیا اور فرداً فرداً ہر شخص سے پوچھنے لگا کہ "کیا تم مسیح کو جانتے ہو"۔ اس کا جواب ہر شخص نے سرہلا کر نفی میں دیا۔ بالآخر ایک شخص نے دوسرے سے دریافت کیا کہ "یار یہ مسیح کون شخص ہے جس کی اس قدر تلاش ہو رہی ہے؟" اس نے جواب دیا کہ "کارخانہ میں کوئی کاریگر ہوگا جس کا کھانا یہ شخص بغل میں دبائے پھرتا ہے۔"

مسیح کی ہستی سے انکار پھر انجیل کی تاریخی کمزوری اور اس کے بیانات کے تضاد نے یہی نہیں کیا کہ خود عیسائیوں کو مسیح کے احیار ثانیہ اور ان کے دوسرے بہت سے معجزوں کی طرف سے منحرف کر دیا بلکہ بعض نے تو یہ بھی کہدیا کہ

لوگوں کے مذہبی مراسم اور دینی اعتقادات کی کیا کیفیت تھی۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو بآسانی اس امر کا فیصلہ ہو سکتا ہے کہ جناب مسیح کی غیر معمولی صورتِ ولادت، واقعۂ تصلیب اور دوبارہ زندہ ہو جانے کے متعلق جو کچھ مذہب عیسوی نے بتایا ہے یا انجیلوں میں (باوصف تمام تضاد و اختلاف کے) پایا جاتا ہے وہ کوئی نئی بات نہ تھی اور عہد قدیم کا کوئی ملک اور کوئی مذہب ایسا نہ تھا جس میں بالکل اسی قسم کی روایتیں مختلف دیوتاؤں کے ساتھ نہ منسوب کی جاتی ہوں اور ہر سال تہواروں میں ان روایات کی یاد کو بطور تمثیل تازہ نہ کیا جاتا ہو۔ چنانچہ ہم تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ کن کن اقوام و ممالک میں اس نوع کے اعتقادات پائے جاتے ہیں۔

فینقیہ بائبلوس فینقیوں کا سب سے پرانا شہر تھا اور یسوع سے کم از کم ایک ہزار سال قبل استارتہ دیوی کے عظیم الشان مندر کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ یہ ساحل بحر کے قریب ایک بلند جگہ پر واقع تھا جہاں استارتہ دیوی کا ہیکل قائم تھا یہ دیوی عشق و محبت کی دیوی سمجھی جاتی تھی لیکن عشق و محبت بھی وہ جو جذبات عفیفہ سے بالکل معرّا ہو۔

استارتہ کا افسانہ حسن و عشق پلوٹارک اور ریاٹرل کی زبانی یہ ہے کہ فینقیوں میں یہ قصہ مشہور تھا کہ سائرس (فرمانروائے قبرص کا لقب تھا) اپنی ایک حسین لڑکی مرہ (MYRR HA) پر عاشق ہو گیا اور اس نے سالانہ جشن مسرت کے سلسلہ میں اس سے مباشرت کی اور ایڈونی (ADO Ni) ایک بچہ پیدا ہوا۔

بعد کو سائرس اپنی اس قبیح حرکت پر سخت نادم ہوا اور اس نے ایک بچہ کو

کہ مسیح کی کوئی ہستی کبھی تھی ہی نہیں۔ چنانچہ ایک فرانسیسی محقق ڈوپوائے (DUPUIS) اپنی مشہور کتاب "ابتدائے مذاہب" (ORIGIN OF CULTS) میں لکھتا ہے کہ "دُنیا میں جتنے مذاہب پیدا ہوئے ان کی بنیاد علم ہیئت کے قصوں پر ہے جن میں سورج اور آسمانی خدا کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ اور اسی کے ساتھ کسی نہ کسی دیوتا کا مر کر زندہ ہونا بھی دکھایا جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب فصل خزاں آتی ہے تو آفتاب کو زوال ہوتا ہے اور اس کی حرارت بھی کم ہو جاتی ہے اسی حالت کو قدیم لوگوں نے سورج دیوتا کے مرنے سے تعبیر کیا، پھر جب فصل بہار آتی ہے تو آفتاب مائل بہ عروج ہوتا ہے تو اس کو سورج دیوتا کا احیائے ثانیہ سمجھا گیا۔ گویا یہ مرنا اور مر کر دوبارہ زندہ ہونا تداخل فصلین سے عبارت ہے۔ پروفیسر مذکور نے بحث کرتے ہوئے اخیر میں لکھا ہے کہ یسوع ناصری وجودی لحاظ سے تھا ہی نہیں بلکہ اس سے مراد صرف "آفتاب" ہے جو دوشیزۂ بہار (کنواری مریم) کے بطن سے پیدا ہوتا ہے۔ فصل خزاں کا پلاطس (رومی گورنر) اسے گرفتار کر کے مصلوب کر دیتا ہے (یعنی سردیوں کا موسم آجاتا ہے اور تمام عالم ٹھٹھر کر بے جان سا ہو جاتا ہے) اور وہ پھر کچھ دنوں کے بعد مائل بہ عروج ہوتا ہے جسے احیائے ثانیہ سمجھنا چاہیئے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ مسیح چرخ چہارم پر زندہ ہیں لیکن اسی کے ساتھ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ فیثا غورث کے نظام ہیئت کے مطابق آفتاب کی جگہ چرخ چہارم ہے تو اس خیال کو اور تقویت ہوتی ہے کہ مسیح سے مراد آفتاب یا سورج دیوتا ہے۔

۱۹۳۵ء میں جرمنی کے ایک مشہور مذہبی عالم ڈاکٹر اسٹراس (STRASS) نے بھی اپنی کتاب سیرۃ المسیح (LIFE OF JESUS) میں ثابت کیا ہے کہ اناجیل میں جو

سوانح، یسوع کے درج ہیں وہ تمام تر اصنام پرستوں کے مذہبی خرافات سے ماخوذ ہیں۔

نصف صدی کا زمانہ گزرا کہ رابرٹسن، ممبر پریوی کونسل نے ثابت کیا کہ تاریخ میں یسوع ناصری کے نام کا کوئی شخص موجود ہی نہیں، ان کا نظریہ یہ ہے کہ اسلاف یہود میں یسوع نامی ایک غیر معروف دیوتا مانا جاتا تھا جس سے بعد کو پُراسرار ولادت، احیاءِ ثانیہ وغیرہ کے بہت سے الہٰی قصّے منسوب کر دیئے گئے۔

تولین (TULANE) یونیورسٹی کے پروفیسر ڈبلو۔ بی۔ اسمتھ نے بھی اپنی کتاب (ECCEDE US) میں مسیح کی تاریخی حیثیت سے انکار کیا ہے۔ تقریباً یہی خیال ایک جرمن پروفیسر ڈریوز (DREWS) کا ہے اور فرانسیسی ڈاکٹر کوچو (COUCHOW) نے بھی اپنی کتاب "معمائے مسیح" (ENIGMA OF JESUS) میں یہی ظاہر کیا ہے انھیں کے ہم خیال پروسپر الفارِک (PROSPERALFARIC) وِکٹورِیس ماشیرو (VITTORIS MACCHIORO) وغیرہ دیگر علمائے مغرب بھی ہیں جو یسوع مسیح کی ہستی کو صرف ایک فرضی اور اصنامی ہستی سمجھتے ہیں۔

بر سرِ مطلب

یہاں تک جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے وہ صرف اناجیل سے متعلق تھا کہ ان کی تاریخی و مذہبی اہمیت اس قدر ہے اور خود معتقدینِ مسیح کس حد تک مجموعہ اناجیل پر اعتماد رکھتے ہیں۔ اب ہم اصل مدعا کی طرف آتے ہیں کہ جناب مسیح کے متعلق جو یہ تمام محیر العقول روایتیں پائی جاتی ہیں ان کی حقیقت کیا ہے اور ان کا ماخذ کیا ہو سکتا ہے۔

اس کے لئے ہم کو تھوڑی دیر کے لئے اس زمانہ میں چلا جانا چاہیئے کہ اس وقت

ایک پہاڑ پر پھنکوا دیا۔ لیکن یہاں اس خوبصورت بچہ کو جنگل کی دیویوں نے لے لیا وہ پرورش پاکر نہایت ہی خوبصورت جوان نکلا۔ ایک روز وہ جنگل میں شکار کھیل رہا تھا تو استارتہ (ASTRATA) دیوی کی اس پر نظر پڑ گئی اور عاشق ہو گئی۔ یہ بات دیکھ کر مریخ دیوتا جو استارتہ یا دمیس کا عاشق تھا بہت برہم ہوا اور اس نے ایک جنگلی سور کی صورت اختیار کر کے شکار کھیلتے وقت ایڈونی کو مار ڈالا۔ اس واقعہ پر استارتہ بیحد روئی پیٹی اور اس کے دل پر اس قدر استیلائے غم والم ہوا کہ وہ پاتال کو چلی گئی۔ جو مُردوں کی دنیا کہلاتی ہے لیکن یہاں پاتال کے راجہ پلوٹو (PLOTO) (جو ہندی علم الاصنام میں جمراج کہلاتا ہے) کی بیوی بھی ایڈونی پر عاشق ہو گئی تھی اس لئے اس نے ایڈونی کو پاتال سے جانے نہ دیا بالآخر دونوں دیویوں میں یہ مفاہمت ہو گئی کہ سال کو دو فصلوں میں تقسیم کر لیا جائے اور ہر دیوی اس نوجوان کو ایک فصل یعنی چھ ماہ تک اپنے پاس رکھے جب استارتہ دیوی نے واپس آ کر یہ واقعات احباب سے بیان کیا تو انھوں نے خوب جشن مسرت منایا اور جس دن ایڈونی زندہ ہوا تھا اس روز ایک تہوار قرار پایا۔

سرجے۔ جی۔ فریزر ملک شام کی ایک خوبصورت وادی کا حال بیان کرتے ہیں جو مقام بائبلوس سے جانب مشرق کچھ فاصلہ پر واقع ہے۔ اس مقام کو قدیم زمانہ میں وادی ایڈونیس کہا کرتے تھے۔ یہی وہ وادی ہے جہاں استارتہ کی ایڈونیس سے ملاقات ہوئی تھی یا جہاں اس نے اس کی پارہ پارہ لاش پر ماتم کیا تھا (روایات مختلف ہیں)۔ اسی وادی میں ایڈونیس نامی ایک دریا بہتا ہے جو سیلاب کے وقت سال بھر۔۔ ایک

مرتبہ خونیں ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں یہ اِیڈونیس کا خون ہے (حالانکہ اس کے اسباب کیمیادی ہیں) اسی موسم میں سرخ پھولوں کی کثرت سے تمام وادی لالہ زار بن جاتی ہے دوشیزگانِ شام یہاں آکر گریہ و بکا اور ماتم و زاری کیا کرتی تھیں (جیسے کہ مریم نے یسوع کی قبر پہ ماتم کیا تھا) لیکن یہ کیفیت ایک خاص وقت تک طاری رہتی تھی، کیونکہ پھر اِیڈونیس پاتال سے زندہ ہو کر واپس آجاتا تھا۔ فنیقیوں نے جزیرۂ قبرص میں بھی اپنا تمدن قائم کر دیا تھا جو بائبلوس کے بعد مذہب عشق و محبت کا دوسرا مرکز تھا۔ اسی جگہ سنائرس اور پگمالیون کے کارنامہ ہائے عشق و محبت کی روایات قائم کی گئیں۔ جزیرۂ قبرص میں جنوب مغربی سمت ساحل بحر سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر کوکلیا (KOKALIA) نامی ایک حقیر سا موضع اب بھی ہے جہاں اِیڈونیس کے بہت سے بت اب بھی پڑے ہوئے ملتے ہیں۔ یہی موضع پہلے زمانہ میں شہر پافوس (PAPHROS) تھا۔ اسی پہاڑی پر یسوع سے ایک ہزار سال بلکہ غالباً دو ہزار سال پیشتر یونانیوں کی آفرودتیہ یعنی استارتا دیوی کا خوبصورت مندر تھا جہاں دیوی کی قمریاں اور فاختہ (جو آج کل معصومیت کی علامت ہیں) مندر کے ستونوں پر گوگو کیا کرتی تھیں جن میں مخروطی شکل کا ایک میل سنگی یعنی "لنگ" نصب تھا جو عورتوں کو بتاتا تھا کہ دیوی کس چیز کی بھینٹ پسند کرتی ہے۔ یہ مقام بائبلوس کی ہو بہو نقل تھا اور ہر سال اِیڈونیس کی موت، پاتال کو جانے اور پھر زندہ ہو کر دنیا میں واپس آنے کا تہوار منایا جاتا تھا۔ یونانیوں کا اثر پڑنے سے یہی استارتا دیوی کہیں آفرودتیہ اور کہیں وینس بن گئی لیکن دنیا میں اس سے بھی پیشتر ایک اور مذہب "دیوی ماتا" یا "دھرتی ماتا" کا پایا جاتا تھا جو دنیا کو پالنے والی ماتا تھی۔ اگرچہ کریٹ میں پہلے صرف یہی ایک دیوی

تھی لیکن آخری زمانہ میں اس جزیرہ کے اندر بھی ایک نوجوان دیوتا داخل ہوگیا یہی دیوی قدیم ٹیوٹانی اقوام میں فریگا (FRIGGA) کہلاتی تھی جس سے ہفتہ کا دن "فریگا ڈے" یا "فرائی ڈے" یعنی یوم جمعہ نکلا ہے۔ یہی دیوی روم میں جاکر وینس بن گئی۔ اسی کو یونان میں آفرودتیہ اور مصر میں آئسیس کہتے تھے۔ یہی فنیقیوں اور عبرانیوں کی استارتہ تھی اور اسی دیوی کو اہل بابل اشتار کہا کرتے تھے (یعنی زہرہ سیارہ) غالباً اسی سے انگریزی لفظ (STAR) اور فارسی لفظ ستارہ نکلا ہے۔

بابل

فنیقیوں اور عبرانیوں میں جو استارتہ دیوی کہلاتی تھی وہی ہزاروں برس پہلے بابل کی اشتار دیوی تھی اور ایڈونی کے بجائے وہاں تموز دیوتا پایا جاتا تھا جس زمانہ میں اشتار و تموز کا مذہب رائج تھا یا عراق کی سمیری قوم کا نیر اقبال نصف النہار پر تھا اور چونکہ یہ قوم نیم مغل تھی اس لئے تعجب نہیں کہ اشتار دیوی بھی وہی ہو جسے ملک چین میں شین شین مو (مقدس ماتا) کہتے تھے۔

بہرحال اشتار و تموز کے درمیان بھی محبت پائی جاتی ہے اور جب تموز مرجاتا ہے اور پاتال کو چلا جاتا ہے تو اشتار دیوی تلاش یار میں سرگرداں خطرات کا مقابلہ کرتی ہوتی پاتال تک پہونچتی ہے جس وقت اشتار دیوی پاتال میں ہوتی ہے تو زرخیزی زمین اور تولید و تناسل کے تمام سرچشمے روئے زمین پر خشک ہو جاتے ہیں۔ (ہندوستان میں بھی جب تو کہ ڈوب جاتا ہے یعنی زہرہ کا شرف نہیں ہوتا تو ہندوؤں میں شادی بیاہ نہیں کرتے۔ یعنی تولید و تناسل کے سرچشمے بند ہو جاتے ہیں) قدرت کی تمام طاقتیں کمزور اور عشق و محبت کے تمام سلسلے معطل ہو جاتے ہیں۔ بالآخر دیوتا لوگ فانی انسانوں کی فریاد سنتے ہیں

پاتال کی رانی جو خود بھی تموز پر عاشق ہو گئی تھی۔ دیوتاؤں کے کہنے سننے سے مفاہمت کر لیتی ہے۔ اشتار پر امرت (آب حیات) چھڑکا جاتا ہے اور تموز کو اپنے ساتھ لیجانے کی اس کو اجازت دیدی جاتی ہے۔

یہی باعث تھا کہ خلیج فارس سے لے کر سواحل بحیرۂ روم تک جن علاقوں میں سمیری تمدن رائج تھا وہاں تمام عورتیں تموز کی ایک ارتھی (تابوت) بنا کر ماتم کیا کرتی تھیں۔ اس کے بعد جب تموز کے دوبارہ زندہ ہونے کی مسرت انگیز خبر پھیلتی تھی تو صف ماتم کے بجائے بزم عیش و طرب قائم ہو جاتی تھی (ہندوستان میں یہ بسنت رت کا وقت ہوتا ہے) ارتھی پر جو بت رکھا جاتا تھا وہ ایک نوجوان حسین دیوتا کا ہوتا تھا جسے سرخ لباس پہنایا جاتا تھا۔ عورتیں اس لاش کو دریا پر لے جاتیں، اس کے جسم پر تیل ملتیں اور غسل کراتیں اور رونے کے ساتھ نوحہ خوانی کرتی تھیں لمبے لمبے مشکیں بال شانوں پر بکھیر لئے جاتے تھے جو ہوا میں پریشان ہو کر اڑتے تھے۔ گریہ و زاری کے ساتھ سینہ کوبی بھی ہوتی تھی اور بخور جلا کر دیوتا کی لاش کو دھوپ دی جاتی تھی۔ الغرض یہ تہوار اس قدر عام تھا کہ بقول حزقیئل نبی شہر یروشلم کی عورتیں ہیکل سلیمانی کے شمالی پھاٹک پر بال کھولے ہوئے تموز کے بت پر نوحہ زاری اور سینہ کوبی کیا کرتی تھی۔

بابل میں تموز دیوتا کے مرنے اور جی اٹھنے کا تہوار ماہ تموز یعنی جون جولائی میں منایا جاتا تھا۔ تہوار کا مقررہ دن ماہ تموز کا ساتواں روز ہوتا تھا۔ یہ دن بھی ایسا ہی تھا جیسا عیسائی دنیا میں "یوم الارواح" یعنی (ALL SOUL'S DAY) ہوتا ہے۔ (ہندوؤں میں ایک ایسا ہی تہوار ہے جس میں ہر سال "پرکھوں" کو پانی اور کوؤں اور

دیگر جانوروں کو کھانا جاتا ہے) تقویم یہود میں اس روز اب بھی فاقہ کیا جاتا ہے۔ گویا اُس روز عام طور پر روحوں اور اپنے مردہ رشتہ داروں کی یاد تازہ کیجاتی ہے

عیسائیوں کا گڈ فرائڈے (GOOD FRIDAY) اور یوم احیاء ثانیہ یسوع کی مسیح اور عید فصح یعنی ایسٹر (EASTER) جس کا مادہ غالباً (ASTAR) ہے انھیں قدیم روایات کی یادگار ہیں اس سلسلہ میں سینٹ جیروم کا وہ خط جو اس نے فلسطین سے پالینوس کے نام لکھا تھا غالباً بہت دلچسپ ثابت ہوگا۔ وہ لکھتا ہے:۔

"یہ ہمارا بیت الحم جو اب دنیا بھر کا متبرک ترین مقام ہے کسی وقت تموز یعنی ایڈونیس کا باغیچہ تھا اور جس غار میں شیرخوار یسوع مسیح پیدا ہو کر رویا تھا اسی غار میں کسی وقت وینس دیوی کے معشوق کا ماتم ہوا کرتا تھا"

جو شخص اس واقعہ کو اتفاق سمجھے کہ مسیح اسی غار میں پیدا ہوئے۔ جہاں صدیوں پیشتر تموز کے مرنے اور جی اٹھنے کا تہوار منایا جاتا ہے۔ اس کی خوش عقیدگی پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

قوم حطی (HITTITES) قدیم فلسطین یا فنیقیہ کے شمال میں حطیوں کی بھی ایک زبردست سلطنت تھی جس کا حال لوگوں کو بہت کم معلوم ہے یہ قوم کسی زمانہ میں اس قدر طاقتور ہوگئی تھی کہ اس نے بابل فتح کر لیا تھا۔ ہم کو حطی قوم کی ایک یادگار دستیاب ہوئی ہے جس پر تین شکلیں ہیں۔ ان سے آسمانی خدا۔ دھرتی ماتا اور ان کے بیٹے (دیوتا) مراد ہیں۔ اس سے یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ عیسائیوں کی تثلیث اسی حطی تثلیث سے پیدا ہوئی۔ علاوہ اس کے

حطیوں میں دیوتا کے مرکوزی اٹھنے کا تہوار بھی موجود تھا۔

فریجیہ سلطنت حطیہ کی جانب مغرب دردہ دانیال تک فریجیہ کی سلطنت پھیلی ہوئی تھی۔ جہاں دیوی کا نام قابیلہ (CYBELA) اور اس کے معشوق دیوتا کا نام آتیس (ATTiS) تھا۔ روایت ہے کہ پہلے یہ دیوتا ایک قبول صورت چرواہا تھا۔ جس پر قابیلہ دیوی عاشق ہو گئی تھی، یہ بھی روایت ہے کہ وہ چرواہا بغیر باپ کے کسی کنواری کے بطن سے پیدا ہوا تھا (یسوع بھی بغیر باپ کے کنواری کے بطن سے پیدا ہوئے اور وہ بھی بھیڑوں کا چرواہا کہلاتے ہیں)

اس دیوتا کی موت کے متعلق دو روایتیں تھیں ایک یہ کہ اسے ایک جنگلی سور نے مار ڈالا تھا (اڈونیس کی نسبت بھی یہی روایت تھی) دوسری روایت یہ تھی کہ اس نے ایک صنوبر کے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے اپنا عضو مخصوص کاٹ پھینکا جس سے اس قدر خون بہا کہ وہ ہلاک ہو گیا۔ یہی باعث تھا کہ قابیلہ دیوی کے بھگت اس کے تہوار کے دن اپنا آلہ تناسل ذبح کرتے تھے اور خون چکاں حالت میں اس کو سوئے آسمان اٹھایا کرتے تھے۔

تہوار کی صورت یہ تھی کہ ۲۰ مارچ کو دیوی کے پجاری ہاتھوں میں نرکل پانے لے کر بصورت جلوس نکلتے تھے (جس طرح عیسائیوں میں "کھجور والا اتوار" یعنی (PALM SUNDAY) اور ۲۴ مارچ کو خونفشانی کا خوفناک دن ہوتا تھا جبکہ بانسریوں، نرسنگھوں جھانجھ نجیہ ں اور دف و طنبورہ کے ساتھ نوحہ خوانی کا شور بلند ہوتا تھا۔ آتیس دیوتا کا جلوس نکالا جاتا تھا اور پھر اسے اس مندر میں سے جا کر عارضی طور پر ایک قبر میں رکھ دیتے

تھے۔ (یہ کارروائی بالکل اسی طرح اور اتنے ہی عرصہ کے لئے ہوتی تھی جیسے آجکل رومن کیتھولک گرجاؤں میں یسوع کی وفات پر یادگاری توشہ (SACRAMENT) عارضی طور پر کسی قبر کے اندر یا کسی علیحدہ مقام پر رکھ دیتے ہیں اور یہ تمام کارروائی ہفتۂ مقدس یعنی (HOLY WEEK) کے اندر ہوتی تھی۔ دوسرے روز یا دو دن بعد قبر کھولی جاتی تھی اور اتیس کا بت نکال کر نہایت مسرت و شادمانی کے ساتھ لوگوں کو دکھایا جاتا تھا گویا دیوتا مر کر زندہ ہو گیا (یسوع کے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے کہ مصلوب ہونے کے دو دن بعد قبر سے زندہ ہو کر اُٹھے)

الغرض یہ ایک سالانہ تہوار تھا جس میں ناٹک کی طرح ایک خوبصورت اور نوجوان دیوتا کا مر کر جی اُٹھنا دکھایا جاتا تھا اور یہ رسم ایک مرکز سے چل کر اس وقت تمام دنیا میں پھیل گئی تھی اس لئے ناممکن تھا کہ یسوع کے زمانہ میں شہر طارسوس (TARSUS) کا رہنے والا پولوس اتیس دیوتا کے مر کر جی اُٹھنے کے سالانہ تہوار کو نہ جانتا ہو جو اس وقت تمام رومی اور یونانی دنیا میں مشہور تھا اور یہ بھی ممکن نہ تھا کہ وہ ایڈونیس کے مر کر جی اُٹھنے کے سالانہ تہوار کو نہ جانتا ہو جو اُس کے شہر سے تھوڑی دور کے فاصلہ پر مقام بائبلوس اور پافوس میں منایا جاتا تھا۔ اگر یہ شخص محققانہ طبیعت بھی رکھتا تھا تو وہ یہ بھی جانتا ہوگا کہ جس دیوتا کو ایڈونیس کہتے تھے وہ بابل کی عظیم الشان سلطنت کا "خداوند تموز" ہی تھا اور اگر یہ شخص یہودی تھا تو وہ یہ بھی جانتا ہوگا کہ خود یہودی قوم عرصہ دراز تک تموز کی موت پر ماتم اور اس کے جی اُٹھنے پر اظہار مسرت و شادمانی کرتی رہی ہے۔

جو رسمیں ایشیائے کوچک میں مرگ ایڈونیس پر ادا ہوتی تھیں وہی مصر قدیم
مصر قدیم میں اوسیریز (OSIRIS) کی موت پر ادا کی جاتی تھیں۔ قدیم مصر میں اس دیوتا کا وہی مرتبہ تھا جو مسیحی دنیا میں یسوع کا ہے پہلی صدی عیسوی میں حکیم پلوٹارک نے مصری دیوتا اوسیریز و آئسیس پر ایک کتاب لکھی تھی جس میں اس نے اس روایت کا، جو مصر میں رائج تھی مفصل ذکر کیا ہے بلکہ اسی سلسلہ میں مذہب آئسیس (ISIS) کے متعلق بھی بہت کافی معلومات بہم پہونچائی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ آئسیس کے پجاری سر منڈاتے بلکہ بجا را بدن کا صفایا کرا دیتے تھے اور ہمیشہ سفید لباس پہنتے تھے، وہ نہ کبھی گوشت کھاتے تھے اور نہ ترکاریاں استعمال کرتے تھے جو زمین کے اندر ہوتی ہیں جیسے آلو، شلغم، مولی شکر قند وغیرہ، شراب ان کے گھروں میں کبھی نہ جاتی تھی بلکہ وہ نمک بھی نہ کھاتے تھے کیونکہ اس سے بھوک پیاس بڑھتی ہے۔ الغرض اس مذہب میں زہد و تقویٰ اس حد تک پہونچ گیا تھا کہ بقول حکیم پلوٹارک بادشاہوں کا مادۂ منویہ شیشہ کی نلکیوں میں لے کر عورت کے رحم تک پہونچایا جاتا تھا تاکہ عورت و مرد کا جسم ایک دوسرے سے مس نہ ہو۔

اوسیریز اور آئسیس کے متعلق روایت یہ ہے کہ سورج دیوتا رَع کے نطفہ اور آسمان کی دیوی نوط کے بطن سے ایک دیوتا پیدا ہوا جس کا نام اوسیریز خداوند نور تھا ایک دن نوط دیوی دیوتاؤں کے ایلچی توث (THOTH) سے اختلاط کر بیٹھی جس سے ایک حسین و جمیل دختر آئسیس (ISIS) پیدا ہوئی۔ کچھ دنوں بعد آسمان کی یہ شوقین دیوی سیب (SEB) دیوتا یعنی زحل سے وابستہ ہو گئی جس کے نطفہ سے سیت (SET) یعنی خداوند ظلمت پیدا ہوا۔ اوسیریز اور آئسیس دونوں ایک دوسرے

کے دلدادہ تھے جس سے سیت سخت برا فروختہ ہوا اور اس نے اوسیریز کو دغا سے قید کر لیا اور ایک سربمہر صندوق میں رکھ کر دریا میں پھنکوا دیا۔[1] فرقت کی ماری حرماں نصیب آئسیس اپنے معشوق اوسیریز کو ہر طرف ڈھونڈھتی پھرتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد اسے معلوم ہوا کہ لاش کا صندوق دریائے نیل میں بہتا ہوا سمندر میں چلا گیا اور وہاں موجوں نے تھپیڑے دے کر ساحل شام پر بمقام بائبلوس پہونچا دیا ہے۔ صندوق جا کر ایک درخت میں لگا جو اس کی برکت سے اس قدر پھلا پھولا اور پھیلا کہ وہاں کے بادشاہ نے اسے پسند کر کے کٹوا دیا اور اپنے محل میں ستون بنوا کر نصب کرا لیا۔ آئسیس دیوی لاش کی تلاش میں بائبلوس پہونچی اور وہاں سے بدقت تمام لاش کا صندوق اور ستون لے کر مصر واپس آئی۔ اس طرح مصر اور بائبلوس کا تعلق پیدا ہوا۔

ایک روایت پلوٹارک نے یہ بھی بیان کی ہے کہ ایک روز آئسیس دیوی اوسیریز کی لاش سے لپٹ گئی جس سے ہورس Horace پیدا ہوا ایک دن آئسیس اپنے لڑکے ہورس کو تلاش کرنے گئی تو سیت نے جسے لاش کا پتہ چل گیا تھا اور جس نے لاش چرائی تھی اس کے چودہ ٹکڑے کر کے سب کو ادھر ادھر پھکوا دیا۔ آئسیس نے لاش کے ٹکڑے بڑی محنت سے تلاش کئے اور سب سے بڑے دیوتا آرع نے رحم کھا کر اوسیریز کو زندہ کر دیا اور اسے پاتال کا بادشاہ بنا دیا۔ اس طرح مصری دیوتا اوسیریز مر کر زندہ ہوا۔

یہ روایت نہ صرف ہر مصری بچہ کی زبان پر جاری تھی بلکہ ہر سال نہایت

---

[1] غالباً یہیں سے موسیٰ کو دریائے نیل میں پھینکے جانے کی روایت لی گئی ہے

شان و شوکت کے ساتھ اس کا ڈرامہ کھیلا جاتا تھا۔ ماہ نومبر میں جب مصر میں فصل ربیع کی تخم ریزی کا وقت ہوتا ہے بمقام سائیس (SAIS) یہ رسم ادا ہوتی تھی۔ اول تو چار دن تک اوسیریز کی موت پر خوب ماتم کیا جاتا تھا۔ پھر تین دن بعد پجاری لوگ ایک طلائی صندوق لے کر دریا پر جاتے صندوق میں پانی ڈالتے اور پھر نعرہ ہائے مسرت و شادمانی بلند ہوتے کہ اوسیریز مل گیا ہے۔ بہرحال اس کے معنی خواہ کچھ ہوں لیکن یہ ظاہر ہے کہ اہل مصر زمانہ نامعلوم سے ایک مصیبت زدہ مقتول اور زندہ ہونے والے دیوتا سے بخوبی واقف تھے۔

ایران قدیم ہم نے ابھی تک ایران کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ یہی وہ سلطنت تھی جو بابل، آشوریہ اور مصر کے زوال کے بعد اس وقت کی تمام متمدن دنیا پر غالب آگئی تھی۔ اور اس کا مذہب مدائن (PERSIPOLIS) سے لے کر جزائر برطانیہ تک اس وقت پھیلا ہوا تھا جبکہ دین عیسوی نہایت ہی کمزور ضعیف حالت میں پایا جاتا تھا۔

ان دنوں ایران کا مذہب مثھرائیت (MITHRAISM) تھا جو دین عیسوی سے بہت پہلے کا مذہب تھا۔ اس مذہب کا عقیدہ تھا کہ گناہوں سے نجات دلانے والی ایک ہستی ہے جو بغیر باپ کے کنواری ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئی اس دیوتا کی ولادت موسم کے وسط میں (یعنی دسمبر کے آخری ہفتہ میں پیدائش یسوع کی طرح) ایک غار کے اندر ہوئی۔ مثھرائیت کے مندر تارک الدنیا لوگوں سے معمور تھے۔ جہاں ہر حال معتقدین کے سامنے یہی تقریب ہوا کرتی تھی یعنی دیوتا سے

صدیوں پیشتر ہر سال یہ ڈرامہ ہوتا تھا کہ مترا (MITHRA) دیوتا نے جان دے کر لوگوں کے گناہوں کا کفارہ دیا اور پھر جی اٹھا (یہی عقیدہ عیسائیوں کا بھی ہے) اس کی ہر سال خوشیاں منائی جاتی تھیں۔

پادری فرمیکس میٹرنس نے اپنی کتاب "اغلاط مذاہب باطلہ" (ERRORS OF PROFANE RELIGIONS) کے باب ۲۲ میں اس تقریب کا حال اس طرح بیان کیا ہے "ہر سال ایک خاص رات مقرر کر کے ایک بت ارتھی پر رکھا جاتا ہے جس کا مذہبی جھونوں کے ساتھ ماتم کرتے ہیں۔ جب اس مصنوعی نوحہ زاری اور ماتم سے ان کا دل بھر جاتا ہے تو پھر ایک روشنی اندر لائی جاتی ہے۔ اس کے بعد تمام ماتم گساروں کے منہ پر ایک پجاری تیل چھڑکتا ہے اور آہستہ آہستہ یوں کہتا جاتا ہے

"اے مرکر زندہ ہونے والے دیوتا کے پرستارو! خوشیاں مناؤ کیونکہ اب تمہیں تمہارے غم والم سے نجات مل گئی ہے"

یونان قدیم قدیم یونانیوں میں بھی اس قسم کی بہت سی روایات پائی جاتی ہیں قدیم یونانیوں کا خدائے عظیم زیوس (ZEUS) تھا اور جس طرح ہندوستان کا مہادیو کیلاش پربت پر رہتا ہے اسی طرح قدیم یونان کا خدا کوہ اولمپس پر رہتا تھا۔ زیوس کی بیوی کا نام ہیرا دیوی تھا لیکن اس کی ایک اور بھی محبوبہ تھی جس کا نام دیمتر (DEMETER) یعنی دیوتاؤں کی ماتا (دیوی ماتری) دیمتر کے بطن سے ایک حسین وجمیل لڑکی پرسفونی (PERESEPHONE) پیدا ہوئی جس کا دوسرا نام کوڑے یا کوڑا (KORA) تھا جس کے معنی "لڑکی" کے ہیں۔

(پنجابی زبان میں لڑکی کو کوڑی، کڑی یا کڑیا کہنا کہیں اسی واقعہ تو تعلق نہیں رکھتا) پاتال کا راجہ پلوٹو (PLCTO) یعنی مجراج اس لڑکی پر عاشق ہوگیا۔ سنگدل اور رحیم وکریم زیوس کو اس کی حالت پر رحم آیا اس لئے اس نے پلوٹو کو صلاح دی کہ چونکہ لڑکی کی ماں دیمتر دیوی اپنی بیٹی کو پاتال جانے کی ہرگز اجازت نہ دے گی اس لئے بہتر ہوگا کہ کسی روز جب تمہاری معشوقہ پرسیفونی چمنستان خلد میں سیر کو آئے تو تم اُسے اڑا لے جاؤ۔ پلوٹو نے ایسا ہی کیا لڑکی کی ماں دیمتر دیوی کو جب صاحبزادی کی گمشدگی کا حال معلوم ہوا تو وہ اس کی تلاش میں روتی اور دنیا بھر کی خاک چھانتی پھری۔ (اسی طرح آئسیس دیوی اوسیریز کو، اشتار دیوی تموز دیوتا کو اور یہودی عورتیں یسوع ناصری کو ڈھونڈھتی پھرتی تھیں) بالآخر اُسے معلوم ہوگیا کہ پرسیفونی کہاں ہے۔ اس کے بعد اس نے زیوس کی منت وسماجت کی کہ اس کی لڑکی واپس دلائی جائے۔ زیوس نے رحم کھا کر پلوٹو کو حکم دیا کہ وہ پرسیفونی کو واپس کردے۔ پلوٹو نے بادل ناخواستہ منظور کر لیا لیکن جانے کی اجازت دینے سے پہلے پلوٹو نے پرسیفونی کو ترغیب دی کہ وہ ایک انار کھالے (یونانی روایات کے مطابق انار کھانے کا مطلب یہ تھا کہ پرسیفونی انار کھا کر پاتال کی مستقل باشندہ ہو جائے) بہرحال آپس میں یہ مفاہمت ہوگئی کہ پرسیفونی چار ماہ تک اپنے عاشق پلوٹو کے پاس پاتال میں گزارے اور بقیہ آٹھ ماہ اپنی والدہ دیمتر دیوی کے پاس رہے۔

قدیم یونان کی دوسری روایت اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے وہ اس طرح ہے کہ خداوند زیوس (آسمانی خدا یا باپ) کی طبیعت ایک حسین وجمیل دوشیزہ

لڑکی سمیلہ (SEMELE) پر عاشق ہو گئی دونوں میں اختلاط ہوا تو اس کنواری کی ماں کے پیٹ سے ایک لڑکا (دیوتا) پیدا ہوا جس کا نام ڈیونی سوس (DIONUSUS) تھا لیکن زیوس کی بیوی ہیرا دیوی کو جب اپنے شوہر اور سمیلہ کی عشق بازیوں اور استقرار حمل کا حال معلوم ہوا تو بہت برافروختہ ہوئی اور اس نے چاہا کہ اس بچہ کو ضائع کر دے اس لئے کنواری ماں سمیلہ کو بحالت سفر درد زہ شروع ہوا تو اسے غار کے اندر چھپ کر بچہ جننا پڑا۔ اور اس کے بعد بھی ہیرا کے خوف سے اس نوزائیدہ بچے کو خفیہ خفیہ کسی دوسری جگہ بھیجدیا (آج کل یہی صورت ولادت یسوع ناصری کی بیان کی جاتی ہے) مگر ہیرا دیوی نے دوسرے طریقہ سے انتقام لیا۔ یعنی وہ جوش سے بھری ہوئی بحالت جنون عین عالم شباب میں اس لڑکے کے پاس پہونچ گئی اور بس۔۔۔۔۔ اس کے بعد وہ نوجوان دنیا بھر میں گھومتا پھرا (واضح ہو کہ مسیح کے معنی بھی زمین کی پیمائش کرنے والا ہے) وہ صاحب معجزہ ہو گیا۔ دریاؤں اور جھیلوں کو پیدل عبور کر جاتا تھا اور اس کے پاؤں خشک رہتے تھے اسی قسم کے اور معجزات بھی وہ دکھاتا تھا (یہی باتیں یسوع سے منسوب کی جاتی ہیں) ڈیونی سوس دیوتا دوگونہ خصوصیات کا مالک تھا۔ ایک تو وہ ہر جگہ تہذیب و تمدن پھیلاتا تھا، دوسرے وہ جہاں جہاں پہونچتا تھا وہاں شراب کباب اور سیہ مستیوں کا دور دورہ شروع ہو جاتا تھا (یسوع کی امت بھی آج کل یہی فرض ادا کر رہی ہے)

اس ڈیونی سوس دیوتا کا کیا حشر ہوا۔ اس کی نسبت دو روایتیں بیان کیجاتی ایک روایت یہ ہے کہ وہ پاتال میں اترا اور وہاں سے اپنی ماں سمیلہ کو نکال لایا اور

پھر اسے ساتھ لے کر آسمان پر چڑھ گیا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ ٹائٹن (TITON) دیوتاؤں نے پارہ پارہ کر دیا تھا لیکن اسے پھر دیوتاؤں نے زندہ کر دیا اور وہ آسمان پر چلا گیا (یسوع کے متعلق بھی یہی عقیدہ ہے)

جب ڈیونی سوس دیوتا کا تہوار منایا جاتا تھا تو اُسے ایک خوبصورت اور پیارے بچے کی صورت میں دکھایا جاتا تھا اور اس کی ماں سمیلہ بھی اس کے پاس ہوتی تھی (رومن کیتھولک گرجاؤں میں بھی کنواری مریم اور مسیح بچے کی ایسی ہی خوبصورت تصویریں ہوتی ہیں)

یونان قدیم کی تیسری دلچسپ کہانی ہرقلیس (HERCULUS) سے یسوع کے پیدا ہونے اور آسمان پر چڑھنے کے قصہ کی پوری وضاحت ہوتی ہے۔

ہرقلیس بھی بغیر باپ کے کنواری ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا جس کا نام القمینہ (ALCEMENE) تھا جس کی ہر چند شادی ہو چکی تھی لیکن کوئی منت ماننے کی وجہ سے وہ ہنوز اپنے شوہر کے پاس نہ گئی تھی (بعینہ یہی حالت یسوع کی ماں مریم کی تھی وہ بھی یوسف نجار سے منسوب ہو چکی تھی لیکن منت ماننے کی وجہ سے بیت المقدس کی خدمت کیا کرتی تھی اور ابھی تک سسرال نہیں گئی تھی) بہرحال مسماۃ القمینہ سے حالت دوشیزگی میں خداوند زیوس نے ملاقات کی یا یوں سمجھئے کہ قادرِ مطلق خدا کی قدرت نے اس دوشیزہ عورت پر اپنا پرتو ڈالا اور حمل ٹھہر گیا (بالکل یہی فسانہ ولادتِ یسوع کے متعلق بیان کیا جاتا ہے) زیوس کی بیوی ہیرا کو جب یہ حال معلوم ہوا تو وہ سخت ناراض ہوئی اور اس نے ارادہ کیا کہ اس بچے کو قتل کر ڈالے۔ اس لئے

الکمینہ نے کسی پوشیدہ جگہ جا کر وہ بچہ جنا اور اُسے چھپا دیا۔ (یسوع ناصری کی ولادت بھی اسی طرح خفیہ طور پر ایک غار کے اندر ہونا بیان کی جاتی ہے) ژیوس نے اپنی بیوی ہیرا کو سمجھا بجھا کر راضی کر لیا اور اس نے اس شرط پر کہ اگر وہ لڑکا جوان ہو کر اس کی بارہ شرطیں پوری کر دے گا تو وہ اس کی جان نہیں لے گی مفاہمت کر لی۔ اس کے بعد ہفتخوان رستم و اسفندیار کی طرح ہرقلیس نے بعض کارہائے عظیم انجام دیئے جن سے ہم کو کوئی تعلق نہیں لیکن ہم کو ہرقلیس کے انجام سے خاص تعلق ہے یعنی یہ کہ اس کی بیوی نے اُسے زہر دیدیا۔ ہرقلیس نے ایک بڑی چتا بنائی اور اس میں بیٹھ کر ایک چرواہے سے کہا کہ وہ آگ لگا دے۔ اس کے بعد آسمان سے ایک ابر آیا اور ہرقلیس کے شاگردوں نے دیکھا کہ وہ اس ابر میں بیٹھ کر آسمان پر چڑھ گیا۔

اسی طرح صدیوں بعد فلسطین میں بنی اسرائیل کی ایک کنواری لڑکی کے بطن سے خفیہ طور پر غار کے اندر ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے جو بہت سے معجزے دکھاتا ہے زہر پینے کے بجائے اسے صلیب دی جاتی ہے وہ چتا پر بیٹھنے کے بجائے ایک پہاڑ کی چوٹی پر چڑھتا ہے جہاں ایک لکہ ابر نمودار ہوتا ہے اور اُسے اٹھا لے جاتا ہے اور وہ آسمان پر غائب ہو جاتا ہے (تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو کتاب الاعمال جلد نمبر ا آیہ نمبر ۹) یسوع ناصری کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ وہ مردوں کو زندہ کر دیا کرتا تھا لیکن حکیم اسقلیبوس یونانی نے اتنے مُردے زندہ کر دیئے تھے کہ خداوند فلوطس نے اس کو اس خیال سے مار ڈالا کہ کہیں تمام فانی انسان موت سے نہ بچ جائیں۔ اس کے بعد ژیوس نے اسقلیبوس کو پھر زندہ کر دیا اور دیوتاؤں میں رہنے کے لئے اسے

آسمان پر اُٹھا لے گیا۔ یسوع ناصری کا قصہ بھی بالکل ویسا ہی ہے)

الغرض جب جس دنیا میں مسیحیت نے جنم لیا اس میں کوئی قوم ایسی نہ تھی جس کے یہاں کسی دیوتا کی پُر اسرار موت، احیاء ثانیہ و رفع الی السماء کا قصہ موجود نہ ہو اور یونانیوں میں ہرقلیس کا قصہ بچہ بچہ کی زبان پر تھا۔ الغرض دنیا کی حالت یہ تھی کہ دفعتاً ایک جوشیلا اور زمانہ شناس یہودی مسمیٰ پولوس ساکن شہر طارسوس اٹھا اور اس نے اس سے فائدہ اُٹھایا۔ وہ یونانیوں سے کہتا ہے کہ ایک خدا کا بیٹا۔ کنواری لڑکی کے پیٹ سے پر اسرار طور پر پیدا ہونے والا خدا، چند سال ہوئے مسلک یہودیہ میں ظہور پذیر ہوا اس نے محیر العقول معجزے دکھائے۔ لوگوں نے اسے صلیب دیکر مار ڈالا۔ مگر وہ مر کر پھر زندہ ہو گیا اور ایک پہاڑ کی چوٹی پر سے لگے ہاتھ میں بیٹھ کر اپنے باپ کے پاس آسمان پر چلا گیا۔ یونانیوں کے نزدیک یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ انہوں نے ہرقلیس کی طرح اس افسانہ کو بھی سنا اور قبول کر لیا۔

یسوع کی طرح اور بہت سے دیوتا کنواریوں کے پیٹ سے پر اسرار طور پر غاروں میں پیدا ہو چکے تھے جس طرح یسوع ناصری پانی پر چلتے تھے اور ایک مرتبہ سواری کے لئے دو گدھے بھی طلب کئے تھے۔ اسی طرح صدیوں پیشتر یونانیوں کا دیوتا دیونی سوس پانی پر چلتا تھا اور اس نے بھی ایک مرتبہ دریا کو عبور کرتے ہوئے دو گدھوں میں سے ایک طلب کیا تھا جو اسے سوار کر کے خشکی کی طرح دریا کو عبور کر لیتا تھا۔

یسوع کے احیاء ثانیہ کی کہانی بھی دیگر ہمسایہ مذاہب سے لی گئی ہے جس طرح

ان کے دیوتا پاتال میں اتر گئے تھے اسی طرح یسوعؑ بھی تین روز تک قبر میں رہے جس طرح ان دیوتاؤں کی موت پر گریہ وزاری کی گئی اسی طرح یسوعؑ کی موت پر عورتوں نے ماتم کیا اب رہا پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنا، بادل میں سوار ہونا اور آسمان پر چلا جانا سو یہ قصہ لفظ بلفظ ہرقلیس یونانی کی کہانی سے لیا گیا ہے۔

مر کر زندہ ہونے کا اصلی مطلب اب تک جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس سے ناظرین کرام کو بخوبی علم ہو گیا ہوگا کہ جس ملک میں بھی دین عیسوی پہونچا وہاں کسی کے مر کر زندہ ہونے کا عقیدہ عام بات تھی مر کر زندہ ہونے والا عموماً کوئی دیوتا ہوتا تھا۔ تمام سرزمین عراق میں کلدانیوں کے شہر اور سے لے کر یروشلم تک اس دیوتا کا نام تموز تھا فلسطین کے شمالی علاقہ اور اس سے بھی شمالی علاقوں میں اس دیوتا کو آتیس کہتے تھے۔ ایشیائے کوچک اور تمام فنیقی دنیا میں اس دیوتا کا نام ایڈونیس تھا اور ایرانی دنیا میں یہی دیوتا متھرا کہلاتا تھا اور ملک مصر میں اس دیوتا کو اوسیرس کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس کا حریف سیت تھا جسے لوگ ملک الظلمات اور خدا وند شر کہتے تھے۔

دیوتاؤں کے مر کر زندہ ہونے کے متعلق جس قدر روایات اور خرافیات ہم نے درج کی ہیں وہ دراصل تمثیلی قصے ہیں جس کا اصلی مطلب نور و ظلمت اور خیر و شر کی ابدی جنگ ہے جو دیوتا ہر سال مر کر زندہ ہوتا تھا وہ دراصل سورج ہے جو موسم سرما میں مر جاتا ہے یعنی خط استوا جانب جنوب یا پاتال کو چلا جاتا ہے اور پھر وہی دیوتا فصل بہار میں زندہ ہو جاتا ہے یعنی آفتاب خط استوا سے جانب شمال رجوع کرتا

ہے۔ حیات و ممات کا دوسرا مطلب زمین کی قوت نمو کا سالانہ فنا ہونا اور فصل بہار میں پھر عود کر آنا ہے۔

اس وقت ہمارے سامنے دو باتیں زیر غور ہیں یعنی آفتاب کا عروج و زوال اور اس کے ساتھ قوت نمو کی کمی یا زیادتی۔ بعض اقوام پر ان دونوں میں سے ایک نے بمقابلہ دوسری کے زیادہ اثر کیا۔ مثلاً ایرانی دیوتا مشرا کی موت و حیات ثانیہ صاف طور پر شمسی روایت ہے اور دیمترا اور اس کی بیٹی کی کہانی صاف طور پر زمین کی قوت نمو کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اسی طرح تموز، قابیلہ۔ آتیس کی روایات بھی صاف ہیں۔ اوسیریز مصری خود سورج دیوتا تھا۔ اب غور طلب بات صرف یہ ہے کہ ان مختلف دیوتاؤں کے تہوار مختلف ممالک میں مختلف مہینوں میں کیوں منائے جاتے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قدرت کی کارفرمائیاں مختلف ممالک میں مختلف ہیں۔ مثلاً جو شخص کسی شمالی ملک یا مرتفع معتدل ملک کا رہنے والا ہے اس کے لئے سورج کا زوال جس کے باعث جاڑے کی شدت ہو جاتی ہے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ جو لوگ جنوب میں رہتے ہیں ان کے لئے زوال آفتاب کسی قدر راحت بخش ہے اور سال کے زیادہ حصہ میں نباتات کا مردہ رہ کر فصل بہار میں دفعتاً پھولوں کا نکلنا اور اناج کا پیدا ہونا ان کے دلوں پر زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ لہذا ہم کو یہاں دونوں قسم کی روایات کا مرکب قصہ ملتا ہے اور چونکہ مختلف ممالک میں بہار اور برسات کا موسم مختلف ہوتا ہے اس لئے مختلف ممالک میں یہ تہوار باوقات مختلف منائے جاتے تھے۔

یسوع ناصری کی اصلیت

ہم اس سے قبل یہ بیان کر چکے ہیں کہ اس وقت بہت سے فلسفی ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو یسوع ناصری کے وجود ہی سے انکار کرتے ہیں اور دیوتاؤں کے مر کر زندہ ہونے اور آسمان پر چلے جانے کی روایات پر جو استدلال ہم نے کیا ہے اس سے یقیناً یسوع کا وجود ہی غائب ہو جاتا ہے مگر اس "دیوزاد" یسوع کا وجود غائب ہوتا ہے جسے عیسائی خدا مانتے ہیں جس کی سوانح عمری اناجیل اربع میں لکھی ہے۔ اگر کسی یسوع ناصری کا دنیا میں وجود تھا تو وہ کوئی دوسرا انسان تھا۔

قبل اس کے حقیقت یسوع پر مزید بحث کریں ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ یسوع سے پیشتر بھی دنیا میں زہد و اتقا، تجرد و رہبانیت تقوی و پرہیزگاری اور نفس کشی کا مذہب و مشرب موجود تھا۔ یہی باعث تھا کہ ملک یہودیہ میں یسوع سے بھی پیشتر ایک فرقہ ایسا پیدا ہو گیا تھا جو ترک دنیا اور زاویہ نشینی کے ساتھ زہد و ریاضت اور تجرد کی زندگی بسر کیا کرتا تھا۔ اس فرقہ کا نام عیسینی (ESSENE) تھا (ممکن ہے اسی سے لفظ عیسیٰ اور عیسائی نکلا ہو) زوال بابل کے بعد جب یہودیوں پر ایرانیوں کا اثر پڑا تو غالباً اس وقت یہ فرقہ پیدا ہوا تھا۔ ایرانی مذہب میں پاکیزگی اور صفائی پر سخت زور دیا جاتا ہے اور یسوع ناصری سے پیشتر مذہب بودھیت (BUDHA) ملک یہودیہ میں پہونچ گیا تھا جس کا یہودیوں اور یونانیوں اور بعد ازاں عیسائیوں پر بہت اثر پڑا تھا۔ الغرض یسوع مسیح کے زمانہ میں فلسطین کی سرحد پر ان عیسینی راہبوں کی خانقاہیں موجود تھیں اور اس فرقہ کے بہت سے آدمی شہروں میں بھی رہا کرتے تھے چنانچہ

مورخ جوزیفس نے اپنی کتاب تاریخ یہود جلد دوم باب ہشتم صفحات ۲ تا ۱۴ میں اس فرقہ کا حسب ذیل حال بیان کیا ہے۔

"یہ عیسینی فرقہ عیش و عشرت کو گناہ سمجھ کر ٹھکرا دیتا ہے، صبر و ضبط، تجرد و رہبانیت اور نفس پر غلبہ حاصل کرنے کو نیکی سمجھتا ہے۔ یہ لوگ شادی نہیں کرتے لیکن شادی بیاہ کے فوائد سے وہ منکر بھی نہیں ہیں کیونکہ اس سے بقائے نسل انسانی ہوتی ہے..... یہ لوگ مال و دولت کو حقیر سمجھتے ہیں اور ان میں کوئی بھی ایسا نہیں جو بمقابلہ دوسرے ہم مشرب کے زیادہ دولتمند ہو، یہ لوگ کسی خاص شہر میں نہیں رہتے بلکہ ہر شہر میں رہتے ہیں اور جب کبھی ان کا کوئی ہم مشرب کسی دوسرے شہر سے مہمان آتا ہے تو جو کچھ میزبان کے پاس ہوتا ہے وہ سب پیش کر دیتا ہے گویا وہ اسی کا مال ہے۔ اسی وجہ سے یہ لوگ سفر میں اپنے ساتھ کچھ بھی لے کر نہیں چلتے خواہ ان کو کتنا ہی طویل سفر درپیش ہو جو کپڑا ان کے تن پر یا جو جوتا ان کے پاؤں میں ہوتا ہے وہ جب تک پھٹ نہ جائے بدلا نہیں جاتا۔ یہ لوگ آپس میں خرید و فروخت نہیں کرتے بلکہ ہر شخص کے پاس جو چیز ہوتی ہے اس سے حسب ضرورت دوسرا شخص کام لے سکتا ہے۔ یہ لوگ بہت سادہ غذا کھاتے ہیں۔ کئی کئی بار غسل کرتے ہیں۔ محنت سے جان نہیں چراتے اور نماز و دعا میں مصروف رہتے ہیں، یہ لوگ بڑے وفادار ہوتے ہیں، جو بات ایک بار اپنی زبان سے کہہ دیتے ہیں اس سے کبھی نہیں ٹلتے لیکن یہ لوگ قسم کھانے سے پرہیز کرتے ہیں بلکہ اسے برا سمجھتے ہیں۔ جب کوئی نیا شخص اس فرقہ میں داخل ہونا چاہتا ہے تو اسے دو سال تک امید داری کرنا پڑتی ہے پھر کسے اصطباغ

دے کر دو سال تک مزید امتحان لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد مرید کیا جاتا ہے اور قبل اس کے کہ نئے آدمی کو اپنے دسترخوان پر بٹھائیں یا کھانے کو ہاتھ لگانے دیں وہ اس شخص سے سخت حلف لیتے ہیں کہ

(۱) میں خدا سے ڈروں گا اس میں کسی کو شریک نہ کروں یعنی حقوق اللہ پوری طرح سے ادا کروں گا۔

(۲) آدمیوں کے ساتھ ہمیشہ نیکی اور انصاف سے پیش آؤں گا یعنی حقوق العباد ادا کروں گا۔

(۳) کسی شخص کو خود اپنے دل سے یا کسی دوسرے کے کہنے سے ہرگز نقصان نہ پہنچاؤں گا۔

(۴) بدوں سے ہمیشہ نفرت اور نیکوں کی اعانت کروں گا۔

(۵) ہر شخص سے محبت و وفاداری سے پیش آؤں گا خصوصاً ارباب حل وعقد کی ہمیشہ اطاعت کروں گا کیونکہ بغیر تائید ایزدی کسی شخص کو حکومت نصیب نہیں ہوتی۔

(۶) اگر میں خود صاحب امر ہوں گا تو میں اپنے اختیارات سے ہرگز کوئی خلاف کام نہ کروں گا

(۷) ہمیشہ سچائی سے محبت کروں گا

(۸) جھوٹ بولنے والوں کی ہمیشہ تادیب کروں گا۔

(۹) اپنا ہاتھ چوری سے اور اپنی روح کو ناجائز خواہشوں سے پاک رکھوں گا۔"

مندرجۂ بالا تعلیم کو اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یسوع کی تعلیم نے اس میں کچھ بھی اضافہ نہیں کیا، جو طور طریق اور جو مشغلہ ان عیسینی راہبوں کا بتایا گیا ہے وہی زندگی

اور یہی شغل یسوع ناصری کا تھا۔ دولت سے نفرت، عصمت و طہارت، تجرد و رہبانیت غریبوں کی مدد، محبت بنی نوع انسان وغیرہ وغیرہ کی تعلیم یسوع نے بھی دی ہے۔ اب فرض کیجئے کہ اس فرقہ کا ایک شخص آزادانہ روح رکھتا ہے۔ لوگوں کو بتاتا ہے کہ خدا کی حکومت قریب ہے یعنی قیامت آنے والی ہے جبکہ ہر شخص کے اعمال تولے جائیں گے اس لئے گناہوں سے توبہ کرو مجھے خدا نے تمہاری ہدایت کے لئے بھیجا ہے یہ شخص یقیناً یسوع ناصری تھا۔

الغرض حقیقت صحیح یہ ہے کہ ناصرہ کے رہنے والے ایک شخص یوسف نجار کا ایک بیٹا یسوع نامی بچپن ہی میں فرقہ عیسینی کے اندر داخل ہو گیا تھا۔ اس فرقہ کے لوگوں سے یسوع نے ترک لذات نفس کشی، دولت سے نفرت کرنا سیکھا ہمیشہ ایک لبادہ پہنے مجردانہ طور پر زندگی بسر کرتا رہا۔ اس کا نہ کوئی مقررہ گھر تھا نہ ٹھکانہ، وہ کبھی دولت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا تھا۔ لوگوں سے اسے اس قدر محبت تھی کہ وہ بیماروں کا علاج کرتا تھا اور جو کچھ اس کے پاس ہوتا تھا دوسروں کو دینے سے ہرگز دریغ نہ کرتا تھا۔

اس یسوع کی طبیعت کسی قدر جوشیلی واقع ہوئی تھی عیسینی فرقہ کے راہب اگرچہ رسمی قربانیوں سے انکار کرتے تھے لیکن یسوع ایسی رسموں سے سخت متنفر تھا اس نے ان بیہودگیوں کے خلاف وعظ و تلقین کرنا شروع کر دیا۔ چونکہ اسے خود دولت سے نفرت تھی اس لئے بعض اوقات دولتمندوں کے خلاف بھی زہر اگلنے لگتا تھا اور چونکہ وعظ و نصیحت سے اسے کسی فائدہ کی طمع نہ ہوتی تھی اس لئے ایسے بے غرض شخص کی باتیں سننے کے لئے مجمع کثیر جمع ہو جاتا تھا۔ وہ لوگوں کو قرب قیامت ----

ڈرا کر انھیں متقیانہ زندگی بسر کرنے کی ترغیب دیتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنی روحوں کو یوم الحساب کے لئے تیار کرو۔ ممکن ہے کہ اپنی نفس کشی اور زہد و تقویٰ کی بنا پر وہ خود کو خدا کا بیٹا بھی کہہ بیٹھا ہو اور یہی بہانہ لوگوں کو اسے سزا دینے کا ہاتھ آیا ہو یہودیوں نے اسے ستانا شروع کیا اس لئے وہ رستے جوگی کی طرح فلسطین سے غائب ہو گیا۔ نہ اسے کسی نے صلیب پر چڑھایا نہ کسی نے قتل کیا اور یہی ہمارے نزدیک صحیح تاریخی واقعہ ہے۔ اس کے بعد لوگوں نے اناجیل اربعہ کی کہانیاں تصنیف کرکے اس متقی و پرہیزگار ناصح مشفق کو خدا کا بیٹا بلکہ خدا بنا دیا اور اس کے سوانح حیات طلسم ہوشربا کے افسانے بنا دیئے گئے ۔۔۔ اب میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا اس تحقیق کے بعد بھی ایک مسلمان اس بات کا قائل رہے گا کہ قرآن میں مسیح کے حالات وہی ہیں جو انجیل میں بیان کئے گئے یا وہ جو اس سے قبل میں بیان کر چکا ہوں۔

لقمان

(جناب سید عبدالمنان صاحب۔ بھروچ)

"کیا آپ ازراہ کرم بتا سکیں گے کہ سورۂ لقمان میں جن بزرگ کا ذکر ہے وہ کب اور کس زمانہ میں ہوئے ہیں اور ان کے تاریخی حالات کیا ہیں؟"

لقمان کا ذکر نہ صرف قرآن مجید میں نظر آتا ہے بلکہ عہد جاہلیت کے لٹریچر

میں بھی ملتا ہے اور مختلف حیثیتوں سے ملتا ہے۔ ایک حیثیت اُن کی نہایت طویل العمر انسان ہونے کی ہے۔ چنانچہ ان کی عمر کی تعیین اس طرح کی گئی ہے کہ انھوں نے چھ گدھ پالے جو اپنی عمر طبعی کو پہونچ پہونچ کر مر مر گئے لیکن جب ساتواں گدھ پالا جس کا نام لُبد تھا تو اس کے ساتھ وہ خود بھی انتقال کر گئے پھر چونکہ گدھ کی عمر طبعی کم از کم ~~۰۰ سال مانی گئی ہے~~ اس لئے لقمان کم از کم گویا ۷۰۰ سال زندہ رہے۔ بعض نے ان کی عمر ایک ہزار سال، بعض نے تین ہزار سال اور کسی نے ساڑھے تین ہزار سال بتائی ہے۔ ابو حاتم السجستانی نے اپنی کتاب المعمرین میں وضاحت سے جناب لقمان کی عمر کا ذکر کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ سات گدھوں کے پالنے کا قصہ صرف تمثیلی بیان ہے ان کی زندگی کے مختلف مدارج کا جیساکہ ساتویں گدھ (لبد) کے نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ لُبد اس شخص کو کہتے ہیں جو ایک جگہ جم کر رہ جائے نہ کہیں آئے نہ کہیں جائے۔ چونکہ آخری زمانۂ حیات میں انسان مضمحل ہو جانے سے چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہتا اس لئے اُس کو لُبد کہتے ہیں اور چونکہ ساتواں گدھ جس کا نام لُبد بتایا جاتا ہے ان کی زندگی کا آخری گدھ تھا اس لئے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ لُبد بول کر انکی زندگی کی آخری منزل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ افسوس ہے کہ پہلے چھ گدھوں کا نام ہمیں نہیں معلوم ورنہ ممکن تھا کہ ان ناموں کے مفہوم سے ہمارے اس نظریہ کی اور زیادہ تصدیق ہو سکتی۔ چونکہ لقمان سرزمین عرب سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ اور ان کے واقعات اہل عرب میں کسی دوسری زبان سے منتقل ہوئے ہوں گے

اس لئے ہو سکتا ہے کہ اس زبان میں لفظ گدھ بول کر کچھ اور مراد لی جاتی ہو اور بعد کو دوسری زبان کے راویوں نے اصل لغوی معنی لے لئے ہوں اور اس طرح غیر معمولی طوالت عمر کی روایت اہل عرب میں منتقل ہو گئی ہو۔

بہر حال حقیقت جو کچھ بھی ہو، عہد جاہلیت میں لقمان کو ایک حیثیت نہایت طویل العمر انسان ہونے کی بھی دی جاتی تھی لیکن کلام مجید سے اس کی تصدیق کسی جگہ نہیں ہوتی۔

دوسری اہم ترین حیثیت ان کے حکیم و دانشمند ہونے کی ہے اور تیسری وہ جو ان کی حکایات سے متعلق ہے۔ عہد جاہلیت اور عہد سعادت میں لقمان کی حیثیت صرف حکیم کی تھی اور بعض نصائح و امثال بھی ان کے مشہور تھے لیکن کوئی حکایت ان سے منسوب نہیں کی جاتی تھی چنانچہ جاہلیت کے مشہور شاعر نابغہ نے جہاں جہاں لقمان کا ذکر کیا ہے وہاں ان سے کوئی حکایت نقل نہیں کی بلکہ صرف ان کے دانشمندانہ احکام و اقوال کا ہی ذکر کیا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ زنا کی سزا سنگسار کرنا اور چوری کی سزا ہاتھ کاٹ ڈالنا سب سے پہلے لقمان ہی نے مقرر کی تھی۔ لقمان سے جو حکایات منسوب کی جاتی ہیں وہ رسول اللہ کے کئی صدی بعد کی بدعت ہے۔ عہد جاہلیت یا عہد رسالت کے لقمان سے انھیں کوئی واسطہ نہیں، مورخین اسلام کی تحقیق لقمان کی بابت بہت مختلف ہے۔ مسعودی کا بیان ہے کہ وہ آزاد شدہ حبشی غلام تھے اور داؤد کے زمانہ میں پائے جاتے تھے۔ بنیاذی کا بیان ہے کہ وہ باعوراکے لڑکے

تھے (اور باعورا، ایوبؑ کا بھانجہ یا خالہ زاد بھائی تھا) طبری کی تحقیق یہ ہے کہ وہ داؤدؑ کے وزیر تھے اور عہد یونسؑ تک زندہ رہے۔ بعض لقمان کو قوم عاد کا ایک شخص بتاتے ہیں بعض نے انھیں نبی بتایا ہے اور ان کے صحیفہ کا نام مجلہ ظاہر کیا ہے۔ ثعلبی نے لقمان اور بلعم باعورا کو ایک ہی ہستی قرار دیا ہے۔ بعض کی تحقیق یہ ہے کہ وہ اور یونانی حکیم (AESOP) ایسپ ایک ہی شخص تھے۔ ایک جماعت محققین کی اس طرف گئی ہے کہ لقمان دراصل اخیقار ہے۔ اخیقار سنحاریب (شاہ اشوریہ) اور اس کے بیٹے کے زمانہ کے نہایت ہی دانشمند و متقی وزیر تھے اور اس سے بہت سے اقوال و نصائح نقل کئے گئے ہیں۔ اس مسئلہ کی تحقیق کے سلسلہ میں سب سے پہلا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لقمان سرزمین عرب کے فرزند تھے یا باہر کے لیکن چونکہ متفقہ طور پر سب نے یہ تسلیم کیا ہے کہ وہ اہل عرب میں سے نہ تھے[ـه] اس لئے اب غور طلب امر یہ رہ جاتا ہے کہ وہ کہاں کے رہنے والے تھے۔ ان کا کیا نام تھا اور مسلمانوں کی روایات میں ان کا ذکر کیوں کر آگیا۔ اس وقت تک جتنی تحقیق ہو چکی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لقمان کی ہستی متعین کرنے میں بلعم باعورہ، ایسپ یونانی اور اخیقار انھیں تینوں کا نام آتا ہے اور انھیں

ـه ایک بڑا ثبوت لقمان کے غیر عرب ہونے کا یہ ہے کہ قرون وسطی میں جو حکایات لقمان کا مجموعہ شائع ہوا ہے۔ اس میں کسی جگہ شتر مرغ، دنبہ، گیدڑ، اور لکڑبگھا کا ذکر نہیں ہے جو عرب کے خاص جانور ہیں اور جن کا ذکر ایک عرب نژاد شخص کے حکایات میں ہونا ضروری تھا۔

تینوں میں سے کوئی ایک شخص سرزمین عرب میں لقمان کے نام سے موسوم ہو گیا ہوگا

اب ہم ان تینوں پر الگ الگ تفصیلی گفتگو کر کے دیکھتے ہیں کہ ان میں سے کس کو لقمان سمجھیں اور کس کو نہیں۔

(۱) عربی زبان میں جس کو بلعم باعورہ یا بلعم بن باعورہ کہتے ہیں وہ وہی ہیں جو عبرانی میں بلعام بن بعور کے نام سے موسوم ہے۔ لقمان و بلعم دونوں کو ایک ہی ہستی قرار دینے کی سب سے بڑی دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ لفظ بلعم کا مادہ (بلع) اور لفظ لقمان کا مادہ (لقم) دونوں ہم معنی ہیں یعنی جس طرح بلع کے معنی نگلنے کے ہیں اسی طرح لقم کے بھی ہیں اور یہ بالکل قرین عقل ہے کہ بلعم کا ترجمہ کر کے عربی میں اسے لقمان کر دیا گیا ہو۔ ثعلبی نے بھی یہی دلیل پیش کی ہے اور پطرس انفانسوس نے بھی یہی کہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں تک ان دونوں ناموں کی لغوی تحقیق کا تعلق ہے یہ بات دل کو لگتی ہے کہ بلعم اور لقمان کو ایک ہی ہستی قرار دیا جائے لیکن نہ قرآن پاک کے سورہ لقمان سے اس کی تصدیق ہوتی ہے اور نہ عہد جاہلیت کے لٹریچر سے۔ قرآن مجید میں لقمان کو ایک حکیم کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور ان کے بہت سے اقوال و نصائح بتا کر ان کا ذکر عزت و توقیر سے کیا گیا ہے جیسا کہ عہد جاہلیت کے لٹریچر میں بھی پایا جاتا ہے۔ درانحالیکہ اگر لقمان اور بلعم ایک ہی شخص ہوتے تو نہ کلام مجید میں ان کا ذکر احترام سے کیا جاتا اور نہ عہد جاہلیت میں کیونکہ بلعم کا ایک گمراہ ہستی ہونا توریت کی روایات سے ثابت ہے اور عہد جاہلیت اور عہد رسالت میں اہل عرب روایات توریت

سے بخوبی واقف تھے

خود قرآن مجید کی سورۂ اعراف کی آیت ۱۷۵ میں بلعم کے مردود ہونے کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے:-

"واتل علیھم نبا الذی آتیناہ آیاتنا فانسلخ منہا فاتبعہ الشیطان فکان من الغاوین۔"	ان لوگوں کو اس شخص کا حال پڑھ کر سناؤ جسے ہم نے اپنی نشانیاں دی تھیں پھر وہ ان نشانیوں سے محروم کر دیا گیا کیونکہ وہ شیطان کا تابع ہو کر گمراہ ہو گیا تھا۔

طبری نے اس آیت کی تفسیر میں بہت سی روایتیں بیان کی ہیں جن میں سے بعض روایات ظاہر کرتی ہیں کہ اس آیت میں بلعم کی طرف اشارہ ہے۔ ہر چند بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں امیہ بن ابی الصلت اور ابو عامر کی طرف اشارہ ہے لیکن اکثر کا رجحان اسی طرف ہے کہ بلعم مراد ہے علاوہ اس کے خود قرآن پاک کے سیاق و سباق سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد نبوی یا اس کے قریب زمانہ کا کوئی شخص مراد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ آیت سورۂ اعراف کی ہے اور یہ سورۃ وقف ہے امم قدیمہ وانبیاء سلف کے ذکر کے لئے۔ چنانچہ اس آیت سے قبل، نوحؑ، ہودؑ، صالحؑ، لوطؑ، شعیبؑ اور موسیٰؑ کا ذکر سلسلہ وار ہوتا چلا آیا ہے اور پھر چونکہ بلعم کا ذکر بھی شعیب و لوط ہی کے سلسلہ میں کیا جاتا ہے اس لئے قرین قیاس یہی ہے کہ آیت زیر بحث میں بلعم ہی کا ذکر کیا گیا ہو جس نے حسب روایات توریت آخر میں خدا سے نافرمانی کی اور خدا نے اس سے اپنی نشانی مستجاب الدعوات ہونے کی چھین[1] لی۔

---

[1] دیکھو توریت کتاب اعداد باب ۲۲-۲۴

اور اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے مان لیں کہ اس آیت میں بلعم کی طرف اشارہ نہیں ہے تو بھی کلام مجید میں جس لقمان کا ذکر ہوا ہے وہ بلعم نہیں ہو سکتے کیونکہ بلعم کا ایک مرد حبشی ہونا روایات توریت کے مطابق ضرور رسولؐ کو معلوم رہا ہوگا اور لقمان کا ذکر قرآن پاک میں نہایت عزت و احترام سے ہوا ہے اگر لقمان و بلعم ایک ہی شخص ہوتے تو لقمان کا ذکر نہ قرآن پاک میں اس طرح کیا جاتا اور نہ عہد جاہلیت کے لٹریچر میں اس کو کوئی بلند مرتبہ دیا جاتا!

(۲) وہ لوگ جو لقمان اور ایسپ (یونانی) کو ایک ہی شخص بتاتے ہیں انکی دلیل یہ ہے کہ لقمان کا "ETHIOP" یعنی حبشی ہونا ثابت ہے اور "Th" کا تلفظ "س" یا "ث" ہوتا ہے۔ اس لئے ملک شام میں یہ لفظ "SOPHOS" (سوفوس) ہوگیا اور یونان میں ایسپ (AESOP) یا ایسپس (AESOPUS) علاوہ اس کے دوسری دلیل یہ ہے کہ ایسپ ہی اپنی نصیحت آمیز حکایات کی وجہ سے بہت مشہور ہوا ہے۔

ہم کو اس کی صحت میں بھی تامل ہے کیونکہ اگر لقمان واقعی آزاد شدہ حبشی غلام تھے اور عہد داؤد میں وزیر کے عہدہ پر فائز تھے تو ایسپ سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا کیونکہ داؤد کا زمانہ ۱۰۰۰ قبل مسیح تھا اور ایسپ کا زمانہ ۶۲۰ ق م سے ۵۶۴ ق م تک۔ اب اگر لقمان کا عہد داؤد میں پایا جانا غلط سمجھا جائے اور ان کو ایسپ ہی قرار دیا جائے تو ظاہر ہے کہ عہد جاہلیت اور عہد رسالت میں ان کی حکایات کا بھی علم رہا ہوگا لیکن عہد جاہلیت کے لٹریچر اور قرآن مجید

میں صرف لقمان کے اقوال و امثال پائے جاتے ہیں اور کوئی ایک حکایت بھی ان سے منسوب نہیں کی جاتی۔ حکایات لقمان کے نام سے جو مجموعہ مشرقی لٹریچر میں پایا جاتا ہے وہ رسول اللہ کے بعد قرون وسطی کی چیز ہے[1] اور اس میں بیشک ایسپ کے انداز کی بہت سی حکایتیں نظر آتی ہیں، سو یہ ہو سکتا ہے کہ حکایات لقمان والی ہستی ایسپ ہی ہو لیکن وہ لقمان جن کا ذکر قرآن مجید اور قدیم عربی لٹریچر میں نظر آتا ہے وہ ایسپ کے علاوہ کوئی اور ہستی تھی۔

(۳) اخیقار جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا سخاریب شاہ اشوریہ کا وزیر تھا جو اس کے بیٹے ایسار ہادون کے زمانہ تک رہا۔ اخیقار کی نسبت لکھا ہے کہ وہ نہایت دانشمند وزیر تھا اور اس سے اقوال و نصائح بکثرت منقول ہیں۔ ہمارے نزدیک وہ لوگ جنھوں نے اخیقار اور لقمان کو ایک ہی شخص قرار دیا وہ زیادہ راستی پر ہیں۔ اس کا ثبوت نہ صرف ان کی کتابوں سے ملتا ہے جن میں اقوال لقمان جمع کئے گئے ہیں بلکہ خود قرآن مجید سے ملتا ہے کیونکہ بعض نصائح یا اقوال جو اس میں بیان کئے گئے ہیں وہی ہیں جو اخیقار کے ہیں۔

ثعلبی نے جو اقوال لقمان کے جمع کئے ہیں اُن میں چند اقوال یہ ہیں:-

(۱) اپنے دوستوں کے ساتھ محبت و اخلاق کا برتاؤ کر لیکن اس حد تک

---

[1] پہلا مجموعہ حکایات لقمان کا جس میں اسم قصے درج ہیں ۱۲۹۹ھ میں بمقام پیرس شائع ہوا تھا۔ دوسرا مجموعہ حکایات حکیم سانوس کے نام سے زیر ادارت لیند برگ شائع ہوا۔ واضح ہو کہ شامی زبان کا سانوس وہی ہے جو یونانی زبان کا ایسانوس یا ایسپ ہے۔

نہیں کہ احکام خداوندی کی نافرمانی ہونے لگے۔

(۲) تادیب کی چھڑی بچہ کے لئے اتنی ہی مفید ہے جتنا پانی تخم کی نشوونما کے لئے۔

(۳) سفر کو نکلو تو مسلح ہو کر نکلو۔

(۴) بیمار ہونے سے پیشتر طبیب سے مشورہ کر لیا کرو۔

اور یہی تمام اقوال تھوڑے تغیر کے ساتھ بالکل اخیقار کے بھی ہیں۔

خود قرآن پاک کے اندر نصائح لقمان کے سلسلہ میں ایک جگہ یہ نصیحت درج ہے:۔

واقصد فی مشیک واغضض من صوتک ان انکر الاصوات لصوت الحمیر	جب چلو تو سیدھا راستہ چلو اور گفتگو کرو تو آہستگی سے کیونکہ گدھے کی آواز بدترین آواز ہے

اخیقار کا قول ہے کہ چلنے میں اعتدال اختیار کر، بولنے میں نرمی سے کام لے کیونکہ اگر بلند آواز سے کوئی گھر بن سکتا تو گدھا ایک دن میں دو گھر بنا لیتا۔ ان دونوں اقوال کی مماثلت جس قدر واضح ہے محتاج بیان نہیں۔ اس تمام بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عہد جاہلیت اور عہد سعادت میں جس لقمان کا ذکر پایا جاتا ہے اس سے مراد اخیقار ہے جو نینوا کے بادشاہ سنحاریب کا وزیر تھا۔ اور قرون دیگر میں جو قصص و حکایات لقمان کے نام سے جمع کئے گئے ہیں وہ ایسپ یونانی کے ہیں۔ رہا یہ امر کہ اخیقار عربی میں لقمان کیونکر بن گیا سو اس کی ایک توجیہہ یہ ہو سکتی ہے کہ اخیقار کے روایات حکمت کے نام ہی سے مشہور ہوئی ہوں اور

اہل عرب نے اس کا ترجمہ کرکے لقمان کر لیا ہو اور پھر اس نے "نام" کی حیثیت اختیار کرلی ہو یا یہ کہ خود اشوریہ کی زبان میں احیقار یا اخیقار کا مفہوم لفظ لقمان سے ملتا جلتا ہو۔

عالمِ برزخ

(جناب سید علی حسین صاحب مبارکپور)

عقاید اہل اسلام میں ایک عقیدہ عالم برزخ کا بھی ہے کہ وہاں روحیں رہتی ہیں اور قیامت تک رہیں گی گویا یہ ایک عالم اور ہے جس کا تعلق نہ اس دنیا سے ہے نہ آخرت سے کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس عقیدہ کی اصلیت کیا ہے اور اہل اسلام میں کہاں سے آیا؟

قبل اس کے کہ مسلمانوں کے اس عقیدہ سے گفتگو کی جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مذاہب قدیمہ کی جستجو کرلی جائے کہ ان میں یہ خیال پایا جاتا تھا یا نہیں اور اگر پایا جاتا تھا تو کس مفہوم کے ساتھ۔

روح کے بقا کا خیال نہایت قدیم ہے حتیٰ کہ "اخلاقی مذاہب" کے وجود سے پہلے انسان اپنے عہد وحشت و بربریت میں بھی یہی یقین رکھتا تھا کہ موت کے بعد نہ صرف روح باقی رہتی ہے بلکہ اپنے پسماندگان سے واسطہ رکھتی ہے۔

اور اس عقیدہ کا سبب "جذبۂ محبت" ہے یا جذبۂ "خوف و احترام" — یعنی اگر کوئی عزیز و محبوب ہستی اُٹھ جاتی تھی تو ان کا جذبۂ محبت مجبور کرتا تھا کہ وہ اس کی روح کو موجود مان کر اپنی تسلی و تسکین کرلیں اور اگر کوئی صاحب اثر و اقتدار ہستی اُٹھ جاتی تھی تو ان کا جذبۂ "خوف و احترام" مجبور کرتا تھا کہ وہ اس کی روح کو بدستور موجود مانیں۔ بعد میں "مذاہب اخلاقی" کی بنیاد پڑی تو ان میں بھی بقاء روح کا خیال بدستور قایم رکھا گیا کیونکہ عوام کے درستیٔ اخلاق کا بہت کچھ انحصار اعتقاد معاد پر ہے اور معاد کے لئے بقاء روح کا اعتقاد ضروری ہے ورنہ عذاب و ثواب کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا۔ پھر چونکہ عذاب و ثواب کے لئے عوام کو سمجھانے کیلئے بالکل ایک دنیادی بادشاہ یا حاکم کے فیصلہ و حکم کی طرح ایک عدالت گاہ کا بھی ثابت کرنا ضروری تھا اس لئے بعض مذاہب میں قیامت، یوم آخرۃ اور بعثت و حشر کا خیال پیدا کیا گیا۔ یعنی اس دن کا جب تمام کائنات فنا ہو جائے گی اور خدا کے سامنے محاسبۂ اعمال ہو کر سزا و جزا کی تعیین کی جائے گی اور بعض مذاہب نے "من مات فقد قامت قیامتہ" کے اصول پر یہ بتایا کہ مرنے کے بعد ہی ہر شخص کا فیصلہ ہو جائے گا اور قیامتِ کبریٰ کے عقیدہ سے گفتگو نہیں کی۔

پھر چونکہ عقیدۂ اول کے مطابق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قیامت سے قبل اور مرنے کے بعد جو زمانہ ایک انسانی روح پر بسر ہوتا ہے وہ کس طرح تمام ہوگا اور اس کو کیا کہیں گے اس لئے اس خدشہ کے جواب میں ایک نئی چیز یعنی عالم برزخ کا خیال پیش کیا گیا اور اس کی مختلف صورتیں مختلف مذاہب میں پیدا

ہوئیں چنانچہ ذیل میں ہم مختصراً تمام اہم مذاہب کے اعتقادات اس باب میں درج کئے دیتے ہیں :-

قدیم ایرانی عقیدہ پیروان زرتشت کا یہ عقیدہ ہے کہ جب کوئی شخص مرجاتا ہے تو اس کی روح کو ایک پل پر سے لے جاتے ہیں جو کہ کوہ البرز اور چکاتے وایتھر کے درمیان واقع ہے جب روح اس پل کو عبور کر جاتی ہے تو اس کے اعمال بد و نیک کا حساب مترا، رشنو اور سروش کے سامنے ہوتا ہے۔ اگر اس شخص کے اعمال نیک اس کے اعمال بد سے زیادہ ہیں تو اس کے لئے بہشت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اگر اس کے اعمال بد نیک سے زیادہ ہوتے ہیں تو اُسے دوزخ میں ڈال دیا جاتا ہے۔

لیکن اگر اس کے اعمال نیک و بد برابر ہوتے ہیں تو اس کو تو یدایتی (آخری فیصلہ کے دن تک جو جنگ ہورامزدہ اور اہرمن کے خاتمہ کے بعد ہوگا ٹھہرنا پڑے گا جس مقام میں ایسی ارواح آخری فیصلہ کے لئے ٹھہریں گی اسے "مسوانوگاتو" کہتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو وندیداد فرگرد ۱۹ گاتھا ۳۶ - نیز یشت باب گاتھا - نیز سیروزہ باب گاتھا ۳۰ - و باب گاتھا ۳۰)

گویا مسوانوگاتو "قدیم ایرانیوں کا برزخ ہوا۔ جہاں روح کا تزکیہ ہوتا ہے اس تزکیہ و تہذیب کے بارہ[۵] درجے ہیں اور روح مذکورہ ان مدارج سے گزر کر پوری

---

[۵] کشمیری ہندوؤں میں یوم وفات سے بارہ دن بعد مردہ کی بارھویں کرائی جاتی ہے اور اس روز جس کی جو حیثیت ہوتی ہے دان پن کر کے ایصال ثواب کرتا ہے۔ ممکن ہے زردشت کے بارہ درجوں سے ہندوؤں کے اس عقیدہ کا بھی کوئی تعلق ہو۔

طرح پاک وصاف ہو جاتی ہے اور اس قابل ہو جاتی ہے کہ اسے ہورا مزدہ کے سامنے پیش کیا جاسکے۔

قدیم مصری خیال

قدیم مصریوں میں تین نظریے تھے (۱) مردہ کی روح چڑیا بن کر فضا میں اڑ جاتی ہے[1]۔ (۲) مغرب کی طرف جاکر مردوں کی روحیں سیڑھی لگاکر آسمان پر چڑھ جاتی ہیں۔ (۳) مردوں کی روحیں زیر زمین یعنی پاتال میں چلی جاتی ہیں۔ رات کے وقت پاتال میں روحوں کو بارہ گھنٹہ تک خداوند رع (آفتاب) کے درشن ہوتے رہتے ہیں[2]۔

اس کے علاوہ ان کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ مرنے والے کے دل کو دربار اوسیرتر میں تین شخص ایک بہت بڑی اور نہایت صحیح ترازو میں توستے ہیں۔ اس وقت تین محاسب[3] ہوتے ہیں (۱) اوسیرنز (۲) انوبیس (۳) اور تھوتھ۔ ترازو[4] کے ایک پلہ میں دل اور دوسرے میں باٹ رکھے جاتے ہیں۔ پھر اگر مردہ کی نیکیاں زیادہ

---

[1] عہد جاہلیت میں عربوں کا بھی یہی خیال تھا کہ مقتول کی روح کا اگر قصاص نہیں لیا جاتا تو چڑیا بن کر فضا میں چیختی اور پھڑپھڑاتی پھرتی ہے جس کی آوازیں بوقت شب سنائی دیتی ہیں۔ [2] ممکن ہے یہ تعبیر ہو اس امر کی کہ جب نصف حصہ زمین پر بارہ گھنٹہ کے لئے تاریکی چھا جاتی ہے تو دوسرے نصف حصہ پر بارہ گھنٹہ تک آفتاب نظر آتا رہتا ہے۔

[3] میزان کا عقیدہ مسلمانوں میں بھی موجود ہے۔ [4] مجوسیوں کے یہاں بھی تین محاسب ہوتے تھے۔ (۱) مترا (۲) رشنو اور (۳) سروش۔ اسی طرح قدیم یونانیوں میں تین محاسب دیوتا ہوتے ہیں (۱) مینوس (۲) رہاد امینتھوس (۳) آیاکس۔

ہوتی ہیں تو اس کی روح کو ابدی مسرتیں حاصل ہوتی ہیں۔ اگر بدیاں زیادہ ہوتی ہیں تو فوراً مگرمچھ اس کی روح کو نگل جاتا ہے اور اس طرح وہ روح ہمیشہ کے لئے فنا ہو جاتی ہے اگر نیکیاں اور بدیاں برابر ہوتی ہیں تو وہ روح تا فیصلہ ادبیرزیہ ایک پرند بن جاتی ہے جسے "با" کہتے ہیں اور وہ چڑیا رات کے وقت قبرستانوں اور قبروں میں پھڑپھڑاتی ہے۔

قدیم یونانیوں کا عقیدہ قدیم یونانیوں کے عقیدہ میں تمام کائنات تین حصوں میں منقسم تھی۔ (۱) ملاءِ اعلیٰ (۲) دنیا (۳) اسفل السافلین۔ موخرالذکر وہ مقام ہے جہاں سب کی روحیں بعد از مرگ لے جائی جاتی ہیں۔ اس مقام کو یونانی زبان میں "ہاڈس یا ہیڈس" (HADES) کہتے ہیں۔ یہاں جب روح پہونچتی ہے تو اس کے اعمال کا حساب کتاب تین[۱] دیوتا کرتے ہیں (۱) مینوس (۲) رہادامنتھوس۔ (۳) آیاکس۔ اگر وہ شخص نیکوکار ثابت ہوتا ہے تو اس کی روح کو بہشت "الیزیم" (ELYSIUM) میں پہونچا دیتے ہیں اور بدکار ہوتا ہے تو اس کی روح "تارتارس" (TARTARUS) میں پہونچا دی جاتی ہے جہاں اس پر عذاب ہوتا ہے۔ اگر اس کے نیک بداعمال برابر ہوتے ہیں تو اس کی روح کو ہیڈس (HADES) میں تزکیۂ اخلاق کے لئے تا نیصلہ پیونو چھوڑ دیا جاتا ہے۔

---

[۱] اسی طرح تین دیوتا قدیم مصریوں میں اور تین فرشتے قدیم ایرانیوں میں روح کا حساب کتاب لیتے تھے۔ رومن کیتھولک عیسائی فرقہ کے عقیدہ میں صاحب میزان میکائیل فرشتہ ہے

قدیم ہندؤوں کا خیال ہندو سناتن دھرم مذہب کے مطابق جب کوئی شخص مرجاتا ہے تو جم راج موکل آکر اس کی روح کو پاتال میں لے جاتا ہے یہاں اس کے اعمال کا حساب کتاب ہوتا ہے تمام مردوں کی روحیں اسی مقام پاتال میں آخری فیصلہ تک رکھی جاتی ہیں۔ اگر مرنے والے کے نیک کرم زیادہ ہوئے تو اسے سورگ لوک یا بیکنٹھ میں بھیج دیا جاتا ہے اگر اعمال بد زیادہ ہوئے تو اس کا مقام "نرک" یعنی دوزخ ہوتا ہے۔ اگر اعمال نیک و بد برابر ہوتے ہیں تو وہ اس وقت تک "یونی چکر" میں رہتا ہے جب تک اسے خوش اعمالیوں کی بدولت "موکش" (نجات ابدی) یا بد اعمالیوں کے طفیل "نرک" حاصل نہ ہو جائے یا انسان کا بار بار جنم لینا بھی ایک معنی میں برزخ ہے۔

سناتن دھرمی ہندؤوں میں مردوں کو ایصال ثواب دان پن کیا جاتا ہے اور برہمن بھی کھلائے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ جو ارواح عالم برزخ میں ہیں ان کے عذاب میں تخفیف کی جائے۔ مردوں کے ایصال ثواب کے لئے "گیا" کی جاترا بھی کی جاتی ہے اور بارھویں بھی ہوتی ہے بعض اوقات جب کسی شخص پر سکرات موت شدید ہوتے ہیں تو تکلیف یا عذاب کم کرنے کے لئے اس شخص کو گائتری منتر پانی پر دم کر کے پلا دیتے ہیں۔

یہودیوں کا خیال یہودیوں اور قریب قریب تمام سامی النسل اقوام کا عقیدہ ایک ہی تھا بعض کا خیال تھا کہ مرنے کے بعد روحیں آسمان میں رہتی ہیں بعض یقین کرتے تھے کہ وہ اجرام سماوی میں رہتی ہیں اور بلحاظ اعمال جہاں کر

کسی روح کا مرتبہ ہوتا ہے ویسے ہی سیارے یا ستارے میں رہتی ہے۔ یہ خیال عموماً ان سامی النسل اقوام کا تھا جن پر بابل و اشوریا کے خیالات کا اثر پڑا تھا کیونکہ اہل بابل و اشوریا کا مذہب درحقیقت اجرام سماوی کی پرستش تھا اور ان کا سب سے بڑا معبود بعل شمس، مردوخ یا ملوخ (آفتاب) کہلاتا تھا بعض کا خیال یہ تھا کہ روحیں زیر زمین رہتی ہیں۔ یہ ان لوگوں کا عقیدہ تھا جو ایرانی اور مصری خیالات سے متاثر ہو چکے تھے، مگر زیادہ عام عقیدہ عبرانیوں کا یہ تھا کہ تمام ارواح وہ نیکوکار ہوں یا بدکار ایک مقام پر رکھی جاتی ہیں جسے وہ "شیول" کہتے تھے۔ اس مقام پر حساب کتاب ہوتا تھا۔ جو لوگ نیکوکار ہوتے تھے ان کو فردوس میں بھیج دیا جاتا تھا جہاں وہ دیدار باری تعالیٰ سے مشرف ہو کر ابدالآباد تک اسی کے حضور میں مسرت و شادمانی کی زندگی بسر کرتے تھے لیکن جو لوگ بدکار ہوتے تھے ان کی روحیں عذاب و عقاب کے لئے ہمیشہ (جہنم) میں ڈال دی جاتی تھیں جہاں ان پر روحانی اور جسمانی دونوں قسم کا عذاب ہوتا تھا مگر چونکہ ہر شخص پوری طرح نیک ہوتا ہے نہ کامل طور پر بد۔ اس لئے کم گنہگاروں کو ایک ایسے مقام میں رکھا جاتا تھا جو فردوس و جہنم دونوں کے درمیان تھا۔ یہ مقام "شیول" تھا جہاں گنہگاروں کو گناہوں کی نسبت سے عذاب دے کر پاک و صاف کیا جاتا تھا تاکہ وہ دیدار خداوندی کے قابل ہو سکیں

بابلی و آشوری خیال بابل و آشوریا دونوں میں مذہب انجم پرستی رائج تھا۔ ان کا سب سے بڑا معبود آفتاب تھا جسے آشوریا میں آشور[1] (ASSUR)

---

[1] ہندوؤں کا ایشورا اور آشوریوں کا آشور غالباً ایک ہیں۔

اور بابل میں لعل و مرد وخ کہتے تھے۔ ان لوگوں کا عام عقیدہ تھا کہ اپسو (APSU) کے قریب زمین کے گرد ایک سمندر ہے اور وہاں ایک تاریک غار عظیم ہے۔ تمام مردوں کی روحیں اسی غار میں لے جاکر رکھی جاتی ہیں جہاں وہ تاریکی اور گرد و غبار میں مصیبت اور عذاب کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ یہاں ان کو ان کے گناہوں کی نسبت سے عذاب دے کر پاک و صاف کیا جاتا ہے اور پھر جس روح کی طرف دیوتاؤں کی نگاہ مہربانی ہوتی ہے اور جس کے گناہ بھی صاف ہو جاتے ہیں اسے برزخ سے نکال کر ایک نہایت خوبصورت اور دل آویز جزیرہ میں بھیجدیا جاتا ہے جہاں وہ ہمیشہ کے لئے عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ ایسی منظور نظر ارواح عموماً بادشاہوں کی روحیں ہوا کرتی تھیں یہی باعث تھا کہ وہ لوگ اپنے نامور بادشاہوں کو درجہ الوہیت دیدیا کرتے تھے۔

رومن کیتھولک اور مشرقی کنائس کے اعتقاد میں دو حوں

مسیحیوں کا اعتقاد کو کچھ عرصہ کے لئے عالم برزخ میں رکھ کر اس لئے پاک و صاف کیا جاتا ہے کہ وہ دربار ایزدی میں حاضر ہونے کے قابل ہو جائیں۔ ان کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ روحوں کو ایصال ثواب سے فائدہ پہونچتا ہے۔ وہ مقام جہاں ان گناہگاروں کو عذاب دیا جائے گا۔ بقول بزرگان دین عیسوی زمین کے مرکز میں ہے اسے انگریزی زبان میں "ہیل" (HELL) کہتے ہیں جو ترجمہ ہے عبرانی لفظ "شیول" (SHEOL) یونانی لفظ "ہیڈس" (HADES) اور عبرانی لفظ "جہنم" کا ایک جگہ لفظ "تارتارس" (TARTARUS) کا ترجمہ بھی (HELL)

کیا گیا ہے مگر بائبل کے اردو ترجمہ میں ان جملہ الفاظ کا صرف ایک ترجمہ یعنی جہنم[۵۱] ہے۔

---

۵۱ عبرانی لفظ "شیول" عہد نامہ عتیق میں ۶۵ مرتبہ آیا ہے جس کا یونانی زبان میں ترجمہ ہیڈس (HADES) کیا گیا ہے مگر انگریزی زبان میں ۳۱ مرتبہ اس کا ترجمہ "جہنم" ۳۱ مرتبہ "قبر" اور تین مرتبہ "غار" یا گڑھا کیا گیا ہے۔ حالانکہ اس لفظ کے اصل معنی "پاتال" یا تاریک اور عمیق غار کے ہیں۔ عبرانیوں کے نزدیک "شیول" کا مفہوم دراصل انسان کی گزشتہ زندگی کی ایک خالی موہوم تھا جس میں یہ کہ مردوں کے تمام تعلقات زندہ دنیا سے منقطع ہو جاتے تھے۔ اس طرح گویا شیول میں مردوں کی حالت ایک وجود ظلی سے تعبیر کی جاتی تھی۔ اسیری بابل کے زمانہ میں جب یہودیوں کے خیالات و معتقدات پر ایرانیوں کے عقیدۂ معاد کا اثر پڑا تو ان میں بھی حشر و نشر کا عقیدہ داخل ہو گیا۔ مگر اس وقت یہودیت تین مختلف فرقے تھے۔ (۱) فریسی (۲) صدوقی (۳) اسینی یعنی یونانی۔ ان میں فریسی فرقہ عام طور پر عجمی خیالات و معتقدات سے متاثر ہو کر حشر و نشر کا قائل ہو گیا۔ مگر صدوقیوں کا عقیدہ اپنے اسی پرانے مفہوم "شیول" پر قائم رہا۔ فرقہ سوم یعنی اسینی (ESSENS) یونانیوں کے اس عقیدہ پر قائم ہو گئے کہ روح لافانی ہے نیز آنکہ متقی و پرہیزگار لوگوں کی روحیں بعد مرگ نہایت اچھی حالت میں رہتی ہیں۔

اسی کے ساتھ "شیول" کے مفہوم میں حسب ذیل دو باتیں بھی داخل ہو گئیں۔

(۱) نیک بندوں کے لئے آغوش ابراہیم یعنی بہشت ہے اور (۲) خدا ناشناسوں کے لئے جہنم۔ عہد نامۂ عتیق کی پہلی سات کتابوں میں جو لفظ "شیول" گیارہ مرتبہ آیا ہے اس کا ترجمہ یونانی زبان میں "ہیڈس" (HADES) کیا گیا ہے۔ یہی لفظ عہد نامۂ جدید میں گیارہ مرتبہ آیا ہے مگر وہاں اس کا ترجمہ "دوزخ یا جہنم" کیا گیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ عہد نامۂ عتیق میں (بقیہ نوٹ صفحہ ۲۹۳ پر)

بیان بالا سے یہ امر واضح ہو گیا ہو گا کہ تقریباً تمام مذاہب قدیمہ میں کسی ایسی جگہ کا ہونا تسلیم کیا جاتا تھا جہاں مرنے کے بعد روحوں کو عذاب و ثواب نتیجۂ اعمال کے لئے انتظار کرنا پڑتا تھا اور یہ انتظار بھی اعمال کے لحاظ سے کسی نہ کسی طرح عذاب و ثواب سے متعلق ہوتا تھا۔

قرآن پاک و برزخ کلام پاک میں لفظ برزخ تین جگہ آیا ہے۔ سورۂ مومنون میں ارشاد ہوتا ہے۔

حتی اذا جاء احدہم الموت قال	یہاں تک کہ ان میں سے ایک کو موت آئی اور اس نے
رب ارجعون لعلی اعمل صالحا	کہا کہ اے خدا مجھے واپس کر دے تاکہ میں نیک اعمال
فیما ترکت کلا انہا کلمة ہو قائلہا ومن	کروں جو نہیں کئے تھے لیکن یہ صرف اس کا کہنا ہے
ورائہم برزخ الی یوم یبعثون ۔	ان لوگوں کے سامنے تو ایک حجاب ہے حشر کے دن تک۔

بقیہ نوٹ صفحہ ۲۹۲) "جہنم" (JHENNA) سے وادی (HINNOM) مراد ہے جو شہر یروشلم کے متصل واقع تھی اور چونکہ یہاں فتح یہود سے قبل مولوخ (MALOCH) کی پرستش کی جایا کرتی تھی اور آحاز (AHAZ) اور منسّی (MANASSEH) کے عہدوں پر انسانی قربانیاں کی جایا کرتی تھیں اس لئے اس وادی کو یہودیوں نے ناپاک قرار دیا اور بعد ازاں وہ مقام شہر بھر کا مزبلہ بن گیا تھا جہاں شہر بھر کا کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا تھا بعد ازاں اس گھورے میں آگ لگا دی جاتی تھی جو آہستہ آہستہ ہمیشہ جلتی رہتی تھی کچھ عرصہ بعد اس مقام کو مقام عذاب کی تصویر سمجھنے لگے "جہاں" ان کے ضمیر کے لعن طعن کی دلخراش تکلیف رفع ہوتی ہے
یہی وادی جحیم یعنی وادی ہنم یہودی ربیوں کے نزدیک قعر دوزخ بن گئی تھی۔

سورۂ الفرقان میں ارشاد ہوتا ہے:-

وہو الذی مرج البحرین ہذا عذب فرات وہذا ملح اجاج وجعل بینہما برزخا وحجرا محجورا	خدا وہ ہے جس نے دو سمندر جاری کئے ایک شیریں پانی کا دوسرا شور پانی کا اور ان دونوں کے درمیان حجاب حائل کر دیا۔

سورۂ رحمٰن میں ہے:-

مرج البحرین یلتقیان بینہما برزخ لا یبغیان۔	اس نے دو سمندر جاری کئے جو ایک دوسرے سے متصل ہیں لیکن ان کے درمیان حجاب ہے اور وہ باہم دگر مل نہیں سکتے۔

موخرالذکر دو آیتوں میں لفظ برزخ واضح طور پر لغوی حیثیت سے حجاب و پردہ یا آڑ کے مفہوم میں آیا ہے کیونکہ دو سمندروں سے مراد یہاں بحر روم اور بحر احمر ہیں جن میں اول الذکر شیریں اور موخر الذکر شور ہے یہاں موت یا بعد الموت کے بیان سے کوئی تعلق نہیں۔

رہ گئی سورۂ مومنون کی آیت سو اس میں بھی ایک بات قابل غور ہے کہ لفظ برزخ سے قبل لفظ ورائہم آیا ہے جس میں ضمیر جمع کی ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا نے جو جواب دیا ہے اس کا مخاطب وہی تنہا شخص نہیں ہے جس نے پھر دوبارہ دنیا میں بھیجے جانے کی آرزو کی تھی بلکہ تمام وہ لوگ مراد ہیں جو رسول یا اسلام کے دشمن تھے خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ اس لئے یہاں بھی لفظ برزخ خصوصیت کے ساتھ کسی ایسے عالم یا مقام کے لئے استعمال نہیں ہوا جس کا تعلق

عالم بعد الموت سے ہے بلکہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ محض بے بصری اور کورِ باطنی کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔

لفظ برزخ کے لغوی معنی حجاب، پردہ یا روک کے ہیں اور اس معنی سے علیحدہ کوئی اصطلاحی معنی کلام مجید میں نظر نہیں آتے اس لئے اگر مسلمانوں میں روح کے لئے کوئی عالم برزخ، دیگر مذاہب قدیمہ کے اعتقاد کے مطابق تسلیم کیا جاتا ہے تو اس کی ذمہ داری کلام پاک پر نہیں ہے اور نہ اس کے صحیح ماننے پر کوئی مسلمان مجبور رہ سکتا ہے۔

یاجوج و ماجوج

(جناب محمد زکریا صاحب بہاما)

براہ کرم یاجوج ماجوج۔ ذوالقرنین اور سدِ اسکندر کے متعلق
متعلق اپنی تحقیق سے آگاہ کیجیئے۔

قرآن شریف کی جن آیات میں یاجوج ماجوج کا ذکر آیا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

سورۃ کہف آیۃ ۹۴)

قالوا یا ذا القرنین ان یاجوج و ماجوج مفسدون فی الارض فھل نجعل لک خرجاً علی ان تجعل بیننا و بینھم سداً"

یعنی ان لوگوں نے کہا اے ذوالقرنین یقیناً یاجوج و ماجوج زمین پر فساد برپا کرتے ہیں تو کیا ہم تم کو خراج ادا کریں اس شرط پر کہ تم ہمارے اور ان کے درمیان ایک سد تعمیر کر دو۔

دوسری آیت سورۂ انبیاء کی آیت نمبر ۹۶ ہے

حتّٰی اذا فتحت یاجوج وماجوج وہم — یعنی حتیٰ کہ یاجوج وماجوج کو چھوڑ دیا جائے اور
من کل حدب ینسلون — وہ تمام بلند مقامات پر سے پھیل جائیں۔

آیات مندرجہ بالا میں صرف یاجوج وماجوج ہی کا ذکر نہیں آیا بلکہ دو باتیں اور بھی آئی ہیں یعنی "ذوالقرنین" اور "سد" لہٰذا ہم اس مضمون میں ان تینوں کے متعلق اپنی تحقیق پیش کرتے ہیں۔

(۱) یاجوج وماجوج جن کتابوں کو عام طور پر بادی یا الہامی سمجھا جاتا ہے ان میں سب سے پہلے جس کتاب میں یاجوج وماجوج کے الفاظ آئے ہیں وہ عہدنامۂ عتیق ہے چنانچہ ہم سب سے پہلے اسی کو یہاں درج کرتے ہیں۔

(۱) یافث (بن نوح) کے بیٹے یہ ہیں:- جمر۔ ماجوج۔ مادی۔ یونان۔ توبل۔ مسک اور تیراس (کتاب پیدائش باب ۱۰۔ آیت ۲)

(۲) بنی یافث۔ جمر۔ ماجوج۔ مادی، یونان، توبل، مسک اور تیراس ہیں۔ (تاریخ کی پہلی کتاب باب ۱۔ آیت ۵)

(۳) اے آدم زاد تو جوج کے مقابل جو ماجوج کی سرزمین کا ہے اور روش اور مسک اور توبال کا بڑا سردار ہے اپنا منہ کر (حزقی ایل باب ۳۸۔ آیت ۲)

(۴) اس لئے تو اے آدم زاد جوج کے برخلاف پیشین گوئی کر اور بول کہ خداوند یہوواہ یوں کہتا ہے کہ دیکھ میں تیرا مخالف ہوں اے جوج، روش، مسک اور

توبال کے سردار۔ اور میں تجھے پلٹ دوں گا اور تجھے لئے پھروں گا اور ایسا کروں گا کہ تو اُتر کے اطراف سے چڑھ آئے اور تجھے اسرائیل کے پہاڑوں پر لاؤں گا اور تیری کمان جو تیرے ہاتھ میں ہے گرا دوں گا اور ایسا کروں گا کہ تیر تیرے ہاتھ سے گر پڑیں گے۔ تو اسرائیل کے پہاڑوں پر گر جائے گا تو اور تیرا سارا لشکر اس گروہ سمیت جو تیرے ساتھ ہے اور میں تجھے ہر قسم کے شکاری پرندوں اور میدان کے درندوں کو خوراک کے لئے دوں گا۔

اور میں ماجوج پر جو جزیروں میں بے پروائی سے سکونت کرتے ہیں ایک آگ بھیجوں گا (حزقی ایل باب ۳۲، آیات ۱-۶) بائبل کی مندرجہ بالا آیات پر غور کر کے ہم مندرجہ ذیل نتائج تک پہنچتے ہیں۔

(۱) اور (۲) میں ماجوج کو یافث کا بیٹا اور نوح کا پوتا بیان کیا گیا ہے گویا ماجوج ایک شخص کا نام ہے اور ممکن ہے کہ اس کے بعد اس شخص کے قبیلہ یا قوم کا یہی نام ہو گیا ہو اور اسی لحاظ سے اس ملک کا نام بھی ماجوج ہو گیا ہو جہاں یہ قوم رہتی تھی۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ ایک شخص کی اولاد ایک ہی ملک میں آباد ہوتی ہے مگر بعض اوقات جب تعداد آبادی بڑھ جاتی ہے تو ایک ہی نسل کے مختلف قبائل ممالک متصلہ میں جا کر آباد ہو جاتے ہیں۔ یافث بن نوح کے لڑکوں کی ترتیب پر اگر خیال کیا جائے تو سب سے بڑا بیٹا جمر، دوسرا ماجوج، اور تیسرا مادی تھا۔ مادی قوم اس ملک میں آباد تھی جسے قدیم زمانے میں مادہ یا میڈیا (MEDIA) کہتے تھے۔ میڈیا کے مغرب میں آرمینیا اور اس کے مغرب میں قبادوسیہ کے ملک تھے۔

آرمینیا اور قپادوسیہ میں جو قوم آباد تھی وہ قوم جمرز (YIMMERIA) کہلاتی تھی۔ ماہرین السنہ جانتے ہیں کہ جمر و جمر میں کوئی فرق نہیں لہذا جمر کی اولاد آرمینیا اور قپادوسیہ میں آباد ہوئی۔ دوسرے بھائی ماجوج کی اولاد نے کوہستان قفقاز کو عبور کر کے جانب شمال نقل و حرکت کی اور وہ بلاد روس و سائبریا میں آباد ہو گئے آیت نمبر ۲ میں یاجوج کو ماجوج کی سرزمین کا سردار بتایا گیا ہے اور یہی شخص روش، مسک اور توبال کا بھی سردار ہے اور چونکہ روس مسک (ماسکو) اور توبال (سائبریا جس کا دار الحکومت توبولسک ہے) تمام ایسی اقوام ہیں جو کوہ قفقاز سے جانب شمال رہتی تھیں اسی لئے آیہ (۱۴) میں ظاہر کیا گیا ہے کہ قوم یاجوج نے بنی اسرائیل پر شمال کی طرف سے حملہ کیا۔ کتاب پیدائش باب ۱۰ میں مختلف اقوام عالم کی جو فہرست دی گئی ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو جغرافیائی حدود اس باب میں بیان کئے گئے ہیں ان کی رو سے شمال مشرق اور شمال میں جو مختلف نیم وحشی اور بربری (BARBARIANS) اقوام آباد تھیں ان سب کے لئے لفظ ماجوج استعمال کیا گیا ہے۔ صحیفہ حزقی ایل باب ۳۸ آیت ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ ماجوج ایک ملک کا نام ہے مگر اسی صحیفہ کے باب ۳۹ آیت ۶ میں تحریر ہے کہ ماجوج ایک شمالی قوم ہے جس کا سردار جوج یا ماجوج ہے۔ بہرحال ان الفاظ سے کہ "جوج اقوام روش، مسک اور توبال کا بڑا سردار ہے" یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ لفظ ماجوج قفقاز کے شمال میں رہنے والی تمام وحشی اقوام کے لئے استعمال ہوتا تھا اور اس زمانہ میں (یعنی تقریباً ۶۰۰ قبل مسیح) جبکہ صحیفہ حزقی ایل لکھا گیا [illegible]

میں۔ کہ یوشع بن نون کے زمانہ میں بقول ہیرودوطوس، ساتھین اقوام نے (جو قفقاز کے شمال میں ممالک روس میں رہتی تھیں) ایشیا پر حملہ کرکے تباہ کردیا تھا۔ ممکن ہے ان حملہ آور اقوام کا (جن کے لئے مجموعی لفظ "ماجوج" استعمال کیا گیا ہے) سردار یاجوج ہو۔ مشہور یہودی مورخ یوسفس (YOSEPHICS) نے جس کا اتباع جیروم (JEROME) نے بھی کیا ہے یہ لکھا ہے کہ بائبل میں لفظ ماجوج قوم ساتھین کے لئے استعمال ہوا ہے اور عام مورخین اور مفسرین بائبل کا بھی یہی خیال ہے۔ در حقیقت لفظ "ماجوج" بہت وسیع المعنی ہے اور اس کے اندر وہ تمام بے شمار اور مجہول الحال اقوام داخل سمجھی جاتی ہیں جو کوہستان قفقاز کے شمال میں رہتی تھیں۔ اسی سلسلہ میں یہ عرض کردینا بے محل نہ ہوگا کہ بائبل میں توبال اور مسک ہمیشہ دونوں ساتھ آتے ہیں، اس زمانہ میں بھی اگر آپ ان ممالک کی سیر کریں جو قفقاز کے شمال میں واقع ہیں تو آپ کو مسکو اور توبال نام کے دو دریا ملیں گے۔ ایک دریا وہ ہے جس کے کنارے موجودہ بالشویک روس کا دارالحکومت ماسکو یا مسکو واقع ہے اور دوسرا دریا وہ ہے جو کوہستان یورال کے مشرق میں واقع ہے اور جس پر سائبریا کا بڑا شہر ٹوبولسک آباد ہے ان دونوں دریاؤں کے کنارے یقیناً مسک اور توبال کی اولاد آباد ہوئی یہی لوگ بعد میں ساتھین اور ساکے کہلائے اور انھیں جملہ قبائل کا مجموعی نام یاجوج ماجوج ہے اور ان کا ملک بحیرۂ اسود کے شمال اور شمال مشرق میں واقع تھا۔

بیروت کے ایک فاضل محمد جلیل بیہم لکھتے ہیں کہ انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے کہ یاجوج و ماجوج نام ہیں دو اجنبی (BARBARIAN) قبائل کے۔ قاضی بیضاوی نے لکھا ہے

یاجوج وماجوج دو قبیلے تھے یافث بن نوح کی اولاد سے۔ ضحاک کا قول ہے کہ یاجوج نام تھا ایک ترکی قبیلہ کا اور بقول یہودی انسائیکلو پیڈیا "جیروم نے لکھا ہے کہ ملک یاجوج کوہستان قفقاز کے پار بحر خضر کے قریب واقع ہے"۔

سرسید مرحوم کی تحقیق یہ ہے کہ یافث بن نوح کا ایک بیٹا ماغوغ تھا اور یہ عجمی زبان کا لفظ ہے۔ عبرانی زبان میں آکر یہ لفظ ماگوگ بن گیا یعنی "غ" بدل کر "گ" ہو گیا اور جو قوم اس "ماگوگ" سے نکلی اس کا نام "گوگ" ہوا اور پھر اس ملک پر بھی جہاں وہ آباد تھی لفظ "گوگ" استعمال ہونے لگا۔ مگر استعمال میں یہ دونوں لفظ ساتھ ساتھ بولے جاتے تھے جیسے "گوگ ماگوگ" یا "گاگ میگاگ" اور ایک دوسرے پر بھی اطلاق ہوتا تھا۔ عربی زبان میں چونکہ "گ" نہیں ہے اس لئے وہاں آکر یہ یاجوج وماجوج بن گئے۔ دراصل یہ لوگ ترک وتاتار ہیں چنانچہ تفسیر کبیر میں بھی یہی لکھا ہے کہ "وقیل انهما من الترک" الغرض یہ اقوام اس ملک میں آباد تھیں جس کو قدیم زمانہ میں سیتھیا (SEYTHIA) کہتے تھے اور ترک وتاتار انہی کی نسل سے ہیں جملہ اندراجات مندرجہ بالا پر نظر ڈالنے سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ لغوی لحاظ سے یاجوج وماجوج "آشوری نام ہیں جنھوں نے عبرانی زبان میں بصورت "گوگ ماگوگ" یا "گاگ میگاگ" راہ پائی اور وہاں سے عربی زبان میں آکر یاجوج وماجوج بن گئے۔ ہمارے نزدیک یہ قوم یا اقوام خواہ وہ یافث بن نوح کی اولاد ہوں یا نہ ہوں وہ وحشی اور بربری قومیں تھیں جو ماوراے کوہستان قفقاز جانب شمال و شمال مشرقی سواحل بحر خزر کے قریب آباد تھیں انھی مختلف اقوام کا مجموعی نام بعد

کو سیتھین (SEYTHIANS) ہوا جب یہ اقوام زیادہ زور پکڑ گئیں تو اپنے ایک بڑے سردار کی "جوج" کی زیر قیادت کوہستانِ قفقاز کے جنوب میں بلاد ایشیا پر حملہ آور ہوئیں اور چاروں طرف تاخت و تاراج کرنے لگیں۔ جب ایشیا کی امن پسند اقوام کا ان لوگوں کی دستبرد سے ناک میں دم آگیا تو انھوں نے "ذوالقرنین" بادشاہ سے ان کو روکنے اور تادیب کرنے کی درخواست کی جس نے ان کو مار کر بھگا دیا اور ان کی آئندہ روک تھام کے لئے ایک "سد" تعمیر کر دی۔ "ذوالقرنین" کی بحث آگے آتی ہے۔

ذوالقرنین

قبل ازیں کہ ہم "ذوالقرنین" کی تحقیق کریں ہم کو یہ دیکھ لینا چاہئے کہ اس کے متعلق کتب سماوی میں کیا لکھا ہے۔ قرآن شریف کی سورہ کہف میں آیات ۸۳ تا ۹۰ ذوالقرنین کی نسبت حسب ذیل بیان کیا گیا ہے۔

ویسئلونک عن ذی القرنین ط قل سأتلوا علیکم منه ذکرا ۞ انا مکنا له فی الارض
وآتیناه من کل شیء سببا ۞ فاتبع سببا حتی اذا بلغ مغرب الشمس وجدها
تغرب فی عین حمئة ووجد عندها قوما ط قلنا یا ذا القرنین اما ان تعذب
واما ان تتخذ فیهم حسنا ۞ قال اما من ظلم فسوف نعذبه ثم یرد الی ربه فیعذبه
عذابا نکرا ۞ واما من آمن وعمل صالحا فله جزاء ن الحسنی ج وسنقول له من
امرنا یسرا ۞ ثم اتبع سببا ۞ حتی اذا بلغ مطلع الشمس وجدها تطلع علی قوم لم
نجعل لهم من دونها سترا ۞ کذلک ط وقد احطنا بما لدیه خبرا ۞ ثم اتبع سببا
حتی اذا بلغ بین السدین وجد من دونهما قوما لا یکادون یفقهون قولا ۞

قالوا یٰذاالقرنین ان یاجوج وماجوج مفسدون فی الارض فہل نجعل لک خرجا علیٰ ان تجعل بیننا وبینہم
سدا۔ قال ما مکنی فیہ ربی خیر فاعینونی بقوۃ اجعل بینکم وبینہم ردما۔ اٰتونی
زبر الحدید حتیٰ اذا ساوی بین الصدفین قال انفخوا حتیٰ اذا جعلہ نارا قال
اٰتونی افرغ علیہ قطرا۔ فما اسطاعوا ان یظہروہ وما استطاعوا لہ نقبا۔ قال ہٰذا
رحمۃ من ربی فاذا جاء وعد ربی جعلہ دکاء وکان وعد ربی حقا۔"

یعنی پوچھتے ہیں تجھ سے ذوالقرنین کی بابت تو کہہ دے میں تمکو اس کا کچھ حال جلد
پڑھ کر سناؤں گا بیشک ہم نے قائم کیا تھا اس کو زمین پر اور دیا تھا اس کو ہر قسم کا سامان
پس وہ ایک راستہ کو (یا ایک سمت کو) روانہ ہوا حتیٰ کہ وہ ایک ایسے مقام پر پہونچا
جہاں آفتاب ایک کالے یا گدلے چشمہ (یا سمندر) میں غروب ہوتا تھا اور وہاں اس
نے اس کے قریب ایک قوم کو پایا۔ ہم نے کہا اے ذوالقرنین خواہ تو ان لوگوں کو سزا
دے یا ان کے ساتھ بھلائی کر۔ اس (ذوالقرنین) نے کہا جو شخص ظالم ہے اس کو سزا
دینگے پھر وہ خدا کی طرف واپس جائے گا۔ اور وہ (خدا) اسے عبرتناک سزا دیگا
لیکن جو ایمان لایا اور نیک کام کئے تو اس کے لئے ہے اچھا بدلہ۔ اور ہم اس کو
سہل العمل حکم دیں گے۔ پھر وہ ایک (دوسرے) راستہ پر (یا سمت کو) کو چلا
یہاں تک کہ جب وہ پہونچا اس مقام کے قریب جہاں آفتاب طلوع ہوتا ہے تو اس نے
انکو ایک ایسی قوم پر طلوع ہوتے دیکھا جسے ہم نے آفتاب سے پناہ نہیں دی تھی
یہ تھا حال وہاں کا اور جو کچھ اس ذوالقرنین کے پاس تھا اس کا ہم کو کامل علم تھا
پھر اس نے ایک (تیسرا) راستہ اختیار کیا حتیٰ کہ وہ پہونچا ایسے مقام پر جو دو پہاڑوں

کے درمیان واقع تھا اور اس نے اس مقام کے اس طرف ایک قوم دیکھی جو کسی زبان کا ایک لفظ نہ سمجھتی تھی۔ انھوں نے (یعنی درہ کے اس طرف کے قبائل نے) کہا کہ اے ذوالقرنین یاجوج و ماجوج زمین پر فساد کرنے والے ہیں۔ تو کیا ہم تمہارے لئے کوئی خراج مقرر کر دیں تاکہ تو ان کے اور ہمارے درمیان ایک سد بنا دے؟ اس (ذوالقرنین) نے کہا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے مجھے دے رکھا ہے وہی بہتر ہے بس تم میری مدد قوت (مزدوروں) سے کرو تاکہ میں تمہارے اور ان کے درمیان ایک مضبوط (قلعہ بند) دیوار تعمیر کر دوں۔ لاؤ تم میرے پاس لوہے کے ٹکڑے حتیٰ کہ جب اس نے دونوں پہاڑوں کے درمیان (کا خلا) بھر دیا تو اس نے کہا کہ دہکاؤ آگ اور گرم کر دو۔ دھونکو حتیٰ کہ جب اس کو کر دیا آگ کے (مانند سرخ) تو ذوالقرنین نے کہا کہ میرے پاس لاؤ پگھلی ہوئی دھات (پیتل یا رانگ) تاکہ میں اس پر ڈال دوں تاکہ پھر وہ (یاجوج ماجوج) اس پر سے چڑھ کر آ سکیں نہ اس میں سوراخ کر سکیں۔ ذوالقرنین نے کہا کہ میرے پروردگار کی طرف سے رحمت ہے لیکن جب میرے پروردگار کا وعدہ پورا ہونے کا وقت آئے گا اسے زمین کے برابر کر دے گا۔ اور میرے پروردگار کا وعدہ سچا ہے۔

ناظرین کرام ملاحظہ فرمائیں گے کہ آیات مندرجہ بالا میں جس [illegible] کا لقب ذوالقرنین لکھا ہے اس کے اصلی نام کا کوئی پتہ نشان نہیں بتایا گیا۔ صرف چند واقعات اس کے متعلق بیان کئے ہیں جن کی بنا پر مفسرین و محققین نے خیال آرائیوں سے کام لیا ہے۔ لفظ "ذوالقرنین" کے لغوی معنی ہیں "دو سینگوں والا" یا

"دو صدیوں والا"۔ مسلمان مورخین نے ذوالقرنین کا لقب مندرجہ ذیل بادشاہوں کو دیا ہے

(۱) المنذر الاکبر بن السماء جو نعمان بن المنذر کا دادا تھا۔ اس بادشاہ کو ذوالقرنین کا لقب اس وجہ سے دیا گیا تھا کہ اس کی پیشانی پر دو بڑی بڑی زلفیں لٹکتی رہتی تھیں۔ ابن درید کا قول ہے کہ امراء القیس کے مندرجہ ذیل شعر میں جس "ذوالقرنین" کا ذکر ہے وہ یہی بادشاہ تھا۔

اصد نشاص ذی القرنین حتی   تولی عریض الملک الہمام

(۲) جنوبی عرب کا بادشاہ تبع الاقران یا ذی القرنین۔

ابو ریحان بیرونی نے اپنی کتاب "آثار الباقیہ عن قرون الخالیہ" میں حمیری خاندان کے بادشاہوں میں سے ابوکرب شمس کو ذوالقرنین قرار دیا ہے کہ اس کا ملک مشرق سے مغرب تک پہونچا تھا۔ ابو ریحان کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ "ذو" کا لفظ حمیری خاندان کے بادشاہوں کے نام کے ساتھ مستعمل ہوتا ہے جیسے "ذونواس" وغیرہ۔

(۳) کبھی کبھی حضرت علی ابن ابی طالب کو بھی ذوالقرنین لکھتے ہیں (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام صفحہ ۹۶۲)

(۴) سرسید نے فغفور چین چی وانگ تی کو ذوالقرنین مانا ہے اور اس لقب کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اپنے عہد کے حصۂ اول میں اس نے ساز و سامان اور اسباب قوت و سطوت جمع کیا اور دوسرے حصہ میں اس نے ملک گیری کی اس وجہ سے وہ ذوالقرنین ہوا لیکن یہ تاویل کسی طرح درست نہیں ہو سکتی کیونکہ اس بادشاہ کا

انتقال سنہ ۲۱۰ ق م میں بتایا ہے اور اس کی سلطنت کا زمانہ صرف ۳۷ سال قرار دیا ہے جو کسی طرح دو صدیوں کے اندر نہیں پڑتا۔ سینگ تو اس کے تھے ہی نہیں۔ الغرض ہمارے نزدیک اس بادشاہ کو "ذوالقرنین" ماننے کی کوئی وجہ نہیں۔ علاوہ ازیں سر سید خود لکھتے ہیں کہ چین ایک ملک تھا کہ اگلے زمانہ میں بہت کم اس کی تاریخ معلوم ہوتی تھی اور ظاہرا یہی سبب ہوا ہے کہ مورخوں اور مفسروں کو سد کا مقام بتانے اور اس کے بننے کے حالات بیان کرنے میں دھوکا ہوا ہے۔ خود سر سید کے قول سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ جب ذوالقرنین کی نسبت کفار نے محمد صلعم سے دریافت کیا تھا اس کا حال کچھ نہ کچھ ان کو ضرور معلوم تھا اس لئے وہ ذوالقرنین عرب کے قریب ہی کسی ملک کا رہنے والا ہوگا۔ ایران کا ہو یا یونان کا مگر چین ایسے دور دراز ملک کا ہرگز نہیں ہو سکتا

(۵) مسلمان مورخین و مفسرین میں سب سے زیادہ رجحان اسکندر اعظم بن فیلقوس کی طرف ہوا ہے اور وہ زیادہ تر اسی بادشاہ کو ذوالقرنین مانتے ہیں اور وہ اس کی تاویل اس طرح کرتے ہیں (۱) اسکندر کی پیشانی پر ایک حصہ سینگوں کی طرح ابھرا ہوا تھا (۲) اور اس کی پیشانی سے دو خوبصورت زلفیں لٹکتی تھیں (۳) وہ ماں اور باپ دونوں کی طرف سے نجیب الطرفین تھا۔ (۴) دو پشتیں اس کے زمانہ میں گزر گئیں۔ (۵) خدا نے اس کو اندرونی اور بیرونی دنیا کے حالات سے واقف کر دیا تھا (۶) وہ طبقات نور و ظلمت دونوں میں پہونچ گیا تھا

چونکہ قرآن شریف کی آیات میں "مطلع الشمس" اور "مغرب الشمس" کے الفاظ آئے ہیں اس لئے مسلمان مورخین و مفسرین نے سمجھا کہ ذوالقرنین اسی کو ہونا چاہئے

جس کی سلطنت مشرق سے مغرب تک رہی ہو۔ مسلمان علماء نے سکندر اعظم کے ذوالقرنین ہونے کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی ہے کہ سکندر نے ایک خواب میں دیکھا کہ وہ آسمان پر چڑھ گیا ہے اور آفتاب کے دونوں کنارے یا دونوں سینگ پکڑ کر لٹک گیا اس لئے وہ ذوالقرنین کہلایا یہ روایت بھی غور طلب ہے جو چھٹی صدی عیسوی میں ملک شام کے اندر پیدا ہوئی تھی کہ سکندر اعظم نے خدا سے کہا کہ "میں جانتا ہوں کہ تو نے میرے سر پر سینگ اگا دئے ہیں تاکہ میں ان کے ذریعہ سے دنیا کی تمام سلطنتوں کو کچل ڈالوں (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام) مگر سکندر اعظم کو ذوالقرنین تسلیم کرنے میں بہت تامل ہے کیونکہ اولاً تو اس نے کوئی سد نہیں بنایا دوسرے یہ کہ اسکندر مذہباً بت پرست تھا اور از روئے قرآن، ذوالقرنین کو ہدایت یافتہ ہونا چاہئے۔ تیسرے یہ کہ اگر یاجوج ماجوج سے اسکندر کا کہیں مقابلہ ہوا ہوگا تو باختر میں مگر وہاں کوئی سد موجود نہیں ہے۔

پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ذوالقرنین سے مراد سکندر نہیں ہے تو کون ہے اس کے لئے ہمیں سب سے پہلے بائبل کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

کتاب دانیال باب ۸ میں مرقوم ہے کہ: تب میں نے اپنی آنکھیں اٹھا کر نظر کی کیا دیکھتا ہوں کہ ندی کے آگے ایک مینڈھا کھڑا ہے جس کے دو سینگ ہیں ایک سینگ دوسرے سے بڑا تھا اور بڑا دوسرے کے پیچھے تھا۔ میں نے اس مینڈھے کو دیکھا کہ پچھم اور اتر اور دکھن کی طرف سینگ مارتا تھا یہاں تک کہ کوئی جانور اس کے سامنے کھڑا نہ ہو سکا۔ وہ جو چاہتا تھا کرتا تھا۔ میں اسی سوچ میں

تھا کہ ایک بکرا پچھم کی طرف سے آیا اور اس بکرے کی دونوں آنکھوں کی بیچوں بیچ ایک عجیب طرح کا سینگ تھا وہ اس نے دو سینگوں والے مینڈھے کو مارا اور اس کے دونوں سینگ توڑ ڈالے مینڈھے کو تاب نہ تھی کہ اس کا سامنا کرے سو اس نے اس کو زمین پر پٹک دیا اور وہ بکرا نہایت بڑا ہوا اور جب وہ پرزور ہوا تو اس کا بڑا سینگ ٹوٹ گیا اور اس کی جگہ چار سینگ آسمان کی چاروں ہواؤں کی طرف نکلے ...... جب مجھ دانیال نے یہ خواب دیکھا اور اس کی تعبیر تلاش کرنے لگا تو میں نے ایک آدمی کی آواز سنی جس نے پکار کر کہا کہ اے جبرئیل اس شخص کو اس خواب کے معنی سمجھا۔ چنانچہ وہ میرے نزدیک آیا اور اس نے کہا کہ اے آدم زاد وہ دو سینگ والے مینڈھے سے مراد میڈیا اور فارس کے بادشاہ ہیں اور وہ بکرا یونان کا بادشاہ ہے وہ بڑا سینگ جو اس کی آنکھوں کے درمیان ہے اس کا پہلا بادشاہ ہے اور اس کے ٹوٹ جانے کے بعد جو چار سینگ اور نکلے ان سے مطلب وہ چار سلطنتیں ہیں جو اس سے پیدا ہوں گی لیکن ان کا اقتدار اتنا نہ ہوگا"

بائبل کے اقتباس مندرجہ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ دو سینگوں سے مراد میڈیا اور ایران ہیں۔ لہذا جو شخص پہلی مرتبہ ان دونوں ملکوں کا بادشاہ ہوا اسکو ذوالقرنین ہونا چاہیے اور وہ دارا یوش اول بن گشتاسپ تھا اس کی صحت کے جو اور دلائل پیش ہو سکتے ہیں حسب ذیل ہیں۔

(٢) چونکہ داریوش اول کا عہد سلطنت ۵۲۱ ق م سے ۴۸۵ ق م تک رہا اس لئے اس کے زمانہ میں دو صدیاں پڑی؛ اور اس بنا پر بھی اسے ذوالقرنین کہہ سکتے ہیں۔

(٣) چونکہ داریوش نے یہودیوں کو ہیکل مقدس دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت دیدی تھی اس لئے اس کا ذکر بائبل میں کئی مقام پر آیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ قرآن شریف میں بھی ذوالقرنین سے وہی مراد ہو جو بائبل سے معلوم ہوتا ہے۔

(۴) جب داریوش اول تخت نشین ہوا تو شمال، جنوب، اور مغرب کے علاقے باغی ہوگئے (یہ واقعہ سنہ ۵۲۰ ق م کا ہے) لیکن اس نے ان تمام بغاوتوں کو کچل ڈالا اور تمام سلطنت ایران میں اپنی حکومت قائم کی۔ یہ واقعات بائبل کے اس تشبیہی بیان سے بالکل ملتے جلتے ہیں کہ اس دو سینگوں والے مینڈھے نے پچھم اتر، دکھن حملے کئے حتیٰ کہ کوئی جانور اس کے سامنے نہ کھڑا نہ ہو سکا۔

(۵) قرآن شریف میں ذوالقرنین کے تین سفر بیان کئے گئے ہیں۔ پہلا سفر وہ ہے جبکہ وہ مقام غروب الشمس تک پہونچا اور وہاں اس نے آفتاب کو "عین حمئۃ" (کالے پانی کے چشمہ) میں غروب ہوتے دیکھا۔ وہاں اس کو ایک قوم ملی۔ چنانچہ داریوش ہی وہ شخص تھا جس نے جانب مغرب سفر کیا اور آرمینیا اور سواحل پونٹس (بحیرۂ اسود) کی تمام وحشی قوموں کو مغلوب کیا۔ ظاہر ہے کہ جب وہ "عین حمئۃ" (بحیرۂ اسود) کے کنارے پر پہونچا ہوگا تو وہاں شام کے وقت اسے آفتاب (کالے پانی کے چشمہ) میں غروب ہوتا ہوا نظر آیا ہوگا۔

(۹) بعض مورخین ومفسرین نے ذوالقرنین کو پیغمبر یا مرد صالح لکھا ہے اور یہ بات تمام دنیا جانتی ہے کہ اسکندر اعظم بن فیلقوس ایک بت پرست شخص تھا جو پیغمبر نہیں ہو سکتا۔ برعکس ازیں دارپوش جس کی نسبت انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا نے لکھا ہے" دارپوش جیسا کہ مقام بسیتون کے کتبوں سے پایا جاتا ہے دین زردشتی کا پرجوش پیرو تھا" اور مجوس اہل کتاب میں داخل ہیں۔ ملاحظہ ہو قرآن شریف کی سورۂ حج آیت ۱۷۔ ان الذین آمنوا والذین ہادوا والصابئین والنصارٰی والمجوس جس کی رو سے یہودی، نصاریٰ، صابئین اور مجوس اہل کتاب میں داخل ہیں۔ اس کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ہجر (بحرین) کے مجوسیوں سے جزیہ لے کر ان کو اپنی پناہ میں لے لیا تھا اس طرح گویا دارپوش اگر پیغمبر نہیں تھا تو اہل کتاب ہونے کی حیثیت سے مرد صالح ضرور تھا اور وہ اپنے دین کا داعی بھی تھا جیسا کہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے "وسنقول لہ من امرنا یسرا" یعنی اس نے سواحل بحیرۂ اسود کی قوم کو دعوت توسیت دی ہوگی

(۱۰) دوسرا سفر ذوالقرنین کا مطلع الشمس کی طرف ہوا جہاں اس نے آفتاب کو ایسی قوم پر طلوع ہوتے دیکھا جسے آفتاب سے پناہ نہیں دی گئی تھی اس میں دارپوش اعظم کے اس سفر کی طرف اشارہ ہے جو اس نے جانب مشرق خراسان کی طرف قبائل مرجیہ (MARGIAUS) کی بغاوت فرو کرنے اور تورانی قبائل کی سرکوبی کے لئے کیا تھا۔ واضح ہو کہ یہاں مقام "مطلع الشمس" ایران کا وہ مشرقی علاقہ مراد ہے جسے خراسان یا "خور آسان" کہتے ہیں۔ یہ دراصل "خورستان" ہے

جو مرکب ہے لفظ "خور" یعنی آفتاب اور "استہان" بمعنی مقام سے جس کے معنی ہوتے "سرزمین طلوع آفتاب" یا مقام "طلوع الشمس" "انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں "خور آسان" کو مرکب بتایا ہے "خور" (یعنی آفتاب) اور "آسان" (بمعنی طلوع) سے یعنی مقام طلوع الشمس"۔

(۸) ذوالقرنین کا تیسرا سفر وہ ہے جہاں وہ "بین السدین" یعنی دو پہاڑوں کے درمیان پہونچا اور وہاں اس نے ایک ایسی قوم دیکھی جو ذوالقرنین کی زبان نہیں سمجھتی تھی۔ اور یہیں ذوالقرنین سے ان اقوام نے جو اس کے ماتحت تھیں یاجوج ماجوج کی شکایت کی کہ "وہ اس ملک میں آکر فتنہ و فساد برپا کرتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو خراج مقرر کر دیا جائے تاکہ آپ یاجوج اور ماجوج اور ہمارے درمیان ایک سد تعمیر کر دیں" تاکہ دو پہاڑوں کے درمیان "بین السدین" ایک دیوار مستحکم تعمیر کر دی گئی۔ یہ کام بھی سکندر اعظم بن فیلقوس نے نہیں کیا بلکہ اس سے قبل دارا یوش اعظم نے یہ دیوار آرمینیا، آذربائیجان اور قفقاز فتح کرنے کے بعد تعمیر کی تھی ——— سیتھین اقوام کے خلاف دارا یوش اعظم نے سنہ ۵۱۶ ق م میں کی تھی (سد کا بیان آگے آتا ہے)

(۹) قرآن شریف کی آیت "انا مکنا لہ فی الارض وآتینٰہ من کل شیء سبباً" یعنی تحقیق ہم نے اس کا تسلط زمین پر قائم کر دیا اور ہم نے اسے ہر قسم کا سامان عطا فرمایا۔ اس آیت سے عموماً مسلمان مفسرین یہ استدلال کرتے ہیں کہ وہ بہت بڑا بادشاہ تھا ہم بھی اس قول کی تائید کرتے ہیں کہ واقعی ذوالقرنین بہت بڑا

بادشاہ تھا مگر ہمارے نزدیک وہ سکندر اعظم بن فیلقوس نہیں تھا جس کے کارناموں کا حال ہم اوپر بیان کر چکے ہیں بلکہ درحقیقت وہ داریوش اول شاہ ایران و میڈیا تھا جو سکندر اعظم سے بھی پیشتر گزر چکا تھا اور اپنے قول کی تائید میں ہم بائبل کتاب دانیال باب ۸ کا وہ رویا پیش کرتے ہیں جو دانیال نے دیکھا۔ اس میں دو سینگوں والا مینڈھا پہلے نظر آتا ہے اور اس مینڈھے کے دو سینگ ایران و میڈیا تھے۔

اس کے بعد ایک سینگ والا بکرا نظر آتا ہے جو سکندر اعظم بن فیلقوس تھا جس نے دارائے اعظم کے جانشین دارائے سوم فرمانروائے میڈیا و ایران کو شکست دی یہ واقعہ ۳۳۱ ق م کا ہے۔ بعد ازاں اس بکرے کا ایک سینگ (ایک سلطنت) ٹوٹ کر اس کی جگہ چار سینگ نکل آتے ہیں یعنی چار سلطنتیں قائم ہو جاتی ہیں۔ اور یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ سکندر بن فیلقوس کے مرنے کے بعد اس کی سلطنت اس کے چار جرنیلوں میں بطلیموس، ارہداؤس، انطیوخیوس، سلوقوس نے تقسیم کر لی تھی۔ ان واقعات اور رویائے دانیال سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سکندر ذوالقرنین نہیں تھا بلکہ "واحد القرن" تھا اور اصلی ذوالقرنین شاہ ایران و میڈیا داریوش اول تھا۔ علاوہ ازیں "انا مکنا لہ فی الارض من کل شیئ سببا" کی صحیح تصویر آپ کو مندرجہ ذیل نوٹ سے نظر آجائے گی جس میں ہم داریوش اعظم کے مختصر حالات بیان کرتے ہیں۔ آپ ان حالات کا مقابلہ سکندر اعظم کے تاریخی حالات سے کرکے دیکھ سکتے ہیں کہ دونوں میں کون بادشاہ بڑا تھا۔

(۱۰) داریوش اعظم بن گشتاسپ (HYSTASPES) کی تاریخ

اس کے کتبات مندرجہ کوہ بیستون سے بخوبی معلوم ہوتی ہے جب کامبے سیس شہنشاہ ایران ۵۲۱ ق م میں خودکشی کرکے مرگیا تو اس وقت ایک شخص مسمی گوتم نے تمام سلطنت کو غصب کرلیا اور وہ بردیہ بن کاؤس کے نام سے سلطنت کرتا رہا۔ کوئی شخص اس کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکال سکتا تھا لیکن دارا یوش نے جو شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا اس غاصب کے خلاف سازش کی اور چھ ایرانی امراء کی مدد سے اس نے گوتم کو قتل کیا جو اس وقت میڈیا کے ایک قلعہ میں تھا۔ اور اس طرح وہ ایران و میڈیا دونوں سلطنتوں کے تخت و تاج کا مالک ہوگیا۔ مگر اس انقلاب سیاسی کے ساتھ ہی صوبجات سوس۔ بابل، میڈیا صغر تیہ، مرغیہ وغیرہ نے علم بغاوت بلند کیا لیکن دارا یوش نے ایرانی اور میڈیا کی فوجوں سے تمام بغاوتوں کو فرو کردیا اور تمام سلطنت پر اپنا تسلط قائم کرلیا۔ کتبات بیستون سے ظاہر ہوتا ہے کہ دارا یوش اعظم زردشت کے دین کا نہایت پر جوش پیرو تھا۔ علاوہ ازیں وہ بڑا مدبر بادشاہ تھا۔ ملک کی تنظیم سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے کوہستان آرمینیا اور سواحل بحیرہ اسود کی قوموں کو مغلوب کرلیا اور سلطنت ایران کو کوہستان قفقاز تک وسعت دی۔ اور اسی غرض سے اس نے اقوام ساکا اور دیگر تورانی اقوام سے جنگ کی۔ ملک میں امن و امان قائم کرکے اس نے ملکی تجارت کو فروغ دینے کی کوشش کی اور اسکائیلاکس کی ماتحتی میں ایک مہم روانہ کی جو دریائے کابل سے گزرتی ہوئی دریائے سندھ تک پہونچی اور پھر دہانہ دریائے سندھ سے لے کر سویز تک تمام بحر عرب کی دیکھ بھال کی۔ دارا یوش

نے دریائے نیل سے خلیج سوئز تک ایک نہر تعمیر کی جس میں ہو کر اس کے جہاز بحرِ احمر میں ہوتے ہوئے ایران آتے تھے۔ اس کے تعلقات ملک قرطاجنہ سے بھی تھے اور اس نے جزیرۂ صقلیہ اور ملک اطالیہ کے سواحل کی تحقیق و تفتیش کی تھی۔ اسی کے ساتھ اس کی پالیسی یہ تھی کہ اپنی تمام مفتوحہ اقوام کی تالیف قلوب کرے اور اس غرض سے اُس نے مفتوحہ اقوام کے مقتدایانِ دین سے میل جول شروع کیا اُس نے یہودیوں کو بھی ہیکل مقدس تعمیر کرنے کی اجازت دیدی۔ اُس نے ممفس، عید فوا اور نخلستان کبیر میں بڑے بڑے مندر تعمیر کرائے۔ جن کی دیواروں پر ان کا نام کندہ ہے۔ اُس نے مصر کے کاہن اعظم کو اپنے دار السلطنت میں طلب کیا اور اس کو حکم دیا کہ سائیس کے مندر سے متعلق جو بہت بڑا طبی کالج ہے اس کا انتظام کرے۔ قدیم مصری روایات میں داریوش اعظم کو بڑا چشمۂ فیض اور مقنن بیان کیا گیا ہے۔ ایسا ہی عمدہ سلوک اس نے یونانی امکنۂ مقدسہ کیساتھ کیا اور اپالو کے ہیکل کے متعلق جس قدر اوقاف تھے ان کا ٹیکس معاف کر دیا اور میگارس کے خلاف حکم امتناعی جاری کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ یورپ و ایشیائے کوچک میں یونانیوں کے جتنے مذہبی مراکز تھے وہ سب داریوش اعظم کے حامی و مددگار رہے اور جب داریوش اعظم نے مختلف اقوام و ملل کے ساتھ جنگ کی تو تمام یونانیوں کو تنبیہ کر دی گئی تھی کہ داریوش اعظم کی مزاحمت نہ کریں۔

سنہ ۵۱۲ ق م کے قریب داریوش اعظم نے سیتھیں قوم کے خلاف فوج کشی کی۔ ایران کی ایک زبردست فوج باسفورس کو عبور کر کے یورپ میں داخل ہوئی

اور تھریس کو فتح کرتی ہوئی دریائے ڈانیوب سے پار ہوگئی۔ اس مہم کا مقصد محض یہ تھا کہ تورانی اقوام (یاجوج و ماجوج) پر عقب کی طرف سے حملہ کیا جائے اور اس طرح سلطنت ایران کی شمالی سرحدوں پر قیام امن کیا جائے۔ الغرض داریوش اعظم (بقول ہیرودوطس) اقوام سیتھین کے پیچھے دریائے وولگا تک پہونچ گیا مگر مرکز سے دور ہونے کے باعث واپس آنا پڑا۔ اس کے بعد مصر میں بغاوت ہوگئی اور ابھی یہ بغاوت فرو بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ۴۸۶ق م میں داریوش اعظم مرگیا اس نے ۳۶ برس سلطنت کی۔ الغرض ان تمام واقعات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ذوالقرنین سے مراد سکندر نہیں بلکہ داریوش اعظم ہے جس کے حالات بالکل کلام مجید کے بتائے ہوئے حالات سے ملتے جلتے ہیں۔

اس وقت دنیا میں دو بڑی اور عظیم الشان سدیں پائی جاتی ہیں۔

سد (۱) دیوار چین۔ (۲) دیوار دربند یا باب الابواب۔ سرسید کے نزدیک ذوالقرنین کی تعمیر کردہ سد چین کی دیوار ہے اور دیگر مورخین و مفسرین کے نزدیک وہ باب الابواب ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں پر علیحدہ بحث کیجائے۔

(۱) سرسید فرماتے ہیں کہ کچھ شبہ نہیں ہے جس سد کا ذکر قرآن مجید میں ہے وہ وہی دیوار ہے جو چین و تاتار یا سیتھیا کی سرحد پر بتائی گئی ہے اور جس کو شی وانگ ٹی نغفور چین نے درمیان ۲۳۵-۲۱۴ ق م تعمیر کیا تھا۔ یہ دیوار ہانگھو دریا کے غربی موڑ سے جو ایک پہاڑ کے قریب ۴۰ درجہ ۱۵ دقیقہ عرض البلد اور ۱۰۷ درجہ طول البلد پر واقع ہے بننا شروع ہوئی اور پھر اس دریا کے دوسرے موڑ کو قریباً ۳۹ درجہ عرض البلد

اور ۱۱۱ درجہ طول البلد پر کاٹ کر اور خنجان پہاڑوں کے جنوبی سلسلہ کے نیچے ہوکر خلیج لیوتونگ کے کنارہ پر ٹھیک چالیس درجہ عرض البلد اور ایک سو بیس درجہ طول البلد پر ختم ہوتی ہے۔ طول اس دیوار کا بارہ سو میل سے پندرہ سو میل کا بیان ہوا ہے اور وجہ اس کی تیاری کی یہ ہوئی کہ جب قوم تاتار نے اس طرف سے بار بار یورش کرکے خطائیوں کو سخت عاجز کیا اور کوئی تدبیر ان کو ضبط کرنے کی نہیں سوجھی تب اس دیوار کی بنا ڈالی گئی اور فغفور چی وانگ تی نے دو سو چالیس برس قبل مسیح کے اسے شروع کیا اور عرصہ قلیل یعنی صرف پانچ برس میں یہ تمام ہوئی.........

یہ دیوار سمندر کے بیچ سے اس طرح پر شروع ہوئی ہے کہ صد ہا جہاز پتھروں سے لدے ہوئے ڈھا دیئے گئے اور اس پر اس کی بنیاد قائم ہوئی ہے اور آٹھ سو کوس تک بیس گز اونچی اور اس قدر چوڑی ہے کہ چھ سوار پہلو بہ پہلو فراغت سے اس پر گھوڑا دوڑا سکتے ہیں اور سو سو قدم پر دو منزلہ اور سہ منزلہ برج ہیں۔

ہم سرسید کی یہ بات ماننے کے لئے تو تیار ہیں کہ چین کی دیوار اعظم اقوام سیتھین (یاجوج ماجوج) کی روک تھام کے لئے تعمیر کی گئی تھی مگر ہم یہ بات تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں کہ اس دیوار کا تعمیر کرنے والا قرآن کا ذوالقرنین تھا یا یہ وہی دیوار ہے جس کا ذکر بہ سد، سے قرآن شریف میں آیا ہے۔ اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) چین کی دیوار اعظم اس قدر دور دراز فاصلہ پر واقع ہے کہ عربوں کو جنھوں نے قرآن میں رسول اللہ سے ذوالقرنین کے بارہ میں سوال کیا تھا اس سے واقف نہیں ہو سکتے تھے لہذا ذوالقرنین کی بنائی ہوئی دیوار وہ ہونا چاہئے جو ملک عرب کے

قریب اور اس میں زیادہ مشہور ہے۔

(ب) چین کی دیوار ۱۵سو میل طویل، اتنی بلند اور اس قدر چوڑی ہے کہ اس پر چھ سوار پہلو بہ پہلو فراغت سے گھوڑا دوڑا سکتے ہیں اور سو سو قدم پر دو منزلہ وسہ منزلہ برج بنے ہوئے ہیں اور یہ بقول سرسید یہ دیوار فغفور چین نے پانچ سال کی قلیل مدت میں تعمیر کر لی تھی۔ اتنی عظیم الشان دیوار کا پانچ سال میں تعمیر ہو جانا قرین قیاس نہیں ہے

(ج) سرسید نے تحریر فرمایا ہے کہ دیوار چین کا ایک سرا سمندر میں ہے اور دوسرا اس طرح شروع ہوا کہ ہزاروں جہاز پتھروں سے بھر کر ڈبو دیے گئے۔ ان پر دیوار کی تعمیر قائم کی گئی تھی۔ اس طرح یہ دیوار "بین الصدفین" نہ رہی اور قرآن شریف کی دیوار "بین الصدفین" ہے یعنی دو پہاڑوں یا پہاڑیوں کے درمیان۔

(۲) ہمارے نزدیک ذوالقرنین کی تعمیر کردہ دیوار یا سد وہ ہے جو شہنشاہ دارا یوش اعظم نے اقوام وحشیین (یاجوج ماجوج) کو روکنے کے لئے بمقام دربند واقع داغستان تعمیر کی تھی۔ اس دیوار کا کچھ حال مراصد الاطلاع میں اور ابن الفقیہ نے بھی بیان کیا ہے۔ دربند ملک ایران کا ایک شہر ہے جو صوبہ داغستان میں واقع ہے اور بحر خزر کے مغربی ساحل پر پایا جاتا ہے اور اس کے جنوب کی طرف دیوار تقریباً ۵۰ میل طول) کا وہ سرا واقع ہے جو بحر خزر کی جانب چلا گیا ہے۔ یہ دیوار سد سکندری کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اور اس دیوار کے ذریعہ سے وہ گھاٹ بند کیا گیا ہے جسے "باب الحدید" (IRON GATE) یا "باب القزوین" (YATPIAN GATES) کہتے ہیں جب

یہ دیوار مکمل تھی تو اس کی بلندی ۲۹ فٹ اور موٹائی ۱۰ فٹ تھی اور لاتعداد ابواب الحدید" اور بے شمار برجوں کے باعث وہ سلطنت ایران کی سرحد کا ایک گرانقدر استحکام تھی۔ اس اقتباس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن شریف کی آیت میں جن "لوہے کے ٹکڑوں" کا ذکر کیا گیا ہے وہ "ابواب الحدید" بنانے میں کام آئے ہوں گے۔ سکندر بن فیلقوس نے اقوام سیتھیا (یاجوج و ماجوج) پر کہیں حملہ نہیں کیا۔ وہ "باب القزوین" (TOASRIAN GATES) تک ۳۲۲ ق م میں صرف داریوش سوم کا تعاقب کرتا ہوا پہنچا تھا۔ ممکن ہے کہ اس وقت اس نے بھی اس دیوار کے استحکامات میں کچھ اضافہ کر دیا ہو جس کی وجہ سے وہ "سدِ سکندری" مشہور ہو گئی ورنہ یہ محض مسلم مورخین کی قیاس آرائی ہے جو سکندر اعظم کو ذوالقرنین سمجھے ہوئے تھے ورنہ سکندر کی عمر ہی اتنی کہاں ہوئی تھی جو وہ سدِ عظیم تعمیر کر سکتا۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں "دربند" کے متعلق لکھا ہے کہ اسے عرب لوگ الباب (GATE) باب الابواب یعنی (GATE OF GATES) اور باب الابواب (THE GATE OF GATES) کہتے ہیں یہ شہر داغستان میں واقع ہے اور خاص طور پر اپنی عجیب و غریب دیواروں کی وجہ سے مشہور ہے جو پہاڑوں کے درمیان واقع ہیں بعض جگہ یہ دیوار ۲۰ میل چوڑی ہے۔ ساسانیوں اور بعد ازاں مسلمانوں کے عہد میں یہ دیوار بلاد ایشیا کو جنوبی روس کی خانہ بدوش اقوام (یاجوج و ماجوج) کے حملوں سے محفوظ رکھتی تھی

الغرض ہماری تحقیق یہ ہے کہ یاجوج و ماجوج سے وہ وحشی اقوام مراد ہیں جو قفقاز

کے شمال میں رہتی تھیں۔ اور ذوالقرنین عبارت ہے دارا بن شاہ اعظم سے اور سدّ سے مراد وہ دیوار ہے جو دارا بن گشتاسپ نے دربند میں تعمیر کرائی تھی۔

ہاروت و ماروت، زہرہ اسم اعظم

(جناب سید زین العابدین صاحب حیدر آباد دکن)

"براہ کرم مطلع فرمائیے کہ قرآن پاک میں "ہاروت و ماروت" کا جو ذکر آیا ہے اس کا صحیح مطلب کیا ہے اور عام طور پر جو قصہ ہاروت و ماروت کے متعلق مشہور ہے کہ وہ دو فرشتے تھے اور زمین پر آ کر زہرہ نامی کسی خوبصورت عورت سے آلودہ ہو کر چاہ بابل میں قید کر دئے گئے اور زہرہ اُن سے اسم اعظم سیکھ کر آسمان پر پہونچ گئی۔ کہاں تک قابل اعتماد ہے اور اس روایت کا صحیح ماخذ کیا ہے؟"

دوران قیام حیدرآباد میں متعدد استفسارات زبانی و تحریری مجھ سے کیے گئے جن میں سے بعض کا جواب تو میں زبانی دے چکا ہوں، اور بعض کا ذریعۂ نگار دینا ہے۔ ان میں سے زیادہ اہم استفسار ایک تو یہی ہے جو درج کیا جاتا ہے اور دوسرا جوش ملیح آبادی اور علی اختر کی شاعری کے متعلق ہے کہ ان دونوں کی شاعری میں کیا فرق ہے اور کس کو کس پر ترجیح دی جانی چاہیے۔ اس اشاعت

میں استفسار دل کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور دوسرے استفسار کی طرف پھر متوجہ ہوں گا۔

کلام پاک میں ہاروت و ماروت کا ذکر جس آیت میں آیا ہے وہ سورۂ بقر کی آیت ۱۰۲ ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"وما کفر سلیمٰن ولکنّ الشیٰطین کفروا یعلّمون الناس السحر وما انزل علی الملکین ببابل ہاروت وماروت وما یعلّمان من احد حتّی یقولا انما نحن فتنۃ فلا تکفر فیتعلّمون منہما ما یفرّقون بہ بین المرء وزوجہ ط"

اس کا ترجمہ یہ ہے۔

"اور سلیمان نے کفر نہیں کیا بلکہ شیاطین نے کفر کیا۔ جو لوگوں کو سحر سکھاتے تھے اور بابل میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر کچھ نازل نہیں کیا گیا اور وہ کسی کو سحر نہ سکھاتے تھے جب تک یہ نہ کہہ دیتے تھے کہ ہم امتحان میں پڑے ہوئے ہیں۔ تم کفر میں مبتلا نہ ہو۔ پس وہ لوگ سیکھتے تھے ان دونوں سے وہ چیز جس سے میاں بیوی میں جدائی ہو جاتی۔"

اس آیت کے اگر معنی یہی ہیں اور بغیر کسی تاویل کے اس کا مفہوم متعین کیا جاتا ہے تو اس سے حسب ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں۔

(۱) بابل میں دو فرشتے تھے جن کا نام ہاروت و ماروت تھا۔
(۲) وہ کسی عذاب میں مبتلا کیے گئے تھے جس کی صراحت نہیں کی گئی۔
(۳) جب وہ کسی کو جادو سکھاتے تھے تو پہلے اس کو باز رکھتے تھے۔

(۴) لوگ ان فرشتوں سے میاں بیوی کے درمیان تفرقہ پیدا کرنے کا جادو سیکھا کرتے تھے۔

مفسرین نے احادیث کے استناد پر اس آیت کی تفسیر میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے :-

جب فرشتوں نے بہ زمانۂ ادریس انسانوں کے خراب اعمال دیکھے تو انھوں نے خدا سے کہا کہ اے خدا کیا یہ اعمال اسی مخلوق کے ہیں جسے تو نے اپنا خلیفہ و نائب بنا کر دنیا میں بھیجا ہے۔ یہ سن کر خدا نے ارشاد فرمایا کہ "اگر میں تم کو بھی انھیں خواہشات کے ساتھ زمین پر بھیجتا جو نوعِ انسان میں پیدا کی گئی ہیں، تو تم بھی وہی کرتے جو انسان کرتا ہے"۔

یہ سن کر فرشتوں نے کہا، "اے رب یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ ہم سے تیری مرضی کے خلاف کوئی حرکت سرزد ہو"۔ اللہ نے فرمایا کہ اچھا تم اپنے میں سے دو بہترین فرشتے منتخب کر دیں انھیں زمین پر بھیجوں گا۔ پس انھوں نے دو فرشتے منتخب کئے جو نہایت متقی و پرہیزگار تھے"۔

ثعلبی و کلبی نے لکھا ہے کہ اللہ نے تین فرشتوں کے انتخاب کا حکم دیا چنانچہ تین فرشتے انتخاب کئے گئے ایک کا نام عزا تھا (یعنی ہاروت) دوسرے کا عزایا (یعنی ماروت) تیسرے کا عزرائیل۔

جب انتخاب کی کارروائی عمل میں آ چکی تو اللہ نے ان فرشتوں میں انسانی خواہشات بھر دیں اور زمین کی طرف بھیج دیا۔ چلتے وقت ان کو حکم دیا گیا

کہ دیکھو شرک و قتل، زنا و مےخواری سے بچنا اور لوگوں کا فیصلہ پورے انصاف سے کرنا عزرائیل نے تو یہ کیا کہ ان خواہشات کے پیدا ہوتے ہی اُس نے اپنے رب سے معافی مانگ لی اور درخواست کی کہ اسے آسمان پر بلا لیا جائے چنانچہ خدا نے اُسے معاف کردیا اور آسمان پر اٹھا لیا لیکن وہ چالیس سال تک سجدہ میں پڑا رہا اور شرم کے مارے گردن نہ اٹھائی۔

باقی دونوں فرشتے زمین پر رہے لیکن صورت یہ تھی کہ تمام دن تو وہ انسانوں کے باہمی نزاعوں کا فیصلہ کیا کرتے تھے اور شام کو اسم اعظم پڑھ کر آسمان پر چلے جاتے تھے۔ قتادہ کا بیان ہے کہ جب ایک مہینہ اسی حال میں گزر گیا تو ایک دن زہرہ جو نہایت ہی جمیل عورت تھی ان کے پاس ایک مقدمہ لائی (ایک راوی حدیث کا قول ہے کہ یہ عورت فارس سے وابستہ تھی اور اپنے ملک کی ملکہ تھی) اس کو دیکھ کر دونوں فرشتے بدحواس ہو گئے اور سوال وصل کر بیٹھے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ جب دوسرے دن وہ پھر آئی تو ان فرشتوں نے پھر اپنی التجا پیش کی اُس نے جواب دیا کہ

"جب تک تم میرے بت کی پوجا نہ کرو اور کسی کو قتل کرکے شراب نہ پیو تمہاری خواہش پوری ہونا محال ہے" انھوں نے انکار کردیا اور وہ پھر چلی گئی۔ تیسرے دن جب وہ آئی تو اپنے ساتھ جام شراب بھی لائی۔ فرشتوں نے پھر وہی خواہش پیش کی اور آخرکار یہ فرشتے اس بات پر راضی ہوگئے کہ شراب پی لیں گے کیونکہ تینوں شرطوں میں سے سب سے زیادہ آسان شرط یہی ہے۔ جب شراب پی کر وہ بدمست ہوئے تو عین حالت اختلاط میں کسی آدمی نے ان کو دیکھ لیا

انھوں نے اس کو قتل کر ڈالا۔

کلبی بن انس کی روایت ہے کہ انھوں نے بت کی بھی پوجا کی۔ اس کے بعد اللہ تعالٰی نے زہرہ کو ایک ستارہ بنا دیا۔ اس کے ستارہ بنائے جانے کی تفصیل بروایت کلبی وعلی وسدی یہ ہے کہ اس عورت نے کہا کہ تم مجھے اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتے جب تک وہ بات نہ بتاؤ جس کے ذریعہ سے تم آسمان پر چڑھ جاتے ہو۔ آخر کار فرشتوں نے اسم اعظم اس کو بتا دیا اور وہ اسم اعظم پڑھ آسمان تک پہونچ گئی اور اللہ تعالٰی نے اُسے ایک ستارہ بنا دیا۔"

مجھے اس وقت مذہبی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر کوئی گفتگو نہیں کرنا ہے اس کو مولویوں کی جماعت جانے اور ان کا اسلام۔ مجھے صرف یہ دیکھنا ہے کہ یہ داستان جو ہاروت ماروت اور زہرہ کے متعلق اسلامی لٹریچر، اسلامی احادیث و تفاسیر میں پائی جاتی ہے یہ کوئی نئی بات تھی جو بتائی گئی یا اس سے قبل بھی کسی اور قوم یا مذہب میں پائی جاتی تھی۔

اس جستجو میں جب ہم مسیحی اور یہودی کتابوں پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اس داستان کے بعض ٹکڑے مسیحی کتابوں میں بھی ہیں اور یہودیوں کے یہاں تو تقریباً یہی قصہ جوں کا توں موجود ہے چنانچہ ہم یہودیوں کے صحیفہ مقدس مدراش یلقوت باب ۴۴ سے اس کو ذیل میں درج کرتے ہیں۔

"ربی یوسف کے شاگردوں نے اس سے دریافت کیا کہ عزائیل کیا ہے؟

عزائیل اور عزرائیل میں فرق صرف ایک رکھا ہے) اس نے جواب دیا کہ جب نوح کی قوم بت پرستی کرنے لگی تو خدائے قدوس کے حضور میں دو فرشتے شمحائی اور عزائیل آئے اور عرض کیا "اے رب العالمین انسان میں کیا بات ہے جو تو اس کی اتنی رعایت کرتا ہے" خدا نے فرمایا کہ "اگر تم کو دنیا پر غلبہ دیا جائے تو خواہشات نفسانی میں تم انسان سے زیادہ مبتلا ہو جاؤ"۔ یہ سن کر فرشتوں نے کہا کہ ان سے کبھی سرکشی ممکن نہیں۔ تو خدا نے فرمایا کہ "اچھا جاؤ اور ان کے ساتھ رہو"۔ دنیا میں آ کر فرشتے شمحازائی نے ایک نوجوان دوشیزہ کو دیکھا جس کا نام استھر (ESTAHARIC) تھا۔ فرشتے نے اس لڑکی پر اپنی آنکھیں جما دیں اور بولا کہ مجھ سے التفات کی باتیں کرو۔ اس نے کہا کہ "تیری باتیں میں نہ سنوں گی جب تک مجھے خدا کا وہ عجیب نام نہ بتا دے جس کو پڑھ کر تو آسمان پر چلا جاتا ہے"۔ تب فرشتے نے وہ نام بتا دیا اور وہ لڑکی آسمان پر چڑھ گئی۔ خدا نے حکم دیا کہ اسے جنت کواکب میں شامل کر دو"۔

اس کے بعد ان فرشتوں نے دو بیویاں کر لیں اور دو لڑکے حوّا اور حیا پیدا ہوئے۔ عزائیل کے پاس بہت سا زیور اور اسباب آرائش موجود تھا جن کی وجہ سے مرد عورتوں کی طرف مائل ہو کر گمراہ ہو جاتے ہیں[۵]"

---

۵ قزوینی نے اس کا نام زہرہ، اناہیدا اور بی دخت بتایا ہے۔ آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ استھر، استار و اشتار دراصل زہرہ ستارہ ہی کے مختلف نام ہیں۔

۶ اس اخیر کے فقرہ پر ہم آئندہ بحث کر کے بتائیں گے کہ اسلامی روایات میں اس سے کیا کام لیا گیا۔

یہودیوں کی اس روایت کو پڑھ کر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اسلامی روایت اور یہودی روایت میں کتنا فرق ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ مسئلہ بھی غور طلب ہے کہ یہود میں یہ روایت کیونکر آئی۔ آیا یہ کوئی صحیح واقعہ تھا جو الہام ربانی کے ذریعہ سے معلوم ہوا تھا یا کیا؟ اسی سلسلہ میں یہ امر بھی قابل تحقیق ہے کہ ہاروت و ماروت کہاں سے آئے تھے اور اس عورت کا نام زہرہ کیونکر معلوم ہوا؟

اسلامی لٹریچر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان فرشتوں کے نام ہاروت و ماروت ارتکاب معصیت کے بعد رکھے گئے تھے ورنہ اس سے قبل ان کے نام عزا اور عزایا تھے۔ مدراش یلقوت میں ان کے نام شمحازائی اور عزائیل بتائے گئے ہیں۔ رہا یہ امر کہ ان یہودی و عربی ناموں میں کوئی مناسبت ہے یا نہیں۔ زیادہ قابل لحاظ نہیں کیونکہ کلام پاک میں یہ نام کسی جگہ درج نہیں ہیں۔ البتہ ہاروت ماروت کے متعلق تحقیق ضروری ہے کہ ان کی اصلیت کیا ہے۔ بعض محققین عربی کی رائے ہے کہ یہ دونوں لفظ ہرت و مرت سے نکلے ہیں جن کے معنی عربی زبان میں پھاڑنے اور توڑنے کے ہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان دونوں ناموں کا پتہ اور قوموں کے لٹریچر میں بھی چلتا ہے۔ چنانچہ لسنتدل کی تحقیق ہے کہ یہ دونوں نام قدیم ارمن بتوں کے ہیں جن کی تیسری چوتھی صدی میں پرستش کی جاتی تھی۔ اور جن کا نام ارمنی زبان میں ہورروت اور مورروت تھا۔ ڈاکٹر موصوف نے ایک ارمن مصنف کا بیان درج کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں دیوتا معاون مانے جاتے تھے ایک اور دیوی کے جس کا نام اسپند رامیت تھا اور ان دیوتاؤں کی خدمت

یہ تھی کہ زمین کی پیداوار میں اضافہ کریں۔

لیکن اس تحقیق کو اور آگے بڑھائیے تو معلوم ہوگا کہ آرمینیا میں یہ خیال یقیناً قدیم ایرانیوں سے آیا کیونکہ اوستا میں بھی ایک دیوی سپنتا آرمتی کا وجود پایا جاتا ہے جو (آرمینیوں کی اسپندرامیت ہے) اور اس کے بھی دو معاون دیوتا ہوروات اور امرتات تھے جن کے معنی علی الترتیب کثرت و افراط اور قیام و بقا کے ہیں[1]۔ واضح ہو کہ یہی دونوں لفظ بعد کو خورداد و مرداد ہو گئے جن پر تیسرے اور پانچویں مجوسی مہینوں کے نام رکھے گئے۔

اب جس وقت ہم آرمینیا کے ناموں پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اصل آریہ زبان ہے اور سنسکرت زبان میں ان کی اصل صورت سروتا (SARUATA) اور امرتا (AMRITA) پائی جاتی ہے۔ پہلا نام رگ وید میں بصورت سرواتاتی (SARUATATI) آیا ہے اور آریہ روایتوں میں بھی یہ دیوتا زمین کو زرخیزی بخشنے والے ظاہر کئے جاتے ہیں۔

اب زہرہ کے متعلق تحقیق کیجئے کہ اس کا نام کہاں سے آیا تو معلوم ہوگا کہ یہودی روایت میں اس لڑکی کا نام ایستھر (ESTAHER OR ESTHER) بتایا گیا ہے جو دراصل قدیم اہل بابل کی دیوی اشتار (ISHTAHER) تھی اور جس کی پرستش شام و فلسطین میں اشتوریث (ASHTORETH) کے نام سے ہوتی تھی۔ یہ عشق و

---

[1] ان دیوتاؤں (ہوروت و مروت) کی خدمت اضافہ پیداوار سے کس قدر قریب کا تعلق رکھتی ہے۔

محبت کی دیوی جس کا نام یونانیوں میں آفرودایت (APHRODITE) اور رومیوں میں وینس (VENUS) تھا۔ پھر چونکہ اسی دیوی کو سیارہ وینس (VENUS) بھی بتایا جاتا تھا جسے اہل عرب زہرہ کہتے ہیں اس لئے بہ آسانی خیال میں آسکتا ہے کہ عربی روایتوں میں فرشتوں کی بہکانے والی لڑکی کا زہرہ کس وجہ سے رکھا گیا کیونکہ جس طرح زہرہ کا آسمان پر چلا جانا بیان کیا جاتا ہے بالکل اسی طرح اہل بابل و آشور کی روایات قدیمہ میں اشتار دیوی کے متعلق ظاہر کیا جاتا ہے۔

اہل بابل کی قدیم روایت ہے کہ اشتار (یعنی وہی دیوی جسے رومیوں میں وینس کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جسے اہل عرب زہرہ کہتے ہیں) ایک مرتبہ کسی بہادر شخص گلگامیش پر فریفتہ ہوگئی لیکن جب وہ کسی طرح مائل نہ ہوا تو ناراض ہوکر آسمان پر چلی گئی اور خداوند آنو کے حضور میں حاضر ہوئی۔

اسی قسم کا ایک قصہ مہابھارت میں بھی پایا جاتا ہے کہ کسی زمانہ میں دو بھائی سندا اور اپسندا تھے جو بہت بڑے مرتاض تھے۔ برہما نے ان کی آزمائش کے لئے ایک حسین لڑکی پیدا کی جس کا نام تلوتما تھا۔ دونوں بھائی اس کو دیکھ کر فریفتہ ہوگئے اور جوش رقابت میں باہم لڑکر فنا ہوگئے اس کے بعد تلوتما برہما کے پاس واپس چلی گئی اور برہما نے اس کو برکت دی کہ تمام دنیا میں تو گردش کرتی رہے گی اور کوئی شخص تیرے حسن و جمال کی درخشانی کو نظر جما کر نہ دیکھ سکے گا۔ سنسکرت کی اس روایت سے بھی اس عورت کا سیارہ ہوجانا یا کسی سیارہ کو عورت سے تعبیر کرنا ظاہر ہوتا ہے۔

الغرض ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہ صرف عیسوی و یہودی بلکہ قدیم بابلی

آشوری، ایرانی وہندی، یونانی ورومی لٹریچر میں ایسی روایات موجود تھیں جن سے فرشتوں کا آسمان سے اُتر کر ایک عورت کی محبت میں آلودہ ہو جانا مستنبط ہو سکتا تھا اور غالباً عہد نبوی سے قبل یہودیوں میں یہ داستان رائج تھی جسے مسلمان مفسرین اور رواۃ احادیث نے ہاروت وماروت والی آیت سے متعلق کرکے اسی شان کے ساتھ بیان کر دیا درانحالیکہ خود کلام مجید میں کہیں اس کا ذکر نہیں ہے

اب رہا یہ سوال کہ اسم اعظم کا خیال کہاں سے پیدا ہوا سو اس کا ماخذ بھی یہودی روایت ہے کیونکہ ان کے یہاں یہ اعتقاد پایا جاتا تھا کہ جو شخص خدا کا اسم اعظم (JETRAGAMMATON) جانتا ہے وہ بڑے بڑے کام انجام دے سکتا ہے چنانچہ یسوع مسیح کے متعلق بھی بعض یہودی مصنفین نے کہا ہے کہ وہ خدا کا یہی نام لے کر معجزے دکھایا کرتے تھے۔

قرآن شریف میں ہاروت وماروت والی آیتوں کے سلسلہ میں ایک آیت یہ بھی ہے کہ "فیتعلمون منہما ما یفرقون بہ بین المرء وزوجہ" (یعنی لوگ ہاروت وماروت سے ایسی بات سیکھ لیتے تھے جس سے میاں بیوی میں باہم جدائی پیدا کرتے تھے)

اس کے متعلق مخالفین اسلام کا خیال ہے کہ یہ صحیفہ ادریس سے لیا گیا ہے جس میں باغی فرشتوں کا ذکر کرتے ہوئے قصہ کا سلسلہ اس طرح جاری رکھا گیا ہے۔

"انھوں نے اپنے لئے بیویاں پسند کرلیں اور انھوں نے ان عورتوں کو سحر بتایا اور جنتر منتر وغیرہ سکھایا علاوہ اس کے زیور اور اسباب زیبائش وآرائش طیار کرنا بھی بتایا"

اب اس سلسلہ میں اسلامی نقطۂ نظر سے دو باتیں غور طلب ہیں ایک یہ کہ قرآن پاک کی ان آیتوں میں جو ہاروت و ماروت کا ذکر ہے آیا اس کی حقیقت وہی ہے جو عام مفسرین نے بیان کی اور جس کا خلاصہ ابتدائے مضمون میں دیا گیا ہے) یا کچھ اور۔ دوسرے یہ کہ اگر تفسیروں کے اس بیان کو درست سمجھ لیا جائے تو پھر علمائے اسلام کیا جواب دیں گے ان تمام اعتراضات کا جو تحقیق سابق کے سلسلے میں وارد ہوتے ہیں اور اگر کوئی مفہوم اور ہے تو اس کا متعین کرنا ضروری ہے۔

کوثر

(جناب لطف الٰہی صاحب جگنو)

"قرآن میں لفظ کوثر سے کیا مراد ہے۔ کیا واقعی کوئی حوض یا چشمہ ہے جو جنت میں پایا جاتا ہے اور مسلمانوں کے لئے مخصوص ہے۔"

لفظ کوثر کلام مجید میں صرف ایک جگہ آیا ہے۔

"انّا اعطینٰک الکوثر" یہاں لفظ کوثر بر وزن فوعل کثرت سے مشتق ہے اور خیر کثیر کے معنی میں آیا ہے یعنی تجھ کو ہم نے بہت سے برکات بخشے ہیں لیکن افسوس ہے کہ تمام مفسرین نے اس حقیقی معنی کی طرف بالکل اعتنا نہیں کیا اور احادیث پر اعتماد کرکے کسی جگہ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ کوثر ایک نہر ہے فردوس کی، اور کہیں یہ کہ رسول اللہ نے

فرمایا کہ "وہ پانی کا حوض ہے، جو میرے لئے مخصوص ہے اور جو معراج کے وقت مجھ کو دکھایا گیا"

مکی سورتوں میں فردوس کی نہروں کا ذکر اجمال کے ساتھ اور مدنی سورتوں میں زیادہ تفصیل کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

مثل الجنۃ التی وعد المتقون۔ فیہا انہارٌ من ماءٍ غیر آسن وانہارٌ من لبن لم یتغیر طعمہ وانہارٌ من خمر لذۃ للشاربین وانہارٌ من عسل مصفیٰ ط

یعنی ان میں پانی، دودھ، شراب اور شہد کی نہروں کا ہونا ظاہر کیا گیا ہے عیسائی اور یہودی روایات میں بھی جنت کی نہروں کا ذکر پایا جاتا ہے اور سوائے اس کے کوئی فرق نہیں کہ وہاں دودھ اور شہد کے علاوہ تیل کی نہر کا بھی ذکر ہے اور مسلمانوں میں تیل کے بجائے پانی ہے۔

رسول اللہ کی حیات میں تو لفظ کوثر خیر کثیر کے مفہوم میں لیا جاتا تھا لیکن آپ کے بعد وہ چشمۂ فردوس بن کر رہ گیا اور بقول طبری اس کا پانی برف سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ شیریں ہے۔ پھر یہ بدعت اسی جگہ ختم نہیں ہوگئی بلکہ اس میں شاعرانہ مبالغہ سے کام لے کر یہ بھی بتایا گیا کہ اس نہر کے ساحل سونے کے ہیں اور اس کی تہہ میں موتی اور لعل بچھے ہوئے ہیں اسی کے ساتھ یہ جغرافی تحقیق بھی پیش کی گئی کہ جنت کی تمام نہریں اسی کوثر کے اندر آکر گرتی ہیں جس کا دوسرا نام "نہر محمدؐ" بھی ہے۔

قرآن میں جا بجا فردوس کی عشرتوں اور جہنم کے مصائب کا ذکر پایا جاتا ہے

اور یقیناً وہ سب بیان تشبیہی و تمثیلی ہے جس کو مادی صورت سے کوئی واسطہ نہیں" لیکن مفسرین نے جن کے لئے موضوع احادیث کی کوئی کمی نہیں تھی ان تمام باتوں کو دنیاوی لذت والم کا مفہوم سامنے رکھ کر پیش کیا اور اس طرح ایک بڑا دفتر "صنمیات" کا مرتب ہو گیا ——— انھوں نے ایسا کیوں کیا۔ اس کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں۔ یا تو وہ خود حقیقتاً ان تمام باتوں کو صحیح باور کرتے تھے یا یہ کہ صرف بربنائے مصلحت عوام کو ایسا سمجھاتے تھے تاکہ ان میں رغبت و شوق پیدا ہو۔

مجھے اس کے ماننے میں تامل ہے کہ مقصود صرف ترغیب و تشویق تھی بلکہ وہ حقیقتاً جنت و دوزخ کو اسی مفہوم و معنی میں لیتے تھے جو یہود و نصاریٰ یا قدیم روایات میں پایا جاتا ہے اور چونکہ اسرائیلی حکایات بیان کرنے کی ممانعت نہ تھی اس لئے رفتہ رفتہ تمام وہ قصے کہانیاں جو اس وقت رائج تھیں اور جن کو وہ لوگ اکثر سنتے رہتے تھے اسلام میں شامل کر دی گئیں اور موضوع احادیث کے ذریعہ سے ان کی توثیق بھی ہوتی رہی تاکہ لوگوں کو چون و چرا کا موقع نہ ملے۔

قرآن مجید میں دوزخ و جنت کے حقیقی مفہوم کو ظاہر کیا گیا ہے یعنی نہایت صاف الفاظ میں ان کو غیر مادی ظاہر کرتے ہوئے ان کا مفہوم قوم کا زوال و عروج بتایا گیا ہے لیکن افسوس ہے کہ کلام مجید کو احادیث سے علیحدہ کر کے کبھی سامنے پیش نہیں کیا گیا اور روایات موضوعہ سے ہٹ کر کبھی اس کا مطالعہ نہیں کیا گیا ورنہ یہ حقیقت واضح ہو سکتی۔

پھر تماشہ یہ ہے کہ یہ واہمہ پرستیاں کسی خاص زمانہ سے مخصوص نہ تھیں

بلکہ تقریباً ہر دور میں پائی جاتی تھیں اور رفتہ رفتہ برابر ان میں اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ خرافیات کا ایک انبار ہو گیا اور اسلام اس کے اندر ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا گیا۔

اس سے قبل دوزخ و جنت کے حقیقی مفہوم پر کافی بحث کر چکا ہوں اس لئے اعادہ تکرار کی ضرورت نہیں اُسے ملاحظہ فرمائیے۔

مسیح کا دوبارہ زندہ ہونا

(جناب سید اصغر علی صاحب۔ ٹونک)

بعض تفاسیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح کے مصلوب ہونے کے بعد ان کے دوبارہ زندہ ہونے کا عقیدہ مسلمانوں میں بھی پایا جاتا ہے کیا آپ اس مسئلہ پر روشنی ڈال سکتے ہیں کہ اس کی کیا حقیقت ہے اور یہ عقیدہ مسلمانوں میں کہاں سے آیا ہے۔

ہر چند مسلمانوں کی مذہبی روایات میں علاوہ مسیحی و یہودی عنصر کے اور بھی دیگر عناصر اس قدر شامل ہیں اگر کوئی شخص ان کے نکالنے کی کوشش کرے تو اسلام میں "لا الٰہ الا اللہ" بھی باقی نہیں رہ جاتا کیونکہ توحید کا خیال بھی کوئی نیا خیال نہ تھا اور ریگستان عرب میں رسول کے ظہور سے قبل خدائے واحد کی پرستش کا آوازہ کئی بار بلند ہو چکا تھا یعنی ہر چند اسلام مذہب کے باب میں کسی احداث یا ابداع کا مدعی نہ تھا

اور مذاہب سابقہ کی تصدیق ہی اس کا مدعا تھا لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں ہوسکتے کہ ہر رطب و یابس جو اُن مذاہب میں پایا جاتا تھا وہ اسلام میں بھی لے لیا گیا اور تمام وہ روایات جو یہودیوں، نصرانیوں، آتش پرستوں یا دیگر مسلک والوں میں پائی جاتی تھیں ان پر ایمان لانا اسلام کا ضروری جز قرار پایا۔

یقیناً ایسا نہ ہونا چاہئے لیکن ہوا یہی اور اب عام طور پر اسلام جن معتقدات کا مجموعہ سمجھا جاتا ہے وہ بہت کچھ خرافیات پر مشتمل ہے۔ آپ کوئی مذہبی کتاب کوئی تفسیر اُٹھا لیجئے۔ آپ کسی مولوی سے جزئیات ایمان پر گفتگو کیجئے۔ کسی واعظ کا وعظ سنئے۔ آپ یہ معلوم کر کے حیران رہ جائیں گے کہ اسلام جس کے متعلق بالکل سادہ و فطری مذہب ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ نہایت زبردست ضمیاتی لٹریچر اپنے اندر رکھتا ہے جس پر ایمان لانا اس کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا قرآن و رسول پر۔ کیونکہ یہ تمام باتیں احادیث سے مستنبط بتائی جاتی ہیں اور حدیث چونکہ فرمودہ رسول ہے اس لئے اس کا ماننا فرض ہے خواہ عقل میں آئے یا نہ آئے اور خیر یہ تو کوئی کہہ سکتا ہی نہیں کہ حدیث کا کیا اعتبار جبکہ ابو ہریرہ اس کے راوی ہیں اور امام بخاری اس کو صحیح سمجھنے والے۔

غرض مدعا یہ ہے کہ موجودہ اسلام جو زیادہ تر جامعین احادیث اور ان کے راویوں کا اسلام ہے۔ اتنا ہی عجیب و غریب ہے جتنا کوئی مذہب اس دنیا میں ہو سکتا ہے اور مشکل ہی سے کفر و اسلام کے درمیان خط امتیاز کھینچا جا سکتا ہے۔ مذاہب کا تقابلی مطالعہ نہایت دلچسپ چیز ہے لیکن غالباً اس سے زیادہ دلچسپ موضوع

یہ ہے کہ ایک مذہب کے معتقدات کا ماخذ اصلی کیا ہے۔ چنانچہ اس سے قبل ہم نے ایک مضمون عہد عتیق کے ماخذ روایات کے متعلق شائع کیا تھا جو اہل علم کے طبقہ میں بہت پسند کیا گیا تھا۔ یہ سلسلہ استفسار جو مسئلہ آپ نے پیش کیا ہے وہ بھی اسی طرح پیروان محمد و مسیح دونوں میں یکساں طور پر اہمیت رکھتا ہے درانحالیکہ دونوں اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ وہ خالص بت پرستوں کی یادگار ہے۔

آپ کسی مولوی سے دریافت کیجئے کہ مسیح کے دوبارہ زندہ ہونے کے متعلق اسلام کی تعلیم کیا ہے تو وہ بلا تامل کہہ دے گا کہ اس پر ایمان لانا ہمارا فرض ہے کیونکہ رسول اللہ کی احادیث اس باب میں موجود ہیں۔ درانحالیکہ مسیح کا دوبارہ زندہ ہونا خواہ وہ مصلوب ہونے کے تیسرے دن مانا جائے یا قیامت کے قریب، اصنامی روایات قدیمہ سے لیا گیا ہے اور حقیقت سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں۔

مسیح کی وفات کو ۳۸۵ سال کا زمانہ گزر چکا ہے اور سلطنت روما نے ابھی تک عیسوی مذہب اختیار نہیں کیا ہے، ہرچند بعض شاہانِ روما اس نئے مذہب کی طرف اپنا میلان ظاہر کر چکے ہیں اور ایک دو کلیسا بھی تعمیر ہو چکے ہیں لیکن شہر کی آبادی جو لاکھوں نفوس پر مشتمل ہے ہنوز اس نئے مذہب سے متنفر ہے اور نہ صرف عوام بلکہ وہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ اور امیران و امرا کی جماعت بھی مذہب و عقائد مذہب کے لحاظ سے عہد تاریک کی باطل پرستیوں میں مبتلا ہے

۹ مارچ ۳۸۰ء کا ذکر ہے کہ روما میں موسم بہار کی مسرتیں شروع ہو گئیں

ہیں اور ۲۲ مارچ کو پجاریوں کی جماعت ہاتھوں میں نرکل لئے ہوئے نکلتی ہے یہ گویا اس امر کا اعلان ہے کہ سائبل[1] دیوی کی پوجا کا مقدس ہفتہ شروع ہوگیا ہے۔

اس کے پانچ دن بعد ہی پجاری ایک بت لئے ہوئے سڑکوں سے گزرتے ہیں اور مندر تک اسے پہونچا دیتے ہیں۔ یہ بت ایک خوبصورت نوجوان دیوتا کا ہے۔ جو ایک صنوبر کے درخت سے بندھا ہوتا ہے اور اس کے چہرے پر موت کی زردی چھائی ہوئی ہے۔ یہ بت اٹیس دیوتا کا ہے اور یہ رسم گویا اس کی موت پر اظہار غم کے لئے اختیار کی جاتی ہے

اس کے بعد کا دن "خونیں دن" کہلاتا ہے یعنی وہ دن جب اٹیس کا خون بہا! گیا اس کی یادگار میں پجاریوں کو بھی خون آلود ہونا پڑتا تھا اور مشرق میں جہاں یہ رسم انتہائی جوش کے ساتھ منائی جاتی تھی۔ پجاری اپنے عضو مخصوص کو کاٹ کر سائبل دیوی کی قربان گاہ پر نذر چڑھا دیا کرتے تھے لیکن روما میں اس کی اجازت نہ تھی اس لئے وہ صرف اپنے جسم کو جابجا زخمی کر لیا کرتے تھے۔ تاکہ اٹیس کی موت کا غم ہر سال تازہ رہے۔

اس کے دوسرے دن اٹیس کے دوبارہ زندہ ہونے پر جشن منایا جاتا تھا اور یہ تقریب اتنی پر مسرت ہوتی تھی کہ سارا روما گویا دیوانہ ہو جاتا تھا اور جو جس کے جی میں آتا تھا کر گزرتا تھا۔ دو دن بعد پجاریوں کی جماعت ایک سیاہ پتھر کو جو فی الحقیقت لنگ تھا اور جس کا بالائی حصہ نقرئی ہوتا تھا غسل دینے کے لئے

---

[1] اہل روما کے منیات کی ایک دیوی جو تمام دیوتاؤں کی ماں سمجھی جاتی تھی۔

ایک جگہ لے جاتے اور پھر وہاں سے باجا بجاتے ناچتے کودتے اور نہایت فحش گانے گاتے ہوئے واپس آتے۔

یہ بیان ہے اگسٹائن کا جو اس وقت تک عیسائی نہ ہوا تھا اور جس نے خود اپنی آنکھوں سے ۳۸۵ء میں اس رسم کو دیکھا تھا اور تعجب کرتا تھا کہ عیسائیوں کے اس عقیدہ کو کہ مسیح مصلوب ہونے کے ساتویں دن پھر زندہ ہو کر آسمان سے زمین پر واپس آئے اہل روما کے ان بت پرستانہ مراسم سے کتنی مشابہت ہے جس طرح اٹیس کو وہ صنوبر کے درخت سے بندھا ہوا دکھاتے اسی طرح عیسیٰ کو صلیب سے بندھا ہوا بتاتے ہیں ـــــ یہ اگسٹائن وہی شخص ہے جس کے متعلق کبھی یہ خیال بھی نہ قائم نہ ہو سکتا تھا کہ آئندہ چل کر سنٹ اگسٹائن کے مقدس نام سے تمام عیسوی دنیا میں مشہور ہونے والا ہے۔

سنٹ جروم جس کے بیان کی صداقت سے عیسوی دنیا کے کسی فرد کو انکار کی جرات نہیں ہو سکتی۔ لکھتا ہے:۔

> "عہد بت پرستی کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ زہرہ کا عاشق جو نہایت خوبصورت نوجوان تھا مار ڈالا گیا تھا۔ اور پھر ماہ جون میں دوبارہ زندہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ جون کا مہینہ بھی اسی کے نام سے موسوم ہے اور اس دیوتا کے مرگ و زیست کی یادگار نہایت اہتمام سے ہر سال منائی جاتی ہے۔"

جروم جس نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ فلسطین میں بسر کیا تھا لکھتا ہے کہ یہ رسم تمام سرزمین عراق و فلسطین میں رائج تھی اور بالکل قدیم اہل روما کی خرافیاتی روایات

کے مطابق تھی۔ فرق اگر تھا تو صرف اس قدر کہ وہاں اس کا نام تموز تھا اور یہاں تموز۔ وہاں سائبل دیوی تھی اور یہاں استارتے۔ بالکل یہی روایت یونانیوں کے ہاں بھی پہونچی اور وہاں ان دونوں کا نام اڈونس اور وینس ہوگیا۔

الغرض عیسوی مذہب جہاں جہاں پہونچا کسی نہ کسی دیوتا کے مرگ وزیست کا فسانہ ہر جگہ ساتھ لے گیا۔ اور اس کی یادگار ہر مقام پر نہایت اہتمام سے منائی جاتی تھی۔ سرزمین عراق میں اُر سے لے کر یروشلم تک اس مرکر زندہ ہونے والے دیوتا کا نام تموز تھا، فلسطین کے شمال اور تمام ایشیائے کوچک میں اسے اٹیس کہتے تھے اور یونانیوں میں وہ اڈونس کے نام سے مشہور تھا —— رہ گیا مصر سو وہاں بھی دریائے نیل کے ساحل پر ہر سال اوسیریز دیوتا کے ہلاک کئے جانے اور پھر اس کے دوبارہ زندہ ہونے کی تقریب پر میلہ لگا کرتا تھا اور ایران میں عیسوی مذہب سے صدیوں قبل مذہب "مثرائیت" رائج اور وہاں بھی مثرا کے مرکر زندہ ہونے پر ہر سال جشن منایا جاتا تھا۔

جس زمانہ میں عیسوی مذہب سرزمین یونان میں پہونچا۔ تمام مذاہب قدیمہ اور ان کی روایات اصنامی وہاں کثرت سے رائج تھیں اور تقریباً تمام مذاہب کے لوگ اپنی رسمیں آزادی سے ادا کرتے تھے اس لئے ظاہر ہے کہ عیسوی مذہب کو بھی ان سے متاثر ہونا چاہیئے تھا چنانچہ وہ متاثر ہوا اور مسیح کے مصلوب ہوکر دوبارہ زندہ ہونے کی روایت انھوں نے بھی پیدا کر لی۔

رہ گئے اہل عرب، سو ان کے یہاں چونکہ نصرانی اور یہودی روایات بہ

اعتماد کرنے کا دستور چلا آ رہا تھا۔ اسلام لانے کے بعد بھی وہی کیفیت باقی رہی اور مسیح کے دوبارہ زندہ ہونے کا عقیدہ جوں کا توں انھوں نے بھی اختیار کر کے اس کی توثیق کے لئے احادیث وضع کر لیں۔

قرب قیامت کی علامت میں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ مسیح آسمان سے اتر کر آئیں گے اور مہدی آخر الزماں کا ظہور ہوگا۔ یہ عقیدہ بھی انہیں اصنامی روایات قدیمہ کی یادگار ہے اور کسی طرح اسے خالص اسلامی چیز نہیں کہہ سکتے۔

قرآن مجید ان میں سے کسی بات کی تصدیق نہیں کرتا اس لئے ایک مسلمان ان کے ماننے پر مجبور نہیں البتہ وہ لوگ جو احادیث کو قرآن سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں یا جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ قرآن بغیر احادیث کی مدد کے سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا، ایسا کہتے ہیں تو کہنے دیجئے۔

حدیث پر تاریخی و فنی گفتگو

(جناب سید ابو تراب صاحب حیدرآباد۔ دکن)

نگار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ احادیث کے قائل نہیں ہیں درانحالیکہ شریعت اسلامی کا نظام انہیں پر منحصر ہے اگر وقت و مہلت اجازت دے تو آپ اپنے تفصیلی خیالات اس باب میں قلمبند فرمائیے اور اسی کے ساتھ اگر ممکن ہو اصول حدیث اور فن حدیث پر بھی روشنی ڈالئے۔ مدعا یہ ہے

کہ اس بحث کے تمام پہلو سامنے آجائیں۔

ظہورِ اسلام سے قبل بھی اہلِ عرب کا قاعدہ تھا کہ وہ اپنے اسلاف و اکابر یا اب و جد کے مراسم و شعائر اور واقعات تاریخی و روایات محفوظ رکھا کرتے تھے اور ان سے ہٹنا معیوب سمجھا جاتا تھا ـــــ جب رسول اللہ مبعوث ہوئے اور عربستان کی ذہنی اور دماغی دنیا میں انقلاب عظیم برپا کر دیا تو اسی کے ساتھ اس عادت میں بھی تبدیلی پیدا ہوئی یعنی روایات قدیمہ کے محفوظ رکھنے کے بجائے رسول و صحابہ کے اقوال و افعال کی روایات کو زندہ رکھنے کی کوشش کی گئی اور یہ تھی اولین بنیاد فنِ حدیث کی۔

پھر چونکہ کسی واقعہ کی صحت کا دار و مدار زیادہ تر اس پر ہے کہ اس کے بیان کرنے والے نے خود اُسے دیکھا ہو یا اس سے قریب تر زمانہ میں پایا جاتا ہو اس لئے سب سے زیادہ معتبر راوی صحابہ مانے گئے جو رسول اللہ کے ساتھ ہر وقت اُٹھتے بیٹھتے اور سفر و حضر میں ساتھ رہتے تھے اس کے بعد تابعین کا درجہ قرار پایا جنھوں نے صحابہ کا زمانہ دیکھا تھا۔ اور پھر تبع تابعین کا جو تابعین کے دیکھنے والے تھے و ہلم جرا ـــــ اس لئے حدیث کے دو حصے ہو گئے ایک وہ جسے اسناد کہتے ہیں۔ دوسرا متن یعنی ایک حصہ وہ جس میں یہ بتایا جائے کہ کن کن راویوں کے ذریعہ سے روایت بیان کی گئی اور دوسرا حصہ خود اس واقعہ یا روایت کا۔ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ جب کوئی شخص کسی واقعہ کی روایت کرتا تھا تو اسے یہ بھی ثابت کرنا پڑتا تھا کہ واقعی رسول اللہ

نے ایسا فرمایا ایسا کیا اور اس کا ثبوت اس سے زیادہ کچھ نہ ہوتا تھا کہ وہ معتبر راویوں کا سلسلہ بیان کرے

اس امر کی تنقید کے لئے کہ جن راویوں کے سلسلہ سے حدیث بیان کی جاتی ہے وہ معتبر ہیں یا نہیں۔ اور یہ کہ اخلاقی و ذہنی اعتبار سے ان کا کیا مرتبہ ہے ایک علیحدہ فن کی بنیاد پڑی جسے فن رجال کہتے ہیں اور اس تنقید کا اصطلاحی نام "الجرح والتعدیل" قرار پایا۔

ظاہر ہے کہ تنقید کے سلسلہ میں بعض روایتیں زیادہ معتبر مانی گئی ہوں گی اور بعض کم۔ اس لئے راویوں کی حیثیت، الفاظ روایت کے اختلاف، اور سلسلۂ روایت کے لحاظ سے حدیث کی بہت سی تقسیمیں ہو گئیں۔

(۱) اگر راویوں کا پورا سلسلہ نہایت معتبر ہے اور حدیث میں کوئی بات عقیدۂ مروجہ کے خلاف نہیں ہے تو ایسی حدیث کو "صحیح" کہتے ہیں

(۲) اگر راویوں کے سلسلہ میں کوئی راوی کم درجہ کا ہے یا اسناد مکمل نہیں ہے تو ایسی حدیث کا نام "حسن" قرار پاتا ہے۔

(۳) اگر راوی مشتبہ ہے یا نفس روایت میں کوئی بات شبہ کی ہے تو ایسی حدیث کا نام ضعیف رکھا جاتا ہے۔

(۴) اگر راوی نے قول رسول کے الفاظ کے بجائے کہیں کہیں خود اپنے الفاظ استعمال کئے ہیں تو ایسی حدیث کو مدرج کہتے ہیں۔

(۵) اگر راوی صرف ایک ہے اور اس کی روایت ضعیف بھی جاتی ہے

تو ایسی حدیث کو متروک کہتے ہیں۔

(۷) اور اگر کوئی روایت بہ لحاظ روایت و مفہوم بالکل غلط پائی جاتی ہے تو اس کا اصطلاحی نام موضوع ہے۔

پھر چونکہ احادیث میں صرف رسول اللہ کے اقوال و افعال سے بحث نہیں کی جاتی بلکہ صحابہ و تابعین کے حالات و اقوال کی روایت کو بھی حدیث کہتے ہیں اس لئے ایک تقسیم اور ہوئی یعنی۔

(۱) اگر کسی حدیث میں رسول اللہ کا ذکر ہے تو اسے مرفوع کہتے ہیں۔

(۲) اگر صحابہ کے اقوال و افعال کا ذکر ہے تو اس کا نام موقوف ہوگا۔

(۳) اگر تابعین کے اقوال و افعال بیان کئے گئے ہیں تو اسے مقطوع کہتے ہیں۔

اسناد کے لحاظ سے ایک اور تقسیم احادیث کی کی جاتی ہے۔

(۱) اگر روایت کا نہایت معتبر و غیر منقطع سلسلہ کسی صحابی تک پہونچتا ہے تو اُسے مُسند کہتے ہیں

(۲) اگر راویوں کا سلسلہ اس طرح کا ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے قسم و حلف کے ساتھ ہاتھ پر ہاتھ مارکر روایت بیان کی ہے تو ایسی حدیث کو مسلسل کہتے ہیں۔ (مسلسل الحلف اور مسلسل الید)

(۳) اگر اسناد مکمل بھی ہیں اور مختصر بھی یعنی آخری راوی اور اول راوی کے درمیان بہت کم واسطے ہیں تو ایسی حدیث کو عالی کہتے ہیں۔

(۴) اگر راویوں کا سلسلہ غیر منقطع ہے تو ایسی حدیث کو متصل کہتے ہیں۔

(۵) اگر یہ سلسلہ بیچ میں سے ٹوٹ گیا یعنی تابعین کے سلسلہ کا کوئی راوی نہیں ہے تو منقطع کہتے ہیں۔

(۶) اگر کوئی بات رسول اللہ کے متعلق کسی تابعی نے بیان کی ہے اور اسے نہیں معلوم ہو سکا ہے کہ کس صحابی سے اس نے سنا ہے تو ایسی حدیث کو مرسل کہتے ہیں

(۷) اگر کوئی حدیث ایسی ہے جو "عن فلان" "عن فلاں" سے بیان کی گئی ہے یعنی صرف سماعی اسناد ہے تو اسے "معنعن" کہتے ہیں۔

(۸) اگر کسی حدیث میں کوئی ایک راوی بھی غیر متعین ہے تو اسے مبہم کہتے ہیں۔

اس کے علاوہ ایک اور تقسیم باعتبار طریق روایت بھی کی گئی یعنی ایک ہی روایت کتنے لوگوں نے علیحدہ علیحدہ بیان کی ہے پھر

(۱) اگر کوئی حدیث علیحدہ علیحدہ بہت سے لوگوں نے بیان کی ہے اور وہ سب ثقہ اور معتبر ہیں تو اسے متواتر کہتے ہیں۔

(۲) اگر کم از کم تین معتبر طبقے کے راویوں نے اسے بیان کیا ہے تو مشہور کہتے ہیں

(۳) اگر علیحدہ علیحدہ دو راویوں نے روایت کی ہے تو عزیز کہتے ہیں۔

(۴) اگر ایک ہی راوی ہے تو احاد کہتے ہیں۔

(۵) اگر صرف ایک تابعی نے روایت کی ہے تو غریب مطلق کہتے ہیں۔

ہر چند یہ تمام تقسیمیں جو بیان کی گئی ہیں ان پر تمام علما کا اتفاق نہیں ہے اور مفہوم کے لحاظ سے ائمہ فن باہم دگر مختلف ہیں لیکن ہمارا مقصود اس اظہار سے صرف یہ بتانا ہے کہ احادیث کی چھان بین کتنی کاوش سے کام لیا گیا اور رسول اللہ کے اقوال و

افعال کا صحیح علم حاصل کرنے کے لئے کس قدر بلیغ کوششیں صرف کی گئیں۔

اول اول دستور تھا کہ احادیث زبانی روایت سے حاصل کی جاتی تھیں یعنی اگر معلوم ہو جاتا تھا کہ کسی شخص کو کسی حدیث کا علم ہے تو شائقین اس کے پاس جاتے تھے اور اس سے سن کر یاد کر لیتے تھے یا یہ ہوتا تھا کہ راوی کسی حدیث کو بیان کرتا تھا اور لوگ اسے لکھ لیتے تھے اور دوبارہ اس کو سنا کر اگر کوئی غلطی ہوتی تو صحت کر لیتے تھے اور راوی اس کی شرح بھی بیان کر دیتا تھا پھر وہ لوگ جو احادیث اس طرح قلمبند یا یاد کر لیتے تھے وہ دوسروں کو اسی طور سے بتاتے تھے حتیٰ کہ رفتہ رفتہ زبانی روایت کا دستور بند ہو گیا اور تحریری روایت کا رواج قائم ہو گیا۔

جمع احادیث کی اول اول یہ صورت تھی کہ راوی یا رجال کے لحاظ سے اُن کی ترتیب قائم کی گئی اور ایسے مجموعہ کو مسند کہتے تھے چنانچہ اس سلسلہ میں "مسند احمد بن حنبل" خاص شہرت رکھتا ہے لیکن بعد کو متن کے مفہوم کے لحاظ سے ترتیب قائم کی گئی۔ اور ایسے مجموعوں کا نام "مصنف" قرار پایا اس کے مجموعوں میں بخاری، مسلم ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ خاص مرتبہ کی چیزیں سمجھی جاتی ہیں۔ علی الخصوص بخاری و مسلم جو صحیحین کے نام سے موسوم ہیں کہ اگر کوئی ایک بھی روایت ان دونوں میں پائی جائے تو پھر اس سے انکار کرنے کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہتی۔ حضرات شیعہ کے نزدیک صرف وہ روایات قابل اعتبار ہیں جو جناب علیؑ یا ان کے متبعین کی وساطت سے پہونچی ہیں چنانچہ اس اصول کے لحاظ سے حسب ذیل پانچ کتابیں ان کے یہاں مرتب ہوئی ہیں۔

(۱) الکافی محمد بن یعقوب الکلینی (۲) من لایحضرہ الفقیہ محمد بن علی بابویہ قمی کی۔
(۳) تہذیب الاحکام (۴) الاستبصار فی ما اختلف فیہ الاخبار محمد الطوسی کی۔ (۵)
نہج البلاغہ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اقوال جناب علی کا مجموعہ ہے۔ یہاں تک جو
کچھ لکھا گیا اُس سے آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ کتب احادیث کی تدوین میں کتنی کاوش
سے کام لیا گیا لیکن آپ حیران ہو جائیں گے جب میں یہ کہوں گا کہ باوجود اس تمام
حزم و احتیاط کے بھی کتب احادیث کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں اور ان پر آنکھ بند
کرکے اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے متعدد وجوہ ہیں۔ تاریخی و سیاسی بھی اور نفسیاتی بھی
جس وقت آپ غور کریں گے کہ روایت حدیث کی ابتدا کب سے ہوئی تو
آپ کو ماننا پڑے گا کہ یہ زمانہ وہ تھا جب رسول اللہ کی وفات کے بعد اسلام کا دائرہ
اثر وسیع ہوتا جا رہا تھا اور اس کی سلطنت و حکومت پھیلتی جا رہی تھی۔ مسیحی مذہب کے
پیرو، موسوی مسالک کے متبعین، فلسفۂ یونان کے ماننے والے، ایران کے آتش پرست،
اور بودھ مذہب کے تارک الدنیا لوگ، سبھی سے مسلمانوں کو واسطہ پڑ رہا تھا اور
ان سب کے تمدن و اخلاق، مذہب و اعتقاد کے مقابلہ میں ان کو اسلام کا مطالعہ
کرنا اور شریعت اسلامی کا منضبط کرنا ضروری تھا پھر ظاہر ہے کہ انھیں بات بات
میں غور کرنے کی ضرورت ہوتی ہوگی کہ رسول اللہ کا فلاں امر میں کیا طرز عمل تھا۔
کیا ہدایت فرمائی تھی اور یہی وہ چیز تھی جس نے روایت احادیث کی بنیاد ڈالی۔
پھر چونکہ رسول کی آنکھ بند ہوتے ہی لوگوں میں باہم اختلافات پیدا ہو گیا اور ہر جماعت
اپنی تائید میں رسولؐ ہی کی حدیث کو پیش کرنا زیادہ مؤثر جانتی تھی اس لئے یہ کہنا

بے جا نہ ہوگا کہ رسول اللہ کی وفات کے بعد ہی روایت حدیث و وضع حدیث کی بنیاد پڑ گئی تھی کیونکہ جب دو مخالف جماعتوں میں سے ہر ایک اپنی موافقت میں حدیث پیش کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ ان میں سے ایک ضرور جھوٹی ہوگی اگر دونوں نہ ہوں۔ پھر صحابہ کے بعد جب عہد بنی امیہ و بنی عباس میں مصالح سیاسی کے لحاظ سے ہر ایک جماعت کو اپنی تائید میں بہت زیادہ ضرورت نقل احادیث کی پڑی تو اس وقت مستقل ٹکسالیں وضع حدیث کی قائم ہوگئیں اور حکومت کے اثر اور روپیہ کے زور سے جس امیر و خلیفہ نے جس قسم کی حدیث کی ضرورت ہوئی فوراً ڈھلوا لی۔ چنانچہ کتب تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ خود امراء کے پاس جا جا کر کہا کرتے تھے کہ اگر کسی حدیث کی ضرورت ہو تو مہیا کر دی جائے اسی کے ساتھ چونکہ حدیث روایت کرنے والوں کی سوسائٹی میں بہت عزت کی جاتی تھی اس لئے لوگوں میں بالطبع یوں بھی اس طرف رغبت پیدا ہوئی۔

اسی سلسلہ میں نفس روایت کی اہمیت پر بھی غور کرنا ضروری ہے یعنی جو احادیث روایت کی گئی ہیں وہ بالفاظ رسول روایت ہوئی ہیں یا صرف مفہوم لے لیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ کتب احادیث کی تدوین رسول اللہ کے کم از کم دو سو سال بعد شروع ہوئی ہے اور یہ امر کسی طرح قرین عقل و قیاس نہیں کہ اتنے زمانہ کے بعد درجنوں راویوں کے ذریعہ سے جو روایتیں فراہم کی گئی ہیں ان کا مفہوم بھی وہی باقی رہا ہوگا جو رسول اللہ کا مقصود تھا، چہ جائیکہ الفاظ نبوی ۔۔۔۔۔۔

ہمارا روز کا تجربہ ہے کہ ایک ہی بات مختلف لوگوں کی زبان سے

خدا معلوم کیا سے کیا ہو جاتی ہے اور ہر راوی اپنی عقل آرائی سے کام لے کر اصل مفہوم میں ضرور کچھ نہ کچھ تصرف کر دیتا ہے۔

غور فرمایئے کہ رسول اللہ چار آدمیوں کے سامنے کسی وقت کوئی بات ارشاد فرماتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ اس کا ایک مفہوم قرار دے کر اس کی روایت کرتا ہے پھر کیا یہ ممکن ہے کہ سب کے سب کسی ایک بات پر متفق ہوں یا سب نے رسول اللہ کا حقیقی مدعا معلوم کر لیا ہو یا ان کے الفاظ یاد رکھے ہوں۔ پھر اسی کے ساتھ جس وقت اس امر پر غور کیا جائے گا کہ اس وقت رسول اللہ کا لب ولہجہ کیا تھا۔ کسی سلسلۂ سخن میں کیا بات ارشاد ہوئی تھی آپ کا روئے سخن کس طرف تھا تو یہ الجھنیں اور زیادہ بڑھ جاتی ہیں اور کبھی کسی حدیث کے متعلق یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ رسول اللہ ہی کا ارشاد ہے۔ یہی سبب تھا کہ متقدمین صحابہ میں بعض سرے سے روایت حدیث ہی کو پسند نہ کرتے تھے اور بعض محدثین نے روایت بالمعنی کو کبھی جائز قرار نہیں دیا لیکن ضرورت زمانہ نہ روایت احادیث سے لوگوں کو باز رکھ سکی اور نہ روایت بالمعنی کی روک تھام ہو سکی۔

رسول اللہ کے بعد تاریخ اسلام میں جتنی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں، آپ کی آنکھ بند ہوتے ہی خلافت کے مسئلہ میں دو گروہ پیدا ہو گئے اور ہر چند بظاہر ان میں کوئی تصادم تو نہیں ہوا لیکن اصول دونوں کے علیحدہ تھے۔ خلیفہ اول کے بعد جب خلیفہ دوم کے انتخاب کا وقت آیا تو اس اختلاف میں اور زیادہ قوت پیدا ہو گئی، یہاں تک کہ خلیفہ ثالث کے زمانہ میں یہ پوری طرح نمایاں

ہوگیا اور خلیفۂ چہارم کے عہد میں کھلم کھلا ٹھن گئی۔ پھر غور فرمائیے کہ جب آپنی مختلف جماعتیں موجود ہوں اور علویین وخوارج، اموئین وعباسئین وغیرہ کے متصادم اغراض نے شیرازہ کو درہم برہم کر رکھا ہو اور ایک ہی سرزمین کے باشندے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں تو ایسے زمانہ میں احادیث کی روایت کیا اہمیت رکھ سکتی ہے جبکہ ہر ایک اپنی موافقت میں احادیث ہی کو پیش کرتا تھا۔ اسلام میں نماز سے زیادہ اہم عبادت کوئی نہیں جسے رسول اللہ روزانہ متعدد بار ادا کرتے تھے لیکن انہیں اختلاف روایات کی وجہ سے آج ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ رسول اللہ رات دن میں کتنی بار نماز پڑھتے تھے اور کس طرح پڑھتے تھے۔ کوئی کہتا ہے کہ آپ ہاتھ کھول کر ادا کرتے تھے اور کوئی ہاتھ باندھ کر ادا کرنے کا قائل ہے کوئی رفع یدین کرتا ہے کوئی نہیں۔ کوئی آمین بالجہر کا مؤید ہے کوئی مخالف۔ پھر جب نماز ایسی اہم چیز کا صحیح حال انہیں اختلاف احادیث کی وجہ سے نہ معلوم ہو سکا تو اور دوسری باتوں کا کیا ذکر۔

آپ صحیحین کو اٹھا کر دیکھئے جو سنیوں میں نہایت اہم کتابیں حدیث کی سمجھی جاتی ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ اہم ترین مسائل میں بھی باہمدگر متعارض ومخالف احادیث ان میں پائی جاتی ہیں، چہ جائیکہ فروعی مسائل کہ اگر ان میں کوئی شخص احادیث کی پابندی کرے تو ایک ہی وقت میں کافر ومسلمان دونوں بن سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ امام بخاری وغیرہ نے وہی احادیث جمع کی ہیں جو ان کے اعتقاد ویقین کے مطابق صحیح تھیں اور یہ بھی درست ہے کہ انھوں نے کافی تحقیق وتنقید

سے کام لیا لیکن یہ دعویٰ کرنا کہ اب اس میں چون و چرا کی گنجائش باقی نہیں ہے اسی وقت درست ہو سکتا ہے جب یہ مان لیا جائے کہ جتنی عقل و فراست تھی وہ سب بخاریؔ پر ختم ہو گئی اور ان کے بعد کوئی صاحب عقل پیدا ہی نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے لیکن اگر یہ تسلیم کرنا بجائے خود عقل کے منافی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آج بھی کتب احادیث تنقید کا محل نہ قرار پائیں اور آنکھ بند کر کے ان کو تسلیم کر لیا جائے خواہ وہ کتنی ہی معارض کتنی ہی خلاف عقل اور کتنی ہی مضحکہ خیز کیوں نہ ہوں۔

روایت کے ساتھ ساتھ ائمہ فن نے چند اصول درایت بھی مقرر کر لئے ہیں چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب نے عجالہ نافعہ میں جن اصول درایت کا ذکر کیا ہے ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ:۔

(۱) اگر کوئی روایت تاریخ مشہور کے خلاف ہو تو صحیح نہیں۔

(۲) اگر وقت و حال کا قرینہ اس کے خلاف ہو تو بھی باور نہ کرنا چاہئے۔

(۳) اگر مقتضائے عقل و شرع کے خلاف ہو تو بھی ایسی حدیث قابل اعتبار نہیں۔

(۴) اگر کوئی بات ایسی بیان کی جائے جو رسول اللہ کے اخلاق کے منافی ہے تو بھی اسے رد کر دینا چاہئے۔

اسی طرح امام سخاوؔی نے ابن جوزیؔ سے جو اصول درایت بیان کئے ہیں وہ بھی قریب قریب اسی کے ہیں لیکن آپ کتب احادیث کو اٹھا کر دیکھئے اور خود فیصلہ کیجئے کہ ان میں کتنی حدیثیں اصول درایت کے معیار پر ٹھیک اترتی ہیں، شاید ہزار میں دس بیس۔

اگر احادیث کی تقسیم ان کے مطالب کے لحاظ سے کی جائے تو حسب ذیل بڑی بڑی تقسیمیں ہو سکتی ہیں۔

۱۔ تعلیم عقائد و عبادت و اخلاق۔
۲۔ پیشین گوئیاں اور قصص و حکایات۔
۳۔ احکام شریعت یا معاشری قانون۔
۴۔ مابعد الطبیعیات (یعنی حیات بعد الموت اور دوزخ و جنت، عذاب ثواب وغیرہ وغیرہ۔)

ظاہر ہے کہ ان ابواب میں سب سے زیادہ محفوظ و ناقابل اعتراض باب اگر ہو سکتا ہے تو پہلا ہے لیکن افسوس ہے کہ وہ بھی اپنی جزئیات میں اختلافات سے خالی نہیں اور روایتاً و درایتاً اس پر بھی تنقید ہو سکتی ہے۔

دوسرا باب بالکل اسرائیلی روایات سے بھرا ہوا ہے اور چونکہ عیسوی و موسوی مذہب کے اثرات رسول اللہ کے بعد بھی بہت کچھ باقی تھے اس لئے لوگوں نے ان مذاہب کی روایتوں کو نقل کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا اور اُن کی توثیق کے لئے ان روایتوں کو رسول اللہ سے منسوب کر دیا۔ پیشین گوئیوں کی حدیثیں جتنی ہیں وہ سب ناقابل اعتبار ہیں کیونکہ ہر زمانہ میں ہر شخص نے اپنے اغراض و مقاصد کے لحاظ سے ایسی حدیثیں گھڑ کر مطلب براری کرنا چاہی ہے۔

احکام شریعت کے متعلق بھی احادیث میں بکثرت اختلافات و تضاد پایا جاتا ہے اور اسی لئے اسلام کی فقہ میں کئی اسکول ہو گئے ہیں۔ پھر چونکہ ہر اسکول اپنی تائید

میں احادیث ہی پیش کرتا ہے اس لئے لامحالہ ان سب کو موضوع قرار دیا جائیگا کیونکہ اب یہ معلوم کرنا دشوار ہے کہ واقعی رسول اللہ نے کیا ارشاد فرمایا تھا۔

وہ احادیث جو ما بعد الطبیعیات سے متعلق ہیں وہ بھی یکسر موضوع ہیں اور اسلام میں جو غیر مذاہب کے عناصر شامل ہو گئے تھے ان کے زیر اثر یہ سب کچھ بعد کو بڑھایا گیا ہے کیونکہ اس سلسلہ میں جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ اس سے مختلف نہیں ہے جو مذاہب قدیمہ کے خرافیات میں پایا جاتا ہے۔

ان حالات کے تحت اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ یا تو تمام کتب احادیث کو سامنے رکھ کر از سر نو جدید معیار تنقید کے لحاظ سے پوری طرح ریسرچ کیا جائے اور جو واقعی جو احادیث رسول کی ہوں انھیں متعین رکھ کر باقی کو نظرانداز کر دیا جائے اور اگر یہ ممکن نہیں ہے (اور یقیناً ممکن نہیں ہے کیونکہ ہمارے یہاں کے علماء کو نہ اس کا سلیقہ ہے نہ ضرورت) تو پھر محفوظ صورت یہ ہے کہ اسلام و اصول اسلام کا مطالعہ احادیث سے بالکل علیحدہ ہو کر کیا جائے۔

کسی قول یا فعل کو رسول اللہ سے منسوب کر دینا بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ دوسری تیسری صدی ہجری میں امام بخاری وغیرہ تو اس کو بیباکانہ انجام دے سکتے تھے جب عقول انسانی زیادہ ترقی یافتہ نہ تھیں اور مذہب کے مفہوم سے قدامت پرستی وہم پرستی جدا نہ ہوئی تھی لیکن آج اس زمانہ میں جبکہ علوم و فنون کی ترقی نے خدائی کے ہزاروں چھپے ہوئے راز بے نقاب کر دئے ہیں یہ کیونکر ممکن ہے کہ کوہ قاف کے متعلق رسول اللہ کی یہ حدیث کیونکر باور کرلیں گے کہ وہ ایک زمرد

کا پہاڑ ہے جس کے انعکاس سے آسمان نیلگوں نظر آتا ہے اور جس کے چاروں طرف فرشتے زنجیریں ڈالے ہوئے بیٹھے ہیں اور جب زنجیریں کھینچتے ہیں تو زلزلہ آجاتا ہے۔

پھر چونکہ کتب احادیث اسی قسم کی خلاف عقل باتوں سے بھری پڑی ہیں اسلئے اب دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں یا تو انھیں رسول اللہ سے منسوب کرکے رسول اللہ کی توہین کیجئے یا احادیث سے قطع نظر کرکے منکر بخاری ہونے کا الزام گوارا فرمایئے میں چونکہ رسول اللہ کی ذات گرامی کو بخاری وغیرہ سے ارفع سمجھتا ہوں اس لئے ظاہر ہے کہ میں احادیث کا قایل کیوں کر ہو سکتا ہوں۔

مذہب و مذہبیات

(جناب سید احمد صاحب نظر حسینی علم سرائے بوہرہ، حیدر آباد دکن)

میں آپ سے ایک مختصر سوال کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں سیکڑوں مذہب وجود میں آئے اور فنا بھی ہوئے۔ اقوام عالم نے ہزاروں قوانین بنائے اور مٹا ڈالے ہر قوم نے اپنے اخلاق کا ایک جداگانہ معیار قائم کیا لیکن کسی مذہب نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ دین فطرت ہے اور نہیں بھی ان کے مطالعہ سے یہی معلوم ہوا کہ ان کے پیش کردہ مذہب کی صورت سے دین فطرت ہونے کی صلاحیت ظاہر نہیں ہوتی البتہ اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دین فطرت ہے اور اس کا غائر مطالعہ

کرنے سے اس میں جامعیت اور فطرت کے عین مطابق بننے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔

اسلام کا یہ دعویٰ بھی کردہ آدم سے تا ایندم موجود ہے صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ زمانہ صداقت سے خالی نہیں رہا کرتا البتہ اقوام عالم نے غلطی سے مذہب کے خط و خال مٹا کر بزعم خود مذہب کو ایک نئی صورت میں ڈھال دیا اور بعد میں گمراہ ہو گئے۔

وجہ تحریر ہذا یہ ہے کہ میں جناب کے خاص خیالات اس مسئلہ پر معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آیا جو صورت اسلام کی پیش نظر ہے وہی اصلی ہے جسے آپ مولویوں کے اسلام کے نام سے تعبیر فرماتے ہیں یا کوئی اور بصورت ثانی کیا اس وقت اسی غلطی کا اعادہ تو نہیں ہو رہا ہے جو گزشتہ اقوام نے کی تھی۔ اور جو بالآخر گمراہی پر منتج ہوئی۔ اس مسئلہ پر بھی غور کرنا ضروری ہے کہ آیا مذہب کو دنیا کا ساتھ دینا چاہیے یا دنیا کو مذہب کا۔ اس لئے انسانی فطرت میں یہ داخل ہے کہ ہمیشہ کامل آزادی چاہتا ہے پھر اخلاق و قانون کی بندش جس کی بنیاد مذہب کے اصول پر رکھی جاتی ہے ضروری ہے یا نہیں اور ایسی تجدید جو مذہب قائم کرتا ہے انسان کے لئے مفید ہے یا مضر۔ علمائے مذہب و اسلام نے کیا ایسی تحدید کو معتبر بتایا ہے یا کامل آزادی کو ضروری قرار دیا ہے۔ براہ کرم نگار کے ذریعہ ان مسائل پر روشنی ڈالئے تو عنایت ہو۔

آپ نے اپنے استفسار کے ذریعہ سے معناً و کنایۃً چند دعوے پیش کئے ہیں۔

ایک۔ یہ کہ تمام مذاہب عالم میں اسلام ہی نے فطری دین ہونے کا دعویٰ کیا اور غائر مطالعہ کرنے سے بھی اس کا یہ دعویٰ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

دوسرا۔ یہ کہ اسلام کا وجود "از آدم تا ایندم" دنیا میں ہمیشہ پایا گیا لیکن اقوام عالم غلطی سے اس کی صورت مسخ کرتے رہے۔

تیسرا۔ یہ کہ اگر زمانۂ حال کے مولویوں کے بتائے ہوئے اسلام کو اصلی سمجھا جائے تو یہ غلطی وگمراہی ہوگی اور

چوتھا۔ یہ کہ دنیا کو مذہب کا ساتھ دینا چاہئے۔ مذہب دنیا کا ساتھ دینے پر مجبور نہیں ہے۔

قبل اس کے کہ میں آپ کے ان دعاوی پر کوئی تنقید کروں مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے "دین فطرت" کا کوئی مفہوم متعین کر لیا جائے۔

غالباً آپ کو اس سے انکار نہ ہوگا کہ "دین فطرت" سے مراد وہی دین ہو سکتا ہے جو "فطرت انسانی" کے اقتضا کے مطابق واقع ہو یا بالفاظ دیگر یوں کہیئے کہ جس میں فطرت انسانی کی اصلاح کی اہلیت پائی جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ فطرت انسانی کا اقتضا کیا ہے اور اس کی اصلاح و ترقی کیا معنی رکھتی ہے

اس سلسلہ میں جب آپ تاریخ عالم کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ انسان ترقی کی جس منزل سے گزر رہا ہے وہ اسے دفعتاً حاصل نہیں ہوئی بلکہ لاکھوں سال کے تدریجی ارتقار کا نتیجہ ہے۔ ایک زمانہ تھا جب وہ درندوں اور جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کے بعد حجری عہد آیا جب پتھر کے آلات واوزار تیار کر کے تمدن کی بنیاد اس نے قائم کی۔ پھر اس نے اور ترقی کر کے کاشت و زراعت

شروع کی یہاں تک رفتہ رفتہ اس نے اپنے ذہن و دماغ سے کام لے کر مشینیں ایجاد کیں، جہاز بنائے، ریل تیار کی بجلی کو اپنے قابو میں کیا اور تمام موجودات عالم پر مالکانہ متصرف ہوگیا۔

اچھا فرض کیجئے کہ مذہب ہمیشہ سے ہر زمانہ میں موجود رہا ہے جیسا کہ آپ نے دعویٰ کیا ہے، اور کوئی نہ کوئی نبی یا پیغمبر ہر دور میں پایا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ نبی یا مصلح اپنے ہی دور کے انسانوں میں سے منتخب ہوتا ہوگا۔ اور یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ عہد وحشت کے انسانوں کا پیغمبر عہد حجری کا انسان رہا ہو یا عہد حجری کا پیغمبر عہد فوقانی کے انسان کی طرح ہو۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ مذاہب عالم میں جو تدریجی ترقیاں ہوئی ہیں وہ بھی انسان کے ذہنی ارتقاء کی پابند تھیں۔ جب انسان بالکل وحشی تھا تو اس عہد وحشت کے پیغمبر نے اس کو بت پرستی سکھائی اس کے بعد جب انسان آہستہ آہستہ متمدن ہوتا گیا تو پیغمبروں کی تعلیم بھی اسی کے ساتھ بدلتی گئی یہاں تک کہ وہ خدا جو کسی وقت صرف پتھر کی مورت تھا زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو کر ایک مجرد قوت میں تبدیل ہوگیا۔

اس بیان سے آپ کے چاروں دعووں کی تردید ہوگئی لیکن بہ خیال مزید وضاحت میں سلسلہ وار آپ کے ہر دعوے کو لے کر بتانا چاہتا ہوں کہ بدقسمتی سے آپ کسی بات میں صحیح نتیجہ پر نہیں پہونچے۔

۱۔ آپ کا یہ کہنا کہ تمام مذاہب عالم میں اسلام ہی نے فطری ہونے کا دعویٰ کیا اور بنا بریں مطالعہ سے بھی اس کا یہ دعویٰ صحیح معلوم ہوتا ہے بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ جو مذہب

جس زمانہ میں پیدا ہوا وہ اسی زمانہ کے انسانوں کے عقول وا ذہان کے مطابق پیدا ہوا اور اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اُسے فطری نہ کہا جائے کیونکہ فطرت انسانی زیادہ سے زیادہ جس خیال کو قبول کر سکتی تھی اسی کو مذہب نے پیش کیا اور اس سے آگے مذہب بڑھ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ مذہب کے مبلغ بھی تو آخر اسی دور کے ہوا کرتے تھے اور وہ اس حد سے آگے کیونکر بڑھ سکتے تھے جس حد تک انسان کی ذہنی ترقی اُن کے دور میں ہو چکی تھی ۔

(۲) آپ کا یہ فرمانا کہ اسلام کا وجود آدم سے تا ایندم دنیا میں ہمیشہ پایا گیا ہے لیکن اقوام عالم غلطی سے اس کی صورت مسخ کرتے رہے بالکل میری سمجھ سے باہر ہے۔ اگر میں آپ کے اس دعوے کو تسلیم کر لوں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اسلام اول اول بت پرستی کی شکل میں پیدا ہوا تھا اور بعد کو لوگوں نے اس سے منحرف ہو کر بت پرستی کی مخالفت شروع کر دی۔ اور اگر آپ یہ فرمائیں کہ اسلام نے بت پرستی کی تعلیم کبھی نہیں دی تو پھر آپ ہی بتائیے کہ انسان کے عہد وحشت میں وہ کس صورت میں پایا جاتا تھا البتہ اگر آپ کہیں کہ اسلام نام ہی اس مذہب کا ہے جو مختلف زمانوں میں حالات کے لحاظ سے مختلف صورتوں میں نمودار ہوتا رہا تو بیشک یہ ایک حد تک صحیح ہو سکتا ہے لیکن پھر اس کے ساتھ آپ کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اگر جاہل و وحشی انسان کے ابتدائی دور میں وہ بت پرستی تھا تو انتہائی دور ارتقا میں انکار خدا کی حد تک پہونچ سکتا ہے اگر عقول انسانی یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کرے ۔

(۳) آپ کا یہ دعویٰ کہ زمانہ حال کے مولویوں کا بتایا ہوا مذہب عین اسلام ہے

اور اس سے جتنا غلطی و گمراہی بہت کچھ بحث و تنقید چاہتا ہے لیکن گفتگو کو مختصر کرنے کیلئے آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ زمانہ حال کے مولویوں کا بتایا ہوا مذہب کونسا ہے؟ کیا یہ مذہب وہ ہے جو سنیوں کے مولویوں نے بتایا ہے؟ کیا یہ مذہب وہ ہے جسے شیعہ جماعت کے مجتہدوں نے ظاہر کیا ہے؟ کیا یہ مذہب وہ ہے جس کی تبلیغ وہابی مولوی کرتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس کے جواب میں آپ اپنے ہی مسلک کے مولوی کی نشاندہی کریں گے ورانحالیکہ آپ کا وہی مولوی جو دوسرے مسلک والوں کے نزدیک جو یقیناً خود بھی مسلمان ہیں بالکل گمراہ ہے۔ پھر بتائیے کہ وہ شخص جو واقعتاً یہ سمجھنا چاہتا ہے کہ اسلام کا صحیح مفہوم کیا ہے اس صورت میں کیا کرے گا۔ وہ مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کے مذہبی لٹریچر کو دیکھے گا اور جب اسے معلوم ہوگا کہ ہر مسلک دوسرے مسلک کو برا کہنے کے لئے کوئی نہ کوئی دلیل ضرور رکھتا ہے تو لامحالہ وہ سب سے متنفر ہو جائے گا اور یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوگا کہ یہ تمام مسالک لغو ہیں

اس وقت آپ اسلام کا کوئی مفہوم ایسا متعین نہیں کر سکتے جس پر تمام جماعت اسلامی کو اتفاق ہوا اور اس لئے اب آپ ہی بتائیے کہ اسلام کسے کہتے ہیں اور کس مولوی کا بتایا ہوا اسلام قابل اعتبار ہے۔

اتنی گفتگو کے بعد آپ کا چوتھا دعویٰ از خود باطل ہو جاتا ہے کیونکہ جب تک تمام دنیا کسی ایک مذہب کی پابند نہ ہو جائے یہ کہنا کہ دنیا کو مذہب کا ساتھ دینا ضروری ہے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ بیشمار مذاہب میں سے کسی ایک مذہب کو اگر چن بھی لیا جائے تو بیکار ہے کیونکہ نوع انسانی کا اختلاف دیگر مذاہب کی وجہ سے

بہرحال باقی رہے گا اور اس صورت میں مذہب کی پابندی بجائے مفید ہونے کے مضرت رساں ثابت ہوگی اور جنگ کا دروازہ ہر وقت ہر جماعت کے لئے کھلا رہے گا۔

علاوہ اس کے یوں بھی دنیا کو مذہب کا ساتھ دینے پر مجبور سمجھنا بالکل خلاف حقیقت اور فطرت کے منافی ہے کیونکہ مذہب خود ہمیشہ انسانی دماغ کے رجحانات کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے اور اگر وہ انسان کی ترقی تمدن و معاشرت کا ساتھ دینے کا اہل نہیں ہے تو اس کا عدم وجود برابر ہے۔

اسلام میں اگر کوئی خصوصیت پائی جاتی ہے تو صرف یہی کہ وہ زمانہ کا ساتھ دینے والا ہے اور اسی لئے اس کو دین فطرت کہہ سکتے ہیں لیکن اس صورت میں آپ اس کو کسی ایک سطح پر قائم نہیں رکھ سکتے نہ کوئی خاص مفہوم اس کا متعین کر سکتے ہیں وہ زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتا رہے گا۔ انسانی عقول کے ساتھ خود بھی ترقی کرتا رہے گا اور جس طرح وہ اس وقت اسلاف کی کتابوں میں ڈھونڈھے سے کہیں نہیں مل سکتا بالکل اسی طرح وہ مستقبل میں حال کے لٹریچر سے غائب ہو جائے گا کیونکہ اسلام نے نوع انسانی کی ترقی و استعداد کا عروج و ارتقاء کا اور اس سانچہ میں ڈھل جانے کا جو زمانہ کا اقتضا رہے ——— اور اگر مولوی واقعی کوئی مفہوم اسلام کا اتنا وسیع پیش کر سکتا ہے تو آپ کیا سارا زمانہ اس کے ماننے کے لئے طیار رہے ورنہ یوں محض ذکر حور و قصور کی ترغیب اور دوزخ و جہنم کی تخویف سے تو اب یہ کارگاہ مینائی چلتا ہوا نظر نہیں آتا۔ ایک مذہب کا صحیح فریضہ روحِ عمل پیدا کرنا ہے لیکن روح عمل سے

مراد عبادت نہیں کہ یہاں نمازیں پڑھو اور وہاں حوریں لو، بلکہ ایک عزم کے ساتھ اٹھ کھڑا ہونا مراد ہے۔ زمین کے سینہ کو چیر کر اس کے اندر چھپی ہوئی سعادت و برکت حاصل کر لینا اور فکر و تدبر سے کائنات پر چھا کر عناصر عالم پر حکمرانی کرنا مقصود ہے یہیں اسی دنیا میں، اسی زندگی میں، اسی سرزمین پر اور اسی وقت۔ پھر اگر اسلام کا واقعی یہی مفہوم ہے اور "انتم الاعلون ان کنتم مومنین" کی تعلیم سے یہی مقصود ہے تو آئندہ کبھی اس کا خیال بھی دل میں نہ لائیے کہ مذہب زمانہ کا ساتھ دینے پر مجبور نہیں اور مولویوں کا بتایا ہوا اسلام صحیح ہے لیکن اگر اسلام کا مفہوم یہ نہیں ہے اور "انتم الاعلون" سے یہاں کی ذلت و نکبت اور وہاں کی "اعلیٰ علیین" مراد ہے تو آپ کو آپ کا اسلام مبارک ہو، تنہا جنت میں جا کر مزے اڑائیے اور ہمیں دوزخ میں رہنے دیجئے کہ فردوس کی جامد زندگی سے جہنم کی پر اضطراب زندگی بدرجہا بہتر ہے۔

مہدوی جماعت اور امام مہدی

(جناب محمد ابراہیم صاحب، اعظم جاہی روڈ، حیدرآباد دکن)

یہاں حیدرآباد میں ایک جماعت مہدوین کے نام سے پائی جاتی ہے براہ کرم مطلع فرمائیے کہ ان کی کیا اصلیت ہے اور کہاں کہاں پائی جاتی ہے اسی کے ساتھ اس مسئلہ پر بھی روشنی ڈالیے کہ امام مہدی کا ظہور کیا حقیقت رکھتا ہے"

(۱) جونپور میں ایک صاحب سید محمد مہدی وسط نویں صدی کے آخر میں پائے جاتے تھے اور یہ اپنے آپ کو "مہدی موعود" کہتے تھے۔ ان کی یہ تبلیغ چونکہ گجرات میں شروع ہوئی تھی اس لئے احمد آباد اور دیگر بلاد گجرات میں ان کے ارادتمند معقول تعداد میں پیدا ہوگئے۔ ان کے متبعین کا عقیدہ ہے کہ وہ صاحب معجزات بھی تھے یہاں تک کہ مردوں کو زندہ کرسکتے تھے، گونگوں بہروں کو اچھا کردیتے تھے

کچھ عرصہ تک تو یہ جماعت بغیر کسی روک ٹوک کے اپنے عقائد کا اعلان کرتی رہی لیکن شاہ مظفر اول والی گجرات نے سخت گرفت شروع کی اور ان میں سے بعض کو پکڑ کر قتل بھی کر دیا۔ اس کے بعد اورنگ زیب نے بھی جب وہ احمد آباد کا گورنر تھا ان کو سزائیں دیں نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں نے تقیہ شروع کر دیا اور اب تک یہ لوگ اسی کے عادی ہیں۔

اسی جماعت کے افراد بمبئی، دکن، سندھ، گجرات اور کہیں کہیں شمالی ہند میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ سید محمد مہدی۔ مہدی موعود اور آخری امام تھے شادی و موت کے وقت ان کے یہاں خاص مراسم ادا کئے جاتے ہیں جو عام مسلمانوں کے مراسم سے علیحدہ ہیں۔

(۲) لفظ مہدی جس کے معنی "ہدایت یافتہ" کے ہیں کلام مجید میں تو کہیں نہیں پایا جاتا لیکن یوں احادیث وتاریخ میں کثرت سے نظر آتا ہے لغوی معنی میں اس کا استعمال تو اکثر لوگوں پر ہوا ہے۔ چنانچہ خلفائے اربعہ کو بھی "الراشدون المہدیون" کے لقب سے یاد کیا گیا ہے اور اہل سنن نے حضرت علی کا ذکر بھی "یا ۱۰ مہد ..." کر

الفاظ سے کیا ہے۔ اسی طرح جریر نے حسان بن ثابت کو مہدی کے لقب سے پکارا اور امام حسین کو سلیمان "مہدی ابن مہدی" کہتا تھا۔ یہاں تک کہ خلفاء بنی امیہ کے نام کے ساتھ بھی ان کے ہواخواہوں نے مہدی کا لفظ اضافہ کیا۔ الغرض لغوی معنی میں اظہار عزت و احترام کے لئے یہ لفظ بہت سے امراء و خلفاء کے لئے استعمال کیا گیا لیکن مہدی موعود کہ یا مہدی منتظر اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

یہ حیثیت سب سے پہلے جناب حسین کے قتل کے بعد محمد الحنفیہ کو دی گئی جو جناب امیر کے فرزند تھے (دوسری بیوی سے) تھے۔ ان کو مختار ابی ابن عبید نے دعویدار خلافت کی حیثیت سے پیش کرکے "مہدی ابن الوصیؑ" کے لقب سے مشہور کیا۔ ہر چند انھوں نے خود اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھا لیکن اس طرح ایک فرقہ کیسانیہ کی بنیاد ضرور پڑ گئی۔ اور یہیں سے سلسلۂ امامت میں شیعی جماعت کے دو گروہ ہو گئے۔ ایک وہ جس نے محمد الحنفیہ کی امامت کو تسلیم کرکے انھیں مہدی منتظر سمجھا اور دوسرا اثنا عشری گروہ جو محمد الحنفیہ کی امامت کو اس لئے تسلیم نہیں کرتا کہ خاندان نبوت سے ان کو کوئی واسطہ نہ تھا۔ مہدی کا عقیدہ ان کے یہاں بھی ہے لیکن وہ اس طرح کہ وہ چھپے ہوئے ہیں اور ابھی تک ظاہر نہیں ہوتے۔

چونکہ اس وقت دعویداران خلافت کی کمی نہ تھی اور نیم سیاسی اور نیم مذہبی جماعتیں اُبھر رہی تھیں اس لئے اپنی حقانیت کو ثابت کرنے کے لئے ان میں سے ہر ایک کوئی نہ کوئی بات ایسی پیش کرتی تھی جس کا تعلق فرمان رسول سے ہو اور اسی سلسلہ کی چیز ظہور مہدی کا بھی مسئلہ تھا۔

اہل تسنن کے یہاں ظہور مہدی کا عقیدہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور بخاری و مسلم میں کسی جگہ مہدی کا ذکر نہیں ہے عقاید کی کتابوں میں بھی کسی جگہ اس سے بحث نہیں کی گئی۔ البتہ دجال کا ظہور اور نزول عیسیٰ کا بیان ضرور پایا جاتا ہے جس کا مہدی موعود سے کوئی تعلق نہیں۔

ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں اس مسئلہ میں نہایت محققانہ گفتگو کی ہے۔ اور اس نے ثابت کیا ہے کہ ابتدائی حدیث کی کتابوں میں اسی قسم کی کوئی روایات نہیں پائی جاتی اور یہ خیال بعد کو پیدا ہو کر وضع احادیث کا سبب بنا۔ ابن خلدون نے ۲۴ احادیث اس موضوع کی جمع کر کے ان پر تنقید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ ان میں کوئی ایک بھی ایسی نہیں ہے جس پر اعتماد کیا جاسکے۔

بعض روایات کی تفسیر سے جو حالات مہدی موعود کے معلوم ہوتے ہیں یہ ہیں کہ وہ آل فاطمہ سے ہوں گے۔ ان کا نام وہی ہوگا جو رسول کا ہے اور ان کے باپ کا نام بھی وہی ہوگا جو رسول اللہ کے والد کا تھا خلق میں رسول اللہ سے مشابہ ہوں گے چندیا کے بال صاف ہوں گے۔ ناک اونچی اور جھکی ہوئی ہوگی جس وقت وہ ظاہر ہوں گے دنیا میں فتنہ و فساد پھیلا ہوگا یہاں تک کہ کوئی اللہ کا نام بھی زبان سے نکالے گا تو مار ڈالا جائے گا۔ یہ آ کر فتنہ و فساد کو رفع کریں گے اللہ کا نام بلند کریں گے عدل و انصاف کو رواج دیں گے اور مسلمانوں پر ایسا زمانہ خوشحالی کا آئے گا کہ اس سے قبل کبھی نہ آیا تھا۔ اگر کوئی شخص ان سے کہے گا کہ اے مہدی مجھے کچھ دو۔ تو وہ اس کے دامن میں زر و دولت بکھیر دیں گے۔

یہ حالات احادیث میں نہیں ہیں بلکہ مفسرین احادیث نے اپنی طرف سے بڑھائے ہیں۔ الغرض اہل تسنن کے یہاں مہدی موعود کے ظہور کو تسلیم نہیں کیا جاتا البتہ اثنا عشری طبقہ اس کا قائل ہے۔ اور ان کی آمد کا منتظر۔

بات یہ ہے کہ پیشین گوئیوں کی جتنی احادیث ہیں وہ کسی طرح قابل لحاظ نہیں کیونکہ "علم غیب" کے جاننے سے خود رسول اللہ نے صراحتہً انکار کیا ہے اور اس نوع کی روایات صرف پروپیگنڈا کے لئے وضع کر لی گئی ہیں۔

نور محمدی اور پل صراط

(جناب مرزا محمد مہدی صاحب جبل پور)

عام طور سے مسلمانوں میں یہ مشہور ہے کہ قیامت کے دن تمام آدمی ایک پل سے گذریں گے جس کا نام صراط ہے اور وہ بال سے زیادہ باریک تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے۔ پھر جو اچھے بندے ہیں وہ اس سے محفوظ گزر جائیں گے اور جو گنا ہگار ہیں وہ نیچے جہنم میں گر جائیں گے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جو قربانیاں کرتے ہیں وہ انہیں جانوروں پر سوار ہو کر اس پل سے گزریں گے۔ بہت سے واعظوں کو بھی کو یہی کہتے سنا گیا ہے اور مولود کی اکثر کتابوں میں اس کا ذکر موجود ہے براہ کرم مطلع فرمایئے اس کی کیا حقیقت ہے اور کیا واقعی قرآن پاک اور احادیث میں اس کا ذکر ہے۔ اسی طرح

نورِ محمدی کے متعلق میلاد کی کتابوں میں عجیب و غریب باتیں بیان کی گئی ہیں۔
اور کہا جاتا ہے یہ سب احادیث سے ثابت ہیں

آپ کیا پوچھتے ہیں کہ ان جاہل مولویوں اور کم عقل واعظوں نے کس کس طرح اسلام کو بدنام کیا ہے اور ان کی گندہ تصانیف نے بانیٔ اسلام پر کیا کیا تہمت تراشی ہے۔ ایک صراط پر کیا موقوف ہے اور ہزاروں باتیں ایسی ہیں جن کا پتہ نہ کلام پاک میں ہے اور نہ تعلیماتِ اسلامی میں لیکن آج وہ عام مسلمانوں کے نہایت اہم عقائد میں شامل نظر آتی ہیں جس زمانہ میں رسول اللہ مبعوث ہوئے ہیں۔ عرب میں موسوی عیسوی اور زرتشتی مذاہب کے اثرات ہر جگہ پائے جاتے تھے اور ان کی روایات عام طور پر بیان کی جاتی تھیں۔ چونکہ عرب خود بت پرست تھے اور وہ کسی الہامی کتاب رکھنے کے مدعی نہ تھے۔ اس لئے ان مذاہب سے بڑی حد تک مرعوب متاثر ہو رہے تھے اور ان کے خاندانوں میں ایک زمانہ نامعلوم سے ان مذاہب کی بہت سی روایتیں منتقل ہوتی چلی آ رہی تھیں۔

جب ظہورِ اسلام ہوا اور اس نے عربوں کی ذہنیت کو ان تمام اساطیری خرافات سے پاک کرنا چاہا تو اس کو بہت دقتیں پیش آئیں کیونکہ صدیوں سے جو باتیں ذہن میں مرتسم چلی آتی تھیں ان کا دفعتاً محو کرنا آسان نہ تھا۔ تاہم اس نے اساس و بنیاد کے طور پر ایک ایسی چیز (کلام مجید) پیش کر دی جو اس نوع کے لغویات سے پاک تھی۔ اور ہر چند ابتدائے عہد اسلام میں لوگوں کو اس کے حقیقی مفہوم پر بحث تمحیص کا موقع

نہیں ملا۔ تاہم اس نے ایک ایسے صاف وسادہ مذہب کی داغ بیل ضرور ڈالدی جو انسان کی عملی زندگی اور اس کے تمدنی تعلقات کے لحاظ سے نہایت ہی پائیدار اور بلند مستقبل اپنے اندر رکھتا تھا لیکن افسوس ہے کہ نہ رسول اللہ نے اتنی عمر پائی کہ وہ اس بنیاد کو مستحکم کر جاتے اور نہ آپ کے بعد خلفاء کو اندرونی سازشوں اور سیاسی جھگڑوں کی وجہ سے اس کی فرصت نصیب ہوئی۔ یہاں تک کہ مذہب اسلام نام ہو گیا حکومت اسلام کا۔ اور قرآن کی جگہ لے لی احادیث نے جو لاکھوں کی تعداد میں رسول اللہ کے نام سے گھڑی اور روایت کی جاتی تھیں پھر ان احادیث میں سے ایک حصہ تو ایسا ہے جو صرف سیاسی مصالح کی بنا پر وضع کیا گیا اور ایک حصہ وہ ہے جس میں دل کھول کر دیگر مذاہب کی ان تمام روایتوں کو لے لیا گیا جو عرب میں رائج تھیں اور تھوڑا سا تغیر کر کے ان کو "اسلامی چیز" کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ انھیں میں سے وہ احادیث بھی ہیں جو صراط (عوام کی زبان میں پل صراط) اور نور محمدی کے متعلق آپ کو میلاد کی کتابوں میں نظر آتی ہیں اور یہ دونوں خیال صریح ایرانی روایات سے ماخوذ ہیں۔ لفظ صراط عربی لفظ نہیں ہے۔ بلکہ فارسی لفظ "چنوات" کا معرب ہے اوستا میں ایک لفظ ہے "چنواتو پرو توس" جس کے معنی ہیں "نیک و بد شمار کرنے والے کا پل" یہی لفظ مخفف ہو کر فارسی میں چنوات ہوا اور عربی میں صراط۔

زردشتیوں میں اس پل کے متعلق جو روایت پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد انسان کی روح کو پل سے گزرنا پڑتا ہے اور اس کے بعد اس کے نیک و بد اعمال کا احتساب ہوتا ہے۔ پہلوی کتاب ونکارت کی ایک عبارت ملاحظہ ہو:-

"میں تیری عبادت نیک خیال اور نیک عمل کے ساتھ کرتا ہوں تاکہ میں روشنی کے راستہ میں رہوں۔ دوزخ کے عذاب میں مبتلا نہ ہوں اور پل چنوات کو عبور کر کے اس جگہ پہنچ جاؤں جو نکہتوں سے معطر اور مسرتوں سے معمور ہے"

اوستا میں بھی یہی خیال آپ کو نظر آئے گا چنانچہ نیک عورتوں اور مردوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ:-

"انھیں بھی میں تم جیسے آدمیوں کی دعاؤں کے ذریعہ سے لے جاؤں گا اور تمام برکتوں کے ساتھ پل چنوات تک ان کی رہنمائی کروں گا" (یسنا ۴۶-۱۰)

اس نوع کا عقیدہ نہ صرف قدیم ایرانیوں میں بلکہ تمام آریہ قوموں میں پایا جاتا ہے اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جہاں جہاں وہ پہونچے یہ اعتقاد اپنے ساتھ لے گئے چنانچہ نارمے اور سوئڈن کی قدیم روایات میں ایک چیز "بفروست" نظر آتی ہے جسے عام طور پر "دیوتاؤں کا پل" کہتے ہیں اور اس سے مراد ان کی غالباً قوس قزح ہے جس کو وہ دیوتاؤں کا قاصد کہا کرتے تھے۔ غرض کہ صراط کے متعلق جو روایات مسلمانوں میں رائج ہو گئی ہیں وہ یکسر ایرانی روایات ہیں اور قول رسول سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔

کلام مجید میں کم و بیش چالیس جگہ لفظ صراط استعمال کیا گیا ہے لیکن آپ کو کوئی ایک آیت بھی ایسی نہ ملے گی جس میں ان خرافات کی تصدیق کی گئی ہو۔ قرآن میں صراط کی صفت میں زیادہ تر لفظ مستقیم استعمال ہوا ہے اور کہیں حمید اور سوی کے الفاظ اور کسی ایک جگہ بھی راہ عمل کے علاوہ کوئی اور مفہوم نہیں لیا گیا۔ بس یہ تو ہو سکتا ہے کہ عربی زبان میں قبل بعثت نبوی لفظ صراط فارسی زبان کے لفظ چنوات سے

معرب کر کے لے لیا گیا اور اسی کے ساتھ ایرانی روایات بھی اس کے متعلق رائج ہو گئی ہوں لیکن کلام مجید میں لفظ صراط صرف راہ یا راستہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور اس کے ایرانی روایات کا عدم شمول اس بات کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ اُن کی کوئی حقیقت و اصلیت نہیں ہے۔

نور محمدی کا ذکر کلام مجید میں کسی جگہ نہیں ہے البتہ احادیث و روایات ضرور اس کے متعلق موجود ہیں کہ وہ کس طرح آدم سے منتقل ہو کر رفتہ رفتہ جناب آمنہؓ تک منتقل ہوا لیکن یہ احادیث بھی بالکل ..... موضوع ہیں اور رسول اللہ سے ان کو منسوب کرنا درست نہیں کیونکہ اس میں بھی وہی آرین روایات کی جھلک پائی جاتی ہے پارسیوں کی مذہبی کتاب اوستا میں بھی جمشید کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے اسی طرح کی ایک روایت پائی جاتی ہے۔ یہ جمشید وہی ہے جسے "یم کھشیت" بھی کہتے ہیں اور جس کے معنی "یم نورانی" کے ہیں۔ یم یا جم کا ذکر سنسکرت لٹریچر میں بھی پایا جاتا ہے چنانچہ رگ وید میں اس کو سب سے پہلا آدمی بیان کیا گیا ہے۔ ایرانی لٹریچر میں جم کے باپ کا نام "وایونت" درج ہے اور ہندوستانی روایات میں ویوسوت جو سورج کا دوسرا نام ہے اور ہندوؤں کا سورج بنسی خاندان اسی کی یادگار ہے۔ اوستا کی روایت میں بھی اسی نور کے نسلاً بعد نسل منتقل ہونے کا ذکر بالکل اسی طرح پایا جاتا ہے جیسا اسلامی روایات میں یعنی وہ نور پہلے جمشید کی پیشانی میں چمکا اس کے بعد فریدون میں منتقل ہوا اور پھر کرشاسپ میں۔

الغرض نور محمدی کے متعلق جو روایات پائی جاتی ہیں وہ بھی خرافیات میں داخل ہیں اور رسول اللہ کے قول سے ان کو کوئی واسطہ نہیں۔ اگر آپ کو واقعی اسلام کا صحیح مفہوم معلوم کرنا ہو تو احادیث کو بالکل نظر انداز کر دیجئے اور صرف کلام مجید کا مطالعہ کیجئے کہ وہی اصل چیز ہے اور وہی اصل بنیاد ہے تعلیمات اسلامی کی۔

لفظ اُمّی کا صحیح مفہوم

(جناب محمد عتیق صدیقی۔ ہند جدید کلکتہ)

مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ:۔

(۱) پیغمبر اسلام "اُمّی" تھے اور ان کو کتب کی ہوا تک نہ لگی تھی۔

(۲) قرآن کی جامعیت اور بلاغت بے نظیر ہے۔ دنیا آج تک نہ تو اس کا جواب پیش کر سکی اور نہ مستقبل میں پیش کر سکے گی۔

(۳) اسلام دنیا کا مکمل ترین مذہب ہے اور مذہب کے لحاظ سے دنیا کو اب کسی دوسرے مذہب کی ضرورت نہیں۔

عام مسلمانوں کو تو جانے دیجئے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن "آسمانی" کتاب ہے اور اسلام "آسمانی مذہب" جس کو خدا نے جبرئیل کے ذریعہ محمدؐ پر نازل کیا وہ مسلمان (جن کو علماء کرام ملحد، بے دین، لامذہب اور خدا جانے کیا کیا لقب دیتے ہیں) جن کا عقیدہ عام مسلمانوں کے برعکس ہے ان کے دماغ میں قدرتی

طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو کتاب اس قدر بلند پایہ اور جو مذہب
اس قدر برتر ہو اس کتاب کے مصنف اور اس مذہب کے مرتب کی علمیت
کا درجہ کتنا بلند ہوگا لیکن اس خیال کی تائید کے لئے جب اوراق تاریخ
اُلٹے جاتے ہیں تو وہاں پیغمبرِ اسلام "اُمّی" نظر آتے ہیں جو یقیناً غلط ہے۔
کیا آپ مہربانی فرماکر اس مسئلہ پر تاریخی حیثیت سے روشنی ڈال سکتے
ہیں نیز اس سوال کے متعلق اپنی ذاتی رائے سے بھی مطلع فرمائیے۔"

قرآن بہ لحاظ تعلیم اخلاق یقیناً جامع و مکمل چیز ہے اور انشاء کے لحاظ سے بھی وہ عربی زبان میں اعجازی حیثیت رکھتا ہے، اسی طرح اسلام کے متعلق بھی میرا یہی خیال ہے کہ وہ ہر لحاظ سے مکمل ہے بشرطیکہ اس کی اصل روح تعلیم کو سمجھ کر اس پر عمل کیا جائے۔ رہ گیا رسول اللہ کا اُمّی ہونا سو اس کے متعلق بیشک گفتگو ہوسکتی ہے اگر اُمّی کے معنی یہ لئے جائیں کہ انھوں نے باقاعدہ کسی مکتب میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی اور علوم و فنون کا انھوں نے اکتساب نہ کیا تھا تو پھر کیا، کسی کو بھی اس میں کلام نہیں ہوسکتا کیونکہ واقعی آپ کو کبھی اس کا موقع نہ ملا تھا جیسا کہ خود کلام مجید سے ثابت ہوتا ہے ملاحظہ ہو سورۂ عنکبوت کی آیت ۴۰۔

وما کنت تتلو من قبلہٖ من کتاب ولا تخطہٗ بیمینک۔ یعنی اس سے قبل تو نے کوئی کتاب نہ پڑھی اور نہ لکھی۔

الغرض قبل نزول وحی تو آپ کا نوشت وخواند سے ناواقف ہونا مسلم ہے۔

لیکن بعثت کے بعد اس باب میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ میری رائے یہی ہے کہ بعثت کے بعد آپ نے معمولی نوشت وخواند سے واقفیت حاصل کرلی تھی کیونکہ بعض تاریخی روایات سے آپ کا خود بعض مکاتیب کا لکھنا اور پڑھنا ثابت ہوتا ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آپ نے علوم وفنون حاصل کر لئے تھے۔ پس ظاہر ہے کہ ایسی معمولی واقفیت نوشت وخواند کی ایک انسان کو صحیح معنی میں تعلیم یافتہ یا عالم کہلائے جانے کا مستحق نہیں بنا سکتی۔

لفظ اُمّی کے اشتقاق کے متعلق بھی لوگوں میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ اُمّ القریٰ سے لیا گیا ہے جو مکہ کا دوسرا نام ہے۔ بعض اسے لفظ اُمّت سے ماخوذ بتاتے ہیں۔ اور بعض اس کا ماخذ عبرانی لفظ امّوت بتلاتے ہیں جس کے معنی بت پرست کے ہیں اور چونکہ یہود عربوں کو بت پرست جان کر اس لفظ سے یاد کرتے تھے۔ اس لئے اپنے آپ کو غیر یہودی یا عرب ظاہر کرنے کیلئے وہی لفظ رسول اللہ نے بھی اختیار کر لیا۔

کلام مجید میں متعدد جگہ یہ لفظ استعمال ہوا ہے اور ایسے ایسے محل پر استعمال ہوا ہے کہ ہم کوئی ایک مخصوص معنی اس کے متعین نہیں کر سکتے۔

آل عمران کی انیسویں آیت ہے :-

قل للذین اوتوا الکتاب والامیین ءاسلمتم اہل کتاب اور امیین سے پوچھو کیا تم اسلام لے آئے

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ امیین سے مراد غیر اہل کتاب ہیں۔

اسی سورت کی آیت ۷۵ سے اس کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔

ومن اهل الکتاب من ان تامنہ بقنطار یؤدہ الیک ومنھم من ان تامنہ بدینار لا یؤدہ الیک الا ما دمت علیہ قائما۔ ذالک بانھم قالوا لیس علینا فی الامیین سبیل ط۔

مفہوم یہ ہے کہ بعض اہل کتاب تو ایسے ہیں کہ اگر انھیں دولت کا انبار سپرد کردو تو وہ اسے واپس کردیں گے بعض ایسے ہیں کہ ایک دینار کی امانت بھی واپس نہ کریں گے اگر انھیں مجبور نہ کیا جائے اور یہ اس لئے کہ ان کے نزدیک امیین کا عرصہ ایسا نہیں ہے کہ ان کے باب میں کسی سے کوئی بازپرس ہو۔

لیکن سورۂ بقرہ کی آیت ۷۸ میں یہی لفظ ان یہودیوں کے لئے بھی آیا ہے جو کتاب پڑھنا نہیں جانتے تھے۔

ومنھم امیون لا یعلمون الکتاب الا امانی۔ یعنی یہود میں سے بعض ایسے امی بھی ہیں جنھیں کتاب کا کوئی علم نہیں اور ہے تو غلط سلط، سورۂ جمعہ اور سورۂ اعراف کی بعض آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ امی صرف عربوں کے لئے استعمال ہوا ہے مثلاً

(۱) ہو الذی بعث فی الامیین رسولاً یتلو علیہم آیٰتہٖ

(۲) الذین یتبعون الرسول النبی الامی۔

(۳) فآمنوا باللہ ورسولہ النبی الامی۔

پہلی آیت میں امیین سے مراد اہل عرب ہیں اور دوسری و تیسری آیت میں لفظ امی نبی کی صفت واقع ہوا ہے جس کے معنی خواہ غیر یہود کے لئے جائیں۔ یا غیر تعلیم یافتہ کے۔

اس میں شک نہیں کہ بعثت نبوی کے وقت جتنی قومیں عرب میں پائی جاتی تھیں ان میں کفار عرب ہی غیر اہل کتاب تھے اور اس لئے یہود و نصاریٰ نے جو صاحب کتاب تھے ان کو تحقیراً لفظ اُمّی سے خطاب کرنا شروع کیا جس کے اصلی معنی میں بے پڑھے لکھے ہونے کا مفہوم یقیناً شامل ہے۔

بہرحال رسول اللہ کا بے پڑھا لکھا ہونا ایک واقعہ ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اب رہا آپ کا یہ خدشہ کہ جو کتاب اس قدر بلند پایہ اور جو اس قدر برتر ہو اس کتاب کے مصنف اور اس مذہب کے مرتب کی علمیت کا درجہ "بہت بلند ہونا چاہئے" سو اس کے متعلق میں یہ عرض کروں گا کہ جس حد تک مذہبی تعلیمات کا تعلق ہے ایک نبی یا رسول کا علوم ظاہری سے آگاہ ہونا بالکل غیر ضروری ہے۔ قرآن نہ فلسفہ سے بحث کرتا ہے نہ طبیعیات سے۔ نہ علم الکیمیا سے اس کو کوئی واسطہ ہے۔ نہ فلکیات سے وہ صرف اخلاق و تمدن کا درس دیتا ہے اور اس لئے رسول کا مرتبہ صرف اخلاقی حیثیت سے بلند ہونا چاہئے سو تھا۔

انسان بہ لحاظ فطرت دو قسم کا ہوتا ہے ایک وہ جو دماغی حیثیت سے معمولی فہم و ذکا رکھتا ہے اور دوسرا وہ جس کا دماغ کسی خاص ذوق کے لئے غیر معمولی طور پر مناسب و موزوں واقع ہوتا ہے اور اگر ایک رسول کو ہم دوسرے قسم کے انسانوں میں شمار کریں (اور یقیناً کرنا پڑے گا) تو ہمارے لئے یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ وہ فطرت کی طرف سے خاص اہلیت اصلاح اخلاق کی لے کر آتا ہے۔ اور یہ ذوق وہ ہے جس کے لئے کسی اکتساب کی ضرورت نہیں۔ اب رہا کلام مجید کا بہ لحاظ انشا پردازی

اعجاز کی حد تک پہونچنا۔ سو اس کے لئے بھی تعلیم کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ عرب میں بڑے بڑے خطیب و شعراء سب بے پڑھے لکھے تھے اور قوت بیان کا ملکہ ان میں فطری طور پر پایا جاتا تھا۔ اگر کلام مجید کو اس معنی میں خدا کا کلام یا الہامی کتاب نہ مانا جائے جس معنی میں عام طور پر سمجھا جاتا ہے تو بھی اس کی معجزانہ فصاحت و بلاغت تسلیم کرنے میں کوئی استحالۂ عقلی نہیں کیونکہ رسول اللہ نہ صرف یہ کہ اسی سرزمین میں پیدا ہوئے جہاں "سبعات معلقہ" کے شعراء نے جنم لیا تھا بلکہ ایک ایسے قبیلے اور گھرانے کے فرزند تھے جو یوں بھی ہمیشہ افصح العرب مانا جاتا تھا۔

بہرحال ایک پیغمبر کا علوم ظاہری سے ناواقف ہونا اس کے منصب کے لحاظ سے بالکل غیر ضروری ہے اور اگر زبان و انشاء کی حیثیت سے وہ کوئی چیز ایسی پیش کرتا ہے جو عقل انسانی کو حیرت میں ڈال دینے والی ہے تو اس کا تعلق صرف اس ہستی سے ہے جسے وہ آفرینش کی طرف سے لے کر آتا ہے اور جو اکتساب و تعلیم سے یکسر بے نیاز ہے

سیرۃ نبوی، توحید، مذہب حنیفی

(جناب محمد اسلم صاحب۔ اکبر پور)

مندرجہ ذیل سوالات پر اظہار رائے چاہتا ہوں

(۱) سیرۃ نبوی کے مطالعہ کا بہترین ذریعہ کیا ہے اور موجودہ کتب سیر

میں کس پر اعتماد کلی ہو سکتا ہے؟

(۲) کیا درس توحید صرف اسلام کی خصوصیت تھی اور اس سے قبل یہ تعلیم کسی
نے نہیں دی؟

(۳) مذہب حنیفی سے کیا مراد ہے؟

ایک انسان کی سیرت کے دو حصے ہوا کرتے ہیں۔ ایک کا تعلق تاریخ و جغرافیہ
سے ہے اور دوسرے کا نفسیات سے یعنی ایک تو اس تحقیق سے متعلق ہے کہ وہ کب
پیدا ہوا، کب مرا، دوران حیات میں اس نے کیا کیا، کہاں کہاں رہا۔ اور دوسرے
نہ اس کا نفسیاتی میلان کیا تھا اور اس کی زندگی کے کن واقعات سے ہم اس کے
ہی رجحانات کا پتہ چلا سکتے ہیں

ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر جس وقت ہم سیرۃ نبوی پر غور کرتے ہیں
علوم ہوتا ہے کہ ایک حصہ پر تو بحث کے یقینی ذرائع موجود ہیں لیکن اس کے دوسر
حصے کی نسبت اختلاف ہو سکتا ہے اور ہے

رسول اللہ کا نفسیاتی میلان کیا تھا، فطرت کی طرف سے وہ کیا رجحان لے کر
ئے تھے، آپ کا ذہنی و دماغی اقتضا کیا تھا اس باب میں نہ کتب تاریخ کے
طالعہ کی ضرورت ہے اور نہ احادیث کی ورق گردانی کی کیونکہ قرآن پاک سامنے
وجود ہے اور اس کے ایک ایک لفظ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا نصب العین
س قدر بلند، آپ کا اخلاق کتنا پاکیزہ اور آپ کا عزم کس درجہ راسخ و محکم تھا۔

اگر آج کی دنیا سے اسلامی تاریخ و سیر کی تمام کتابیں نیست و نابود ہو جائیں تو بھی سیرۃ نبوی کی ان خصوصیات کے ثابت کرنے کے لئے قرآن پاک کے اوراق کافی ہیں۔ البتہ آپ کی سیرت کا وہ حصہ جو اقوال و افعال کی جزئیات یا معیشتؐ معاشرت کی تفصیلات سے متعلق ہے، کامل تحقیق و یقین کے ساتھ مرتب نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کے لئے ہم کو احادیث و کتب تواریخ کی جستجو کرنا پڑے گی اور یہ دونوں ذریعے زیادہ موثق نہیں ہیں کیونکہ احادیث کا بہت کم حصہ قابل اعتبار ہے اور تاریخ کی کتابوں میں سے کوئی کتاب ایسی موجود نہیں جو آپ کی زندگی میں یا اس کے بعد ہی مرتب کی گئی ہو۔

احادیث کا حصہ کیوں قابل اعتبار نہیں۔ اس کی نسبت ہم بار ہا نگار کے صفحات میں اظہار خیال کر چکے ہیں اس لئے تکرار کی ضرورت نہیں۔ البتہ تاریخی حیثیت سے جو کتابیں لکھی گئیں ان کا ذکر اس جگہ ضروری ہے۔ رسول اللہ کی زندگی تین زمانوں میں تقسیم ہے۔ ایک زمانہ ولادت سے بعثت تک، دوسرا بعثت سے ہجرت تک اور تیسرا ہجرت سے وفات تک۔

چونکہ آپ کی بعثت چالیس سال کی عمر میں ہوئی اس لئے ظاہر ہے کہ عمر کا بڑا حصہ تو اس حال میں گزرا کہ اس کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ کس کو معلوم تھا کہ یہ اُمی آئندہ چل کر اتنا بڑا دعویٰ کرنے والا ہے۔ رہ گیا زندگی کا دوسرا دور سو وہ انتہائی کشمکش، حد درجہ پریشانی و اضطراب اور حالت امید و بیم میں بسر ہوا۔ اس لئے جو چند معاون و انصار آپ کے پیدا ہو گئے تھے ان میں بھی یقیناً کیا میا!

کا نہ تھا کہ وہ رسول اللہ کے مستقبل میں کسی خاص اہمیت کا اندازہ کر کے ان کے ذاتی حالات و کوائف کی طرف توجہ کرتے۔ البتہ ہجرت کے بعد جو زمانہ آیا ہے وہ بے شک کامیابی کا تھا جس نے رسول اللہ کی رسولانہ حیثیت کو مستحکم کر دیا اور چونکہ وہ بھی صرف لڑائیوں ہی میں بسر ہوا تھا اس لئے سب سے پہلا تاریخی مواد بھی ہم کو "مغازی" ہی کا ملتا ہے لیکن افسوس ہے کہ اس میں بھی خالص تاریخی نقطۂ نظر کو سامنے نہیں رکھا گیا اور اس کی حیثیت بھی "ایام عرب" کی اس بطل پرستانہ لٹریچر کی سی ہے جو بعثت نبوی سے قبل جاہلیت میں بھی پایا جاتا تھا۔

مسلمانوں کی اولین فتوحات کے بعد ہی عرب کے پیشہ ور قصہ خوانوں نے (جنھیں وہاں قصاص کے نام سے موسوم کرتے تھے)، تمام اسلامی دنیا میں یہ رزمیہ داستانیں بیان کرنا شروع کر دیں اور ان میں رسول اللہ کی ہستی کو جنھوں نے اپنے آپ کو صرف "انا بشر مثلکم" کی حیثیت سے پیش کیا تھا اسی رنگ میں ظاہر کیا جو انجیل کی روایات اور ایرانی افسانوں میں پایا جاتا ہے، یہاں تک کہ آپ کے واقعات زندگی نہ صرف ولادت یا بعد ولادت کے بلکہ اس سے قبل کے بھی گھڑ گھڑ کر مشہور کئے جانے لگے۔ چنانچہ نور محمدی کا پیدا کیا جانا، ارواح انبیاء اور جن و ملک کا اس کو سجدہ کرنا، ہزاروں سال تک اس کا طیور فردوس کے پوٹوں میں رہنا اور پھر بہت سے پیمبران عظام سے صلباً بعد صلب منتقل ہو کر آمنہ کے شکم مبارک میں آنا۔ ولادت کے وقت ایوان کسریٰ کا جنبش میں آنا، بتوں کا اوندھے منھ گر جانا۔ فرشتہ کا آپ کے سینہ کو چاک کر کے دل کو آلائش سے پاک کرنا، پشت پر مہر نبوت کا ہونا

آپ کے سایہ کا معدوم ہونا، ہاتھ میں کنکریوں کا بولنا۔ اُستن حنانہ کا آپ کے فراق میں رونا، چاند کے دو ٹکڑے کر دینا، ہر مجمع میں آپ کا سب سے بلند نظر آنا۔ جنگ میں فرشتوں کے پرے کے پرے امداد کے لئے آنا وغیرہ وغیرہ سیکڑوں باتیں اس قسم کی مشہور کی گئیں جس سے مقصود یہ تھا کہ یہود و نصاریٰ اور اہل ایران کے لٹریچر میں جو عجیب و غریب روایات ان کے اکابر کے متعلق پائی جاتی تھیں، اسلامی روایات کسی طرح ان سے کم نہ رہیں۔ اکابر پرستی کا یہ جوش ہمیشہ ہر قوم میں اس طرح کا لٹریچر فراہم کر دیتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اسلام بھی اس سے خالی نہ رہا لیکن فرق اتنا رہا کہ اسلام میں یہ لٹریچر اسی جگہ ختم ہو کر نہیں رہ گیا بلکہ اس نے بعد میں ایک اور انداز اختیار کیا جسے داستان گوئی اور تاریخ کی ملی جلی صورت کہنا چاہیئے اور جس کا بہترین نمونہ وہب بن منبہ کی کتاب المغازی ہے۔

مدینہ میں سیرۃ رسولؐ کے مطالعہ و تدوین کی طرف خاص توجہ کی گئی اور غالباً عروہ بن الزبیر (۲۳-۹۴ھ) سب سے پہلے شخص تھے جنھوں نے اسے تاریخ کے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے سیرۃ نبوی کے متعلق بہت سی روایتیں فراہم کیں اور اس طرح گویا سیرۃ و حدیث دونوں کو ملا کر ایک ایسے فن کی بنیاد ڈالی جسے صحیح معنی میں بیاگرفی تو نہیں کہہ سکتے لیکن اس کی داغ بیل ضرور کہنا چاہیئے۔

اسی طرح حضرت عثمان غنیؓ کے صاحبزادے ابان نے بھی مکہ میں بیٹھ کر سیرۃ نبوی کے متعلق فراہمی روایات کا کام شروع کیا جنھیں ان کے شاگرد عبدالرحمن بن المغیرہ نے کتابی شکل میں منتقل کیا اور یہ کام ایک مستقل فن کی حیثیت سے علم المغازی کہلاتا تھا۔

جس نے نہ صرف مکہ و مدینہ بلکہ بصرہ میں بھی لوگوں کی توجہ اپنی طرف مائل کر دی تھی۔

عروہ کے شاگردوں میں زہری پہلے شخص تھے جنھوں نے رسول اللہ کی سیرۃ کو مغازی کے رنگ سے کچھ ہٹ کر پیش کیا تھا اور اگر وہ کتاب باقی رہتی تو ممکن ہے سیرۃ کی کتابوں میں جو روایتی مبالغے پائے جاتے ہیں وہ اتنے نہ ہوتے لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ ابن اسحاق نے جو زہری کے شاگرد تھے ضرور اپنے اُستاد کی اس کتاب سے فائدہ اٹھایا ہوگا اور انھوں نے جو سیرۃ رسول مرتب کی تھی اس میں علاوہ خود اپنی تحقیقات کے زہری کے مجموعے سے بھی استفادہ کیا ہوگا لیکن افسوس ہے کہ ابن اسحاق کی کتاب بھی پوری محفوظ نہ رہ سکی اور اگر ابن ہشام نے ان کے اقوال اپنی سیرۃ رسول میں نقل نہ کئے ہوتے تو ہمارے پاس کوئی ذریعہ اس سے استفادہ کا نہ تھا۔ زہری کا انتقال ۱۲۴ھ میں ہوا۔ ابن اسحاق کا ۱۵۱ھ میں اور ابن ہشام کا ۲۱۳ھ میں۔ اس لئے یہ کہنا غالباً درست نہ ہوگا کہ ہر چند سیرۃ نگاری کی ابتدا ۱۲۳ھ میں ہو چکی تھی لیکن اس کی پوری تکمیل دوسری صدی ہجری کے اخیر میں ہوئی اور سب سے زیادہ قدیم و معتبر کتاب اس موضوع پر ابن ہشام کی ہے۔

ابن ہشام نے اس موضوع پر بہت مفصل اور کثیر اطلاعات فراہم کی ہیں اور ہر چند بہ لحاظ روایت یا اسناد ان کی جمع کی ہوئی تمام روایات قابل اعتماد نہیں لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ سیرۃ نبوی پر سب سے پہلی کتاب جسے ہم اگر فی کہہ سکتے ہیں ابن ہشام ہی کی ہے۔ اسی عہد کے ایک دوسرے مورخ محمد عمر الواقدی ہیں جن کا انتقال ۲۰۷ھ میں ہوا جنھوں نے سیرۃ نبوی کی خدمت تین طریقوں سے کی ہے۔

ایک کتاب المغازی کے ذریعہ سے، دوسرے سیرۃ لکھ کر اور تیسرے طبقات کی تالیف کرکے اور ہر چند یہ تینوں تصانیف مل کر نہایت بسیط سیرۃ بنتی ہیں لیکن افسوس ہے کہ تنقیح روایات صحت اسناد اور نقد و درایت کے لحاظ سے علامہ واقدی کا یہ کارنامہ ابن ہشام کی تصنیف کو نہیں پہونچتا۔

اس کے بعد صدیوں تک اس موضوع پر کسی نے توجہ نہیں کی اور اس کے بعد بھی جو کچھ جس نے لکھا اس کا ماخذ ابن ہشام اور واقدی ہی کی تصانیف تھیں۔ یہ تو حال ہوا عربی کتابوں کا۔ اب رہیں وہ تصانیف جو اردو میں کی گئیں سو ان کا ذکر فضول ہے کیونکہ ان میں سے اکثر تو اس قابل بھی نہیں کہ انھیں سیرۃ کے نام سے منسوب کیا جائے اور جو چند ہیں وہ بھی نقائص سے پاک نہیں۔ حد یہ ہے کہ دارالمصنفین کی سیرۃ نبوی جس کی ابتداء مولانا شبلی نے کی تھی اور اختتام سید سلیمان کے ہاتھوں ہوا ہے وہ بھی اس قابل نہیں ہے کہ اسے صحیح معنی میں بیاگرفی کہہ سکیں کیونکہ اس میں بھی بکثرت غیر صحیح روایات سے استناد کیا گیا ہے۔ اور دور از عقل و خلاف حقیقت باتوں کی کمی نہیں۔

انگریزی میں یقیناً بعض تصانیف بیاگرفی کے اصول پر لکھی گئی ہیں لیکن افسوس ہے کہ ان کے مصنفین اس دشمنی سے اپنے دل کو صاف نہ کر سکے جو بانی اسلام کے ساتھ ان کو چلی آرہی ہے۔ الغرض مسلم و غیر مسلم مصنفین میں کوئی ایسا نظر نہیں آتا جس نے پوری طرح دیانت و امانت سے کام لے کر اس خدمت کو انجام دیا ہو ورنہ ایک مورخ یا سیرۃ نگار کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ حسن اعتقاد و تعصب دونوں

سے پاک ہو۔

دین حنیف جسے آپ کہتے ہیں وہی ہے جس کا نام دین ابراہیمی ہے اور رسول اللہ سے قبل بھی اہل عرب اپنے مورث اعلیٰ جناب ابراہیم اور ان کے عقیدۂ توحید سے واقف تھے۔ ابن ہشام نے بہ حوالۂ ابن اسحٰق ان موحدین و مصلحین کے سلسلہ میں ورقہ ابن اسد، عبید اللہ ابن جحش، عثمان ابن الحویرث اور زید ابن عمر کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔ یہ لوگ دین حنیف کے پابند تھے اور اس کی تبلیغ بھی کرتے تھے۔

زید ابن عمر نے اپنے عقائد توحید کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:۔

اربا واحداً ام الف رب   ادین اذا تقسمت الامور
عزلت اللات والعزیٰ جمیعا   کذالک یفعل الجلد الصبور

لفظ حنیف عبرانی سے لیا گیا ہے وہاں اس کے معنی چھپانے والے، جھوٹ بولنے والے اور منافق کے ہیں اور ایام جاہلیت میں وہ لوگ جو بتوں کی پرستش کے خلاف تھے انھیں طعن و تعریض کی صورت سے حنیف کہا کرتے تھے یعنی وہ لوگ جو راہ راست سے ہٹ کر گمراہ ہو گئے ہیں لیکن چونکہ موحدین کے نزدیک یہ گمراہی عین مقصود تھی اس لئے خود انھوں نے بھی اس نسبت کو اپنے لئے گوارا کر لیا اور رفتہ رفتہ لفظ حنیف کا مفہوم ہی موحد، غیر بت پرست قرار پا گیا۔

آدم اور شجرِ ممنوعہ

(جناب خلیق تلہری۔ کوئٹہ)

میں آپ کا نہایت ممنون ہوں گا اگر میرے اس استفسار کا جواب آپ جلد مرحمت فرمائیں۔

حضرت آدم کے متعلق عام طور پر یہ مشہور ہے کہ انھوں نے گیہوں کھایا اور اس کی پاداش میں جنت سے نکال دیے گئے۔ قرآن شریف میں جہاں تک میرا خیال ہے اس قصہ کے متعلق صرف اتنا ذکر ہے۔

وقلنا یآدم اسکن انت وزوجک الجنۃ وکلا منہا رغداً حیث شئتما ولا تقربا ہذہ الشجرۃ فتکونا من الظالمین ۝ فازلہما الشیطٰن عنہا فاخرجہما مما کان فیہ وقلنا اہبطوا بعضکم لبعض عدو ولکم فی الارض مستقر ومتاع الیٰ حین ۝

کیا جناب اس مسئلہ پر صراحت کے ساتھ روشنی ڈالیں گے کہ وہ درخت کس چیز کا تھا اور شجرِ گندم کس روایت سے شہرت پا گیا نیز یہ کہ وہ کون سی جنت تھی جہاں سے آدم کا اخراج ہوا۔ اگر وہ جنت اس کرۂ ارض سے علیحدہ نہ تھی تو "ولکم فی الارض مستقر ومتاع الیٰ حین" کی تخصیص کیسی؟

اگر نگار آپ کے مطالعہ میں رہتا ہے تو آپ سے مخفی نہ ہوگا کہ کلام مجید کے باب میں ہمیشہ میں نے دو باتوں پر زور دیا ہے۔ ایک یہ کہ اس کو خود اسی سے سمجھنے کی کوشش

کرنا چاہئے اور دوسرے یہ کہ اگر تفاسیر کا مطالعہ بھی کیا جائے تو عقل و درایت کو کبھی ہاتھ سے نہ دینا چاہئے کیونکہ یہ بھی بہرحال دماغ انسانی ہی کی پیداوار ہیں اور سہو و نسیان، لغزش و غلطی بلکہ تحریف و خدع سے بھی پاک نہیں ہو سکتیں

اسلام اور تعلیمات اسلام کی سادگی و پاکیزگی کو جس چیز نے تباہ کیا ہے وہ صرف مجموعۂ احادیث ہے کیونکہ تفاسیر کی بنیاد یکسر حدیثوں ہی پر قائم ہے اور تفسیروں ہی کو دیکھ کر لوگ قرآن پاک سمجھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ آدم کے متعلق جو افسانہ اسلامی لٹریچر میں پایا جاتا ہے اس کے خاص خاص ٹکڑے یہ ہیں۔

(۱) آدم نام اس مخصوص فرد نوع انسانی کا ہے جو سب سے پہلے مٹی سے تعمیر کیا گیا اور جنت میں رکھا گیا۔

(۲) ان کے پہلو سے حوا ان کی بیوی پیدا کی گئیں۔

(۳) تمام ملائکہ نے انھیں سجدہ کیا لیکن ابلیس نے نہیں کیا؛ اور اسی لئے وہ جنت سے نکالا گیا۔

(۴) شیطان سانپ اور طاؤس کی مدد سے چھپ کر جنت میں پہونچا اور حوا کو بہکایا کہ آدم کو گیہوں کھانے پر آمادہ کریں۔

(۵) آدم نے گیہوں کھایا اور اس جرم میں وہ مع حوا کے جنت سے نکال کر نیچے زمین پر پھینک دئے گئے۔

یہ تمام باتیں جو عام طور پر مشہور ہیں صرف ان غلط روایات کا نتیجہ ہیں جنھیں احادیث کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جن کو کلام مجید سے زیادہ اعتماد حاصل

ہے ورنہ کلام پاک میں کسی جگہ ان لغویات کا ذکر نہیں ہے۔

قرآن مجید میں آدم کا قصہ آٹھ جگہ بیان ہوا ہے اور ان تمام آیات کے مطالعہ سے صرف حسب ذیل باتیں محقق ہوتی ہیں

(۱) خدا نے زمین پر اپنا خلیفہ یا آدم پیدا کرنا چاہا۔

(۲) ملائکہ نے مخالفت کی کہ وہ سوائے خونریزی کے اور کچھ نہ کرے گا

(۳) خدا نے آدم کو علم اسماء سکھایا اور ملائکہ اپنے تئیں اس باب میں عاجز پاکر سجدہ میں گر پڑے مگر ابلیس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔

(۴) آدم اور ان کی بیوی کو جنت میں رہنے کا حکم ملا اور شجر ممنوعہ کے پاس جانے کی ممانعت کر دی۔

(۵) لیکن شیطان نے انھیں بہکایا اور وہ جنت سے نکال دیے گئے۔

اس بحث میں چند امور قابل غور ہیں :۔ آدم سے مراد کیا ہے ؛ ملائکہ اور اور ابلیس کا مفہوم کیا ہے اشجر ممنوعہ سے کس چیز کو تعبیر کیا گیا ہے اور جنت سے نکال دیے جانے کا کیا مطلب ہے۔

جن لوگوں نے آدم سے کوئی خاص شخص مراد لیا ہے انھوں نے سخت غلطی کی ہے کیونکہ خود کلام مجید ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ آدم سے مراد نوع انسانی ہے ملاحظہ ہو سورۂ ص ارشاد ہوتا ہے :۔

اذ قال ربک للملٰئکۃ انی خالق بشرًا من طین۔ فاذا سویتہ ونفخت فیہ من روحی فقعوا لہ سٰجدین ۝

یہاں بھی وہی خلق آدم کا قصہ بیان ہوا ہے لیکن بجائے لفظ (آدم) کے (بشر) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس لئے تفسیر قرآن بالقرآن کو پیش نظر رکھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ لفظ آدم سے مراد کوئی مخصوص ہستی نہیں ہے بلکہ ساری نوع انسانی مقصود ہے۔ جب یہ امر متحقق ہو گیا تو اس افسانہ کا رنگ ہی دوسرا ہو جاتا ہے کیونکہ اس صورت میں ملائکہ کا سوال وجواب، شیطان کا جحود وانکار، آدم کا شجر ممنوعہ کے پاس جانا اور جنت سے نکالا جانا سب بیان استعارہ وکنایہ میں داخل سمجھا جائے گا۔ اس لئے اب دریافت طلب امر یہ رہ جاتا ہے کہ اس انداز بیان سے فی الحقیقت کیا ظاہر کرنا مقصود ہے۔

جن لوگوں نے ملائکہ سے کوئی خاص مخلوق (نوری، پروں والی) سمجھی ہے انھوں نے عہد جاہلیت کے عقائد کا تتبع کیا ہے کیونکہ ظہور اسلام سے قبل عام طور پر فرشتوں کے متعلق یہی سمجھا جاتا تھا کہ وہ ایک خاص قسم کی مخلوق ہے جو آسمان سے زمین تک تگ ودو میں مصروف رہتی ہے اور دیویوں اور دیوتاؤں کی کارکن جماعت ہے حالانکہ ملائکہ سے وہ قوتیں مراد ہیں جو کائنات میں بروئے کار نظر آتی ہیں۔ اور بعض اکابر اسلام نے نہایت وضاحت سے اس کو ظاہر کیا ہے۔ اس لئے جب ملائکہ سے مراد صرف قوائے عالم ہیں تو ظاہر ہے کہ ابلیس عبارت ہوگا صرف اس قوت سے جو بدی کی طرف مائل کرتی ہے۔ اور لفظ شجر استعارہ ہوگا عدوان وبغاوت یا شر وفساد سے۔ کیونکہ جس طرح ایک درخت کی شاخیں پھوٹتی ہیں اسی طرح بدی کے اثرات بھی وسیع ہوتے ہیں۔

خود کلام مجید سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ شجر سے مراد شجر معصیت ہے چنانچہ سورۂ طٰہٰ میں آدم کی پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:-

فوسوس الیہ الشیطٰن قال یآدم ہل ادلک علی شجرۃ الخلد وملک لا یبلیٰ ط

اس میں معصیت کو شجرۃ الخلد اور لا زوال ملکت سے کیا گیا ہے۔ اب ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھ کر نتیجہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے ان آیات میں صرف فطرت انسانی سے بحث کی ہے اور تنبیہ کی ہے کہ اگر انسان نے اپنی قوت تمیز سے کام نہ لیا تو اس کا گمراہ ہو کر فطرت سے محروم ہو جانا یقینی ہے۔

خدا کا آدم کو علم اسماء سکھانا اور ملائکہ کا سجدہ میں گر پڑنا اشارہ ہے اس طرف کہ اپنی فطرت کے لحاظ سے انسان تمام کارعالم کو اپنے قابو میں لے آسکتا ہے لیکن اسی کے ساتھ ابلیس کا ذکر کر کے گویا یہ بھی ظاہر کر دیا گیا ہے کہ باوجود ان تمام اقتدارات کے انسان کا ایک کمزور پہلو یہ بھی ہے کہ وہ بعض اوقات اپنی خواہشات سے مغلوب ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو نقصان پہونچا لیتا ہے۔

اسلامی لٹریچر میں جو تمام حشو و زوائد نظر آتے ہیں وہ یہودیوں کی روایات سے ماخوذ ہیں کیونکہ توریت میں بھی آفرینش آدم کا قصہ تقریباً اسی انداز میں بیان کیا گیا ہے لیکن یہود نے اس کو بھی مسخ کر کے پیش کیا اور چونکہ وہ لوگ اس کو حقیقتاً ایک واقعہ سمجھتے تھے۔ اس لئے مسلمان راویوں نے بھی انھیں کی پیروی شروع کر دی اور رفتہ رفتہ اب یہ خیال اس قدر سختی کے ساتھ دل نشیں ہو گیا ہے کہ اس کا دور کرنا آسان نہیں۔

عقل و مذہب

(جناب سید خلیل الرحمٰن صاحب، جون پور)

"علم و مذہب کی باہمی مخالفت بہت مشہور چیز ہے۔ علم مذہب کے بیانات کو غلط ٹھہراتا ہے کیونکہ وہ اس کے اصول بہ صحیح نہیں اترتے، مذہب علم کو برا کہتا ہے کیونکہ وہ خدا کے وجود کو معطل کر دینے والا ہے۔ علم کے لئے دلائل تو خیر علمی ہونے ہی چاہئیے لیکن اب مذہب کو بھی مجبوراً علمی نقطۂ نظر سے جواب دینا پڑتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مذہب اس میں کامیاب ہو سکتا ہے اور کیا واقعی وہ عقلی دلائل ایسے رکھ سکتا ہے جو اہل علم کو خاموش کر سکیں۔ میں ممنون ہوں گا اگر اس باب میں اپنے خیالات قلمبند فرمائیں۔"

یوں تو آپ کے استفسار کے جواب میں اختصاراً اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس وقت تک مذہب اپنی حفاظت میں کوئی علمی دلیل ایسی پیش نہیں کر سکا جو اہل علم کے نزدیک قابل قبول ہو، لیکن چونکہ حکایت لذیذ ہے اس لئے میں ذرا دیر تک بیان کرنا چاہتا ہوں۔

ہر چند میں اس سے قبل "اعتقاد و یقین" کا عنوان قائم کرکے پسلسلۂ ملاحظات اس مسئلہ پر کافی بحث کر چکا ہوں لیکن اس وقت میں ایک دوسرے پہلو سے اس پہ گفتگو کرنا چاہتا ہوں اور ذرا ایک آدھ مثال پیش کرکے بتاؤں گا کہ مذہب کے علمی دلائل کی نوعیت

کیا ہوا کرتی ہے اور اہل علم اُسے کیوں تسلیم نہیں کرتے۔

قبل اس کے کہ نفس موضوع پر اظہار خیال کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مذہب و علم کے حدود متعین کر دیئے جائیں کیونکہ بغیر اس کے فیصلہ دشوار ہوگا لیکن یہ واضح رہے کہ اس جگہ مذہب سے میری مراد کسی جماعت و قوم کی تہذیب و کلچر نہیں ہے بلکہ صرف وہ معتقدات ہیں جن کا تعلق مابعد الطبیعیات سے ہے یا ان روایات و واقعات سے جن کو الہام و معجزہ کے نام سے پیش کیا جاتا ہے۔ اسی میں خدا و رسول کے مفہوم کو بھی شامل سمجھنا چاہیئے۔ زیادہ واضح الفاظ میں یوں سمجھئے کہ مذہب کا وہ پہلو حریف علم نہیں ہے جو صرف وضع قوانین یا تعین اصول معاشرت سے وابستہ ہے، بلکہ اس کے وہ بیانات جو حدود علم و تحقیق کے اندر آتے ہیں اور جن پر عقل انسانی اچھا یا بُرا ہونے کا نہیں بلکہ صحیح یا غلط ہونے کا حکم لگاتی ہے پھر اگر مذہب نام ہوتا صرف اصلاح اخلاق کا تو یقیناً اس میں اتنی لچک ضرور ہوتی کہ وہ ہر ملک و زمانے کے لحاظ سے اپنے اندر تبدیلی پیدا کر لیا کرتا اور اس صورت میں علم کے ساتھ اس کا اجتماع کسی نہ کسی مرکز پر بالکل ممکن تھا لیکن چونکہ مذہب حقیقتاً نام ہے مخصوص معتقدات کا جن پر صرف اس لئے ایمان لایا جاتا ہے کہ وہ خدا کے کسی خاص بندے یا کسی خاص کتاب کے ذریعہ سے حاصل ہوئے ہیں بنا بریں علم انھیں حدود عقل کے اندر لاکر سمجھنا چاہتا ہے اور جب وہ سمجھ میں نہیں آتے تو انکار کر دیتا ہے اور یہ صورت مذہب و علم کے مناقشہ کی ایسی ہے جو کسی صورت سے نہیں ہو سکتی کیونکہ اس طرف مذہب کو اصرار ہے کہ وہ جو کہتا ہے خدا کا بتایا ہوا

کہتا ہے اس میں غلطی کا امکان نہیں اور ادھر علم کہتا ہے کہ خدا نے تمہیں کچھ نہیں بتایا، ایک مخصوص انسان نے اپنے ہی ذہن وعقل کے لحاظ سے بتایا ہے اور اس لئے بلا تحقیق اسے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اگر مذہبی معتقدات اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایسے ہوتے کہ علم کو ان کی طرف توجہ کی ضرورت نہ ہوتی تو اس نزاع کے پیدا ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی لیکن مشکل تو یہی ہے کہ مذہب بھی انھیں مسائل پر گفتگو کرتا ہے جن پر علم کی تحقیق جاری ہے اور اس لئے دونوں کا تصادم ناگزیر ہے۔ مثلاً مذہب کہتا ہے کہ خدا نے کائنات کو چھ دن میں پیدا کیا۔ علم کہتا ہے کہ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ کائنات نتیجہ ہے تدریجی ارتقاء کا۔ مذہب کا بیان ہے کہ زمین کی پیدائش پر زیادہ سے زیادہ چند ہزار سال کا زمانہ گزرا ہے علم کہتا ہے طبقات الارض کا مطالعہ اس کی تردید کرتا ہے اور وہ کروڑوں بلکہ اربوں سال کی مدت متعین کرتا ہے۔ مذہب کہتا ہے کہ خدا کا ایک نیک بندہ مچھلی کے پیٹ میں تین دن تک زندہ رہا۔ علم اس کو غیر ممکن بتاتا ہے کیونکہ حیات کے لئے مخصوص اسباب حیات کا پایا جانا ضروری ہے جو مچھلی کے پیٹ میں میسر نہیں آسکتے تھے۔ مذہب مدعی ہے کہ خدا کے کسی برگزیدہ بندہ نے ہاتھ کے اشارے سے چاند کے دو ٹکڑے کر دیئے اور وہ پھر مل گئے۔ علم اس کی تردید کرتا ہے کیونکہ خرق و التیام ممکن نہیں۔ الغرض اسی طرح کی اور بہت سی باتیں ہیں جو مذہب کی طرف سے پیش کی جاتی ہیں اور علم کے ماننے پر راضی نہیں

اب سے کچھ زمانہ قبل جب علوم جدیدہ نے اتنی ترقی نہیں کی تھی اور اس کی تحقیق بھی اتنی زیادہ مکمل نہ تھی مذہب کی طرف سے عام طور پر جواب کی یہ صورت

ہوا کرتی تھی کہ کیا خدا کی قدرت سے بعید ہے کہ وہ ایسا کر دے۔ کیا جس نے آسمان و زمین پیدا کئے ہیں وہ کسی ایک اصول کی پابندی پر مجبور ہے اور کیا انسان کا علم اتنا وسیع ہو سکتا ہے کہ وہ قدرت کے نظام اور اس کے اصول پر حاوی ہو سکے۔ جواب کی یہ صورت بالفاظ دیگر گویا یہ حیثیت رکھتی تھی کہ ہم عقل و نقل کچھ نہیں جانتے اور بلا کسی دلیل کے ہر اس بات کو صحیح باور کرتے ہیں جو مذہب کی طرف سے بتائی گئی ہے پھر چونکہ علمی تحقیق بھی زیادہ وسیع نہیں ہوئی تھی اور انسان کے ذہن سے اس کے عجز کا احساس بھی پوری طرح محو نہ ہوا تھا۔ یہ بات آگے بڑھنے نہ پاتی تھی اور مذہب اپنی فتحمندی سے تعبیر کیا کرتا تھا لیکن اب کہ علوم تکمیل کی حد تک پہونچ گئے ہیں ہر مسئلہ مشاہدہ کی صورت اختیار کر چکا ہے اور یقین کی ان حدود میں انسان نے قدم رکھا ہے جہاں تذبذب کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ مذہب نے اپنی مناظرانہ روش بدلی ہے اور اب وہ اپنے معتقدات کے ثبوت میں صرف خدا کی مرضی کو دلیل نہیں ٹھہراتا۔ بلکہ علمی نقطے سے بھی ان کی صحت پر گفتگو کرنے لگا ہے اور میرے نزدیک مذہب کی سب سے پہلی شکست یہی ہے کہ جن علوم کی صحت کا پہلے وہ منکر تھا اب انہیں کے دامن میں پناہ ڈھونڈھنے کی کوشش کرتا ہے۔

مشرق کا ذکر نہیں جہاں مذہب کیا، علم بھی قدامت پرستی کی زنجیروں سے آزاد نہیں بلکہ مغرب کو دیکھئے کہ وہاں کے اہل مذاہب اب اپنے معتقدات کی پیروی میں کیسی کیسی عجیب و غریب علمی دلیلیں پیش کرتے ہیں درانحالیکہ ان کا یہ علمی دلائل پیش کرنا ہی حقیقتاً ان کے مذہب کی بنیاد کو متزلزل کر دینے والا ہے۔

غالباً نامناسب نہ ہوگا اگر میں اس کی ایک مثال پیش کر کے اپنے مدعا کو زیادہ واضح کرنے کی کوشش کروں۔ روایات توریت وانجیل میں ایک مشہور روایت طوفان و کشتی نوحؑ کی بھی ہے یعنی کہا جاتا ہے کہ جب طوفان کے آثار شروع ہوئے تو نوحؑ نے ایک کشتی تیار کی جس میں دنیا کے تمام جانوروں کے ایک ایک دو دو جوڑے رکھ لئے چنانچہ موجودہ نسلیں انھیں سے چلی ہیں۔

اس روایت پر جو علمی نقطۂ نظر سے جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کیونکر ممکن ہے کہ تمام وحوش وطیور کے جوڑے ایک کشتی میں سما سکیں اسی کے ساتھ ان کے لئے ایک سال کی غذا بھی اس میں موجود ہو۔ چونکہ یہ اعتراض علم ریاضی سے متعلق ہے جس کی صحت کی طرف سے اہل مذہب کو انکار نہیں ہو سکتا اس لئے انھوں نے جو جواب اس کا دیا ہے وہ بھی ریاضی ہی کے ماتحت ہے۔ ملاحظہ ہو:-

صحیفۂ مقدسہ میں جو پیمائش کشتی نوحؑ کی درج ہے، وہ لمبائی چوڑائی اور عمق کے لحاظ سے علی الترتیب ۳۰۰، ۵۰ اور ۳۰ ہاتھ ہوتی ہے یعنی موجودہ اصول پیمائش کے لحاظ سے وہ ۴۵۰ فٹ لمبی، ۷۵ فٹ چوڑی اور ۴۵ فٹ گہری تھی چونکہ روایت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس کے تین درجے تھے اس لئے ایک ایک فٹ درمیانی تختوں کی دبازت نکال کر ہر درجہ یا منزل کی بلندی ۱۴ فٹ ہوئی۔ اب آپ ۴۵۰ فٹ لمبائی کو ۷۵ فٹ چوڑائی سے ضرب دیجئے تو معلوم ہوگا کہ ساری کشتی کا رقبہ ۱۰۱۲۵۰ مربع فٹ تھا اور ہر ہر درجہ کا رقبہ ۳۳۷۵۰ مربع فٹ گویا دو ایکڑ سے کچھ زیادہ جگہ کشتی میں پائی جاتی تھی۔ اب اسی کے ساتھ موجودہ جہاز سازی

کے اصول کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ جہاز کا ہر مربع فٹ ایک ہزار پونڈ وزن کو سنبھال سکتا ہے اس لئے نوح کی کشتی ۳۲۰۰۰ ٹن کا وزن لے جا سکتی تھی۔

جانوروں کی جغرافی تقسیم حسب بیان ڈاکٹر الفرڈ رسل یہ ہے کہ دنیا میں ۱۷۰۰ اقسام چوپایوں کی پائی جاتی ہیں، ۸۰۰۰ طیور کی، ۹۸۷ حیوانات سافلہ کی اور ۰۰۰۰۰ ا کیڑے مکوڑوں کی۔ بائبل کا بیان ہے کہ ہر قسم کے دو دو جوڑے کشتی میں تھے اس لئے اب سوال یہ ہے کہ وہ اس میں کیونکر سما سکے؟۔

۰۰ ایسٹیمر جو جانوروں کو لے جاتے ہیں۔ ہر گائے کے لئے ۲۰ مربع فٹ جگہ کا انتظام کرتے ہیں لیکن تمام چھوٹے بڑے جانوروں کو ملا کر اوسط ہر جانور کے سائز کا بلی کے برابر ہوتا ہے۔ اچھا اب فرض کیجئے کہ سب سے نیچے کی منزل چوپایوں کے لئے وقف تھی تو اگر ۱۰ مربع فٹ کا اوسط ہر جانور کے لئے قرار دیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ اس میں تقریباً ۳۲۰۰ چوپایوں کی جگہ موجود تھی۔ رہ گیا ان کی غذا کا سامان تو ظاہر ہے کہ جو وہ فٹ کی بلند منزل میں جانوروں کی اونچائی کے لحاظ سے اوپر چھت تک کافی جگہ اتنی نکل سکتی ہے کہ اس میں چارہ رکھا جائے۔ اب درمیانی منزل کو لیجئے اور فرض کیجئے کہ وہ حشرات اور حیوانات سافلہ کے لئے رکھی تھی تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ اتنی جگہ میں دو لاکھ کیڑے مکوڑے اور ۴۰۱۹ دوسرے حیوانات رکھنے کے بعد بھی کافی جگہ بچ سکتی ہے۔ اگر فی جانور ۲۴ مربع انچ جگہ کا اوسط رکھا جائے اور یہی باقی جگہ ان کی غذا رکھنے کے لئے کام آئی ہوگی، بالائی منزل طیور کے لئے وقف تھی جس میں خود نوح نے بیوی مع اپنے سات ہمراہیوں کے قیام کیا تھا۔ اگر ہر طائر کیلئے

اوسطاً ڈیڑھ مربع فٹ کا رکھا جائے تو اس میں کم از کم ۲،۰۱۴ چڑیاں رہ سکتی ہیں۔

آپ نے جواب کی نوعیت دیکھی کہ ریاضی کے حساب سے کتنی مکمل ہے۔ اور نوح کی کشتی میں ہزاروں وحوش وطیور کے سما جانے کو کتنی خوبصورتی سے ثابت کیا ہے۔ پھر ایک خالص مذہبی ذہنیت یقیناً اس کو اپنی فتحمندی قرار دے گی اور بائبل کے اس بیان کو الہام کی صورت سے پیش کرنے میں مطلق تامل نہ کرے گی لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ایک علمی میلان رکھنے والا انسان اس جواب سے مطمئن ہو سکتا ہے اور یہ بیان سن کر کیا اُسے واقعی یقین آگیا ہوگا کہ نوح کی کشتی میں ضرور تمام دنیا کے جانور پائے جاتے تھے؟ ہرگز نہیں۔

جواب دینے والے نے اس مسئلہ میں صرف کشتی کی وسعت کے مسئلہ کو لے لیا ہے یہ نہ دیکھا کہ من حیث الکل اس روایت میں اور کتنی باتیں ایسی ہیں جو عقل کے نزدیک قابل قبول نہیں ہیں۔ اگر اسے تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیا جائے کہ نوح نے واقعی اتنی بڑی کشتی بنائی تھی جس میں لاکھوں جوڑے وحوش وطیور کے آ سکیں تو بھی یہ سوال اپنی جگہ بدستور قائم رہتا ہے کہ وہ تمام دنیا کے وحوش وطیور کو ایک جگہ فراہم کیونکر کر سکے۔ کہہ دیجئے کہ کیا انسان جانوروں کو سدھا نہیں سکتا اور کیا سرکس میں ہم اس طرح کے تماشے روز نہیں دیکھتے کہ صرف ایک آواز پر جانور دوڑے چلے آتے ہیں یقیناً یہ جواب بھی قرین عقل ہے۔ اب تیسرے اعتراض کو لیجئے اور وہ یہ کہ وحوش وطیور میں بہت سے ایسے جانور پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے کے دشمن ہیں پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ سب ایک جگہ امن وآشتی کے ساتھ رہ سکیں جواب

کی اسی ذہنیت کو پیش نظر رکھ کہا جا سکتا ہے کہ انسان میں اتنی قوت مقناطیسی علوم جدیدہ کی روسے ثابت ہو چکی ہے کہ وہ اپنی قوت ارادی سے کام لے کر دوسرے کو کسی خاص میلان کی طرف مجبور کر سکے۔ اس لئے اگر نوحؑ نے جانوروں سے ان کی طبعی خصوصیات کو چند دنوں کے لئے معطل کر دیا ہو تو اس میں کون سا استحالۂ عقلی ہے چلئے قصہ ختم ہوا اور کشتی نوحؑ کی روایت دلائل عقلی سے ثابت ہو گئی لیکن آیئے ان دلائل کی بنا پر ایک بار پھر غور کریں کہ جواب کی صورت کیا ہوئی؟ صرف یہ کہ:-

(۱) حضرت نوحؑ بہت بڑے عالم حیوانات تھے اور ان کو معلوم تھا کہ دنیا میں اتنے قسم کے جانور پائے جاتے ہیں۔

(۲) حضرت نوحؑ بہت بڑے ریاضی داں تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ اتنے جانوروں کے لئے اتنی جگہ کافی ہو گی اور اسی حساب سے انھوں نے کشتی تیار کی۔

(۳) حضرت نوحؑ جانوروں کے سدھانے میں کمال رکھتے تھے یہاں تک کہ کشتی میں بیٹھے بیٹھے انھوں نے درندوں، چوپایوں، چڑیوں، اور کیڑے مکوڑوں کو بلا لیا۔

(۴) حضرت نوحؑ ایک ماہر مسمریزم تھے کہ انھوں نے تمام جانوروں کو اپنی مقناطیسی قوت سے مغلوب کر کے ان کی طبعی خصوصیات درندگی کی چھین لیا تھا۔

یقیناً ہمیں اس جواب پر یہ اعتراض کرنے کا حق حاصل نہیں ہے کہ حضرت نوحؑ نے یہ تمام علوم کب اور کہاں حاصل کئے تھے کیونکہ بہرحال انسان ہی یہ سب کچھ حاصل

کرتا ہے لیکن اس اعتراض کا جواب اہل مذاہب کے پاس کیا ہے کہ اگر ہم حضرت نوحؑ کی ان تمام کامیابیوں کو صرف علمی کامیابی قرار دیں تو پھر ان کی نبوت کے ثبوت میں کیا چیز پیش کی جائے گی اور ان کی مذہبی برگزیدگی ثابت کرنے کیلئے کس دلیل سے کام لیا جائے گا۔ کیونکہ اگر محض علم یا سائنس کی مدد سے کسی عجیب امر کا ظہور نبوت کا ثبوت ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس زمانہ میں ہم اڈیسن کو سب سے بڑا پیغمبر نہ قرار دیں، درانحالیکہ کوئی اہل مذہب اسے ایسا سمجھنے پر راضی نہیں ہو سکتا۔

اس سے قبل میں نے عرض کیا تھا کہ موجودہ اہل مذاہب کی یہ ذہنیت کہ وہ اعتراضات کا جواب علمی نظریوں کو سامنے رکھ کر دینا چاہتے ہیں مذہب کی اتنی بڑی شکست ہے کہ اس کے بعد وہ کسی طرح جاں بر ہو ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک کشتی نوح کی روایت ثابت کرنے کے لئے اہل مذاہب نے جو علمی دلائل پیش کئے ہیں ان سے ممکن ہے روایت تو ثابت ہو گئی ہو لیکن جناب نوحؑ کی رسالت و نبوت بالکل ہی ختم ہو جاتی ہے۔

ایک رسول کی رسالت کا تعلق صرف اس عقیدہ سے ہے کہ جو کچھ وہ کرتا ہے منجانب اللہ کرتا ہے اور اس میں کسی اکتساب یا جد وجہد کا دخل نہیں ہوتا۔ پھر چونکہ علمی توجیہات میں اس اکتساب کا ماننا ضروری ہے اس لئے علوم اکتسابیہ اور علم نبوت کا اجتماع تو کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ ایک پیغمبر دنیا کے تمام علوم کی مہارت ماں کے پیٹ سے لے پیدا ہوتا ہے تو بے شک یہ صورت

ایک مخصوص امتیاز کی پیدا ہو سکتی ہے لیکن اس دعوے کو کس علمی توجیہہ سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اگر اہل مذاہب ایسا کہیں بھی تو اسے ماننا کون ہے اور وہ اسے منوا بھی کیسے سکتے ہیں

مذہب نام ہے صرف کورانہ و جاہلانہ انقیاد و اطاعت کا اس لئے اس کا وجود، خواہ وہ ضروری ہو یا غیر ضروری، مفید ہو یا غیر مفید، صرف اسی طرح قائم رہ سکتا ہے کہ وہ اسی طرح جہل و لاعلمی کی دنیا میں رہے علم کے میدان میں اس کی تگ و دو حد درجہ نامقبول جسارت ہے کیونکہ یہیں آکر سب سے پہلے اس کے پائے لنگ کا حال لوگوں پر کھلتا ہے اور وہ ایک مضحکہ خیز چیز بن جاتا ہے۔

میں ان اہل مذاہب کو اچھا سمجھتا ہوں جو کسی علمی برہان و حجت کو اپنے پاس آنے ہی نہیں دیتے۔ اور خدا کو صرف "بلا دلیل" پہچاننے کے مدعی ہیں کیونکہ ان کے اندر ایک ایسا عزم راسخ پنہاں ہے کہ اس کے مقابلہ میں علم کو بھی خاموش رہ جانا پڑتا ہے لیکن وہ حضرات جو اپنے عقائد کی صحت میں عقلی دلائل پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں وہ حقیقتاً وہی ہیں جو مذہب کی طرف سے مطمئن بھی نہیں ہیں اور اس کے ترک کر دینے کی جرأت بھی اپنے اندر نہیں پاتے، یہ سب مذہب کے نہایت خطرناک دوست ہیں اور ایک نہ ایک دن انھیں دوستوں کی بدولت دنیا سے مذہب کو ختم ہو جانا ہے۔

کیا ہندوستان میں زکوٰۃ ادا کیا جانا واجب ہے

(جناب شفیق احمد خاں صاحب، جاگیردار، سرونج)

زکوٰۃ کے متعلق آپ کا کیا نظریہ ہے، زمانہ موجودہ میں ہندوستان میں مسلمانوں پر زکوٰۃ فرض ہے یا نہیں۔ مصالح مذہب پر غور کیا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ مصالح جنگی و عمومی کی غرض سے یہ ٹیکس قائم کیا گیا تھا اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں مسلمانوں پر بیت المال کی آمدنی کیلئے یہی ایک ٹیکس تھا اور کوئی ٹیکس نہ تھا گویا حکومت کو جو ٹیکس ادا کرنا چاہئے تھا وہ بصورت زکوٰۃ ادا کیا جاتا تھا اور عشر یا زکوٰۃ کے علاوہ مسلمان اور کوئی ٹیکس ادا نہیں کرتے تھے۔ اب ہندوستان میں مسلمان حکومت کو مختلف قسم کے بہت سے ٹیکس ادا کرتے ہیں اس لحاظ سے مسلمان تو اپنے مال سے اس رقم سے زیادہ دیدیتے ہیں جو اسلام چاہتا ہے۔ اب یہ بات علیحدہ رہی کہ غیر مسلم حکومت ہونے کی وجہ سے وہ تمام اغراض پوری نہیں ہوتیں جو حکومت اسلامیہ ہونے کی صورت میں ہونا چاہئے تھیں اس لئے زکوٰۃ مسلمانوں پر فرض نہیں رہتی جس طرح کہ غیر مسلم حکومت میں دیگر احکام شرعیہ کا نفاذ نہیں ہوتا اسی طرح معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ بھی فرض نہیں رہتی۔ یہ امر علماء کی نظر سے پوشیدہ تو نہ ہوگا لیکن ذریعہ آمدنی ہونے کی وجہ سے فرض نہ ہونا ظاہر نہیں کرتے اس لئے آپ سے استدعا ہے کہ غور فرما کر تفصیل سے

نگار میں شائع فرمایئے کہ درا صل ہندی مسلمانوں پر زکوٰۃ فرض ہے یا نہیں؟

عبادات ہوں یا معاملات اصل چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ انسان جو کام کرتا ہے وہ کس نیت و ارادہ سے کرتا ہے نیز یہ کہ اس کا اصل مقصود کیا ہے۔ پھر جس حد تک معاملات دنیاوی کا تعلق ہے خلوص نیت کی پہچان بین کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ ایک بد معاملہ انسان خود بہت جلد معلوم کر لیتا ہے کہ مکر و فریب سے سوائے نقصان کے کوئی فائدہ نہیں ہے اور اس لئے اس کو اپنے کئے کی سزا یہیں مل جاتی ہے لیکن اگر عبادات میں دیانت و امانت کا لحاظ نہ رکھا جائے تو کوئی پوچھنے والا نہیں سوائے اس صورت کے کہ مرنے کے بعد ہی نکیرین بھاری بھاری گرز لے کر آئیں اور مزاج پرسی کریں لیکن یہ صورت بالکل "مشت بعد از جنگ" کی سی ہے جس سے خدا اور بندہ دونوں میں سے کسی کا بھی فائدہ متصور نہیں۔

مثلاً آپ نماز کو لیجئے کہ اس کا اصل مقصود صرف یہ ہے کہ لوگوں میں اجتماعی احساس پیدا ہو اور ان میں باہم گر ایک دوسرے کے ساتھ اخوت و ہمدردی کے جذبات پیدا ہوں لیکن اگر اس مقصد کو نظر انداز کر دیا گیا اور صرف اٹھنے بیٹھنے ہی کو اصل مدعا سمجھ لیا گیا تو کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ ادائے نماز کا فرض پورا ہو گیا۔ یقیناً نہیں ہوا۔

اب آپ مسئلہ زکوٰۃ کو لیجئے۔ اس میں شک نہیں کہ ادائے زکوٰۃ کے لئے

مخصوص حالات کا پایا جانا ضروری ہے یعنی جب تک مال کی کوئی معین مقدار ایک متعین زمانہ تک کسی کے پاس نہ پائی جائے زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، یہ تو ہوئی قانونی صورت لیکن زکوٰۃ کا اصل مقصود کیا ہے؟ اپنے عزیزوں اور قوم کے ان افراد کی جو مستحق امداد ہیں، مدد کرنا۔ اس لئے اگر کوئی شخص اس مقصود کو نظر انداز کرکے صرف قانونی حیلہ جوئیوں سے اپنے آپ کو ناقابل ادائے زکوٰۃ ثابت کرے تو آپ اس کو کیا کہیں گے ـــــ فقہی کتابوں میں زکوٰۃ سے بچنے کی متعدد صورتیں ظاہر کی ہیں اور ہمارے بہت سے علماء کرام ان پر عمل بھی کرتے ہیں ـ مثلاً یہ کہ اختتام سال کے قریب تمام مال بیوی کے نام منتقل کر دیا اور جب دوسرا سال ختم ہونے میں آیا تو بیوی نے پھر میاں کو دیدیا ـ لیکن افسوس ہے کہ فقہ اسلامی نے ان بہانہ سازیوں کا کوئی انسداد نہ کیا۔ ایسے لوگوں کو صرف عذاب خداوندی کے حوالہ کرکے خاموش ہو جانا کبھی ایسی فطرت والوں کے لئے باعث عبرت نہیں ہو سکتا۔ ضرورت تھی کہ ایسی صورتوں میں دوچند زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا جاتا اور محتسب کو اختیار دیا جاتا کہ وہ ایسے بدطینت لوگوں اور شرعی بہانہ ڈھونڈنے والے مولویوں کی دُرّوں سے خبر لے۔

الغرض ایک چیز قانون پر عمل کرنا ہے اور دوسری چیز اس کی روح سمجھنا ہے آج کل مسلمان نمازیں بھی پڑھتے ہیں، روزے بھی رکھتے ہیں، حج بھی کرتے ہیں، زکوٰۃ بھی دیتے ہیں لیکن صرف قانونی حیثیت سے، رسمی صورت سے۔ اصل مقصود و مدعا کسی کے سامنے نہیں ہے اور یہی وہ چیز ہے جس نے ہمارے مذہب کو بے روح

اور ہمارے اجتماع کو درہم برہم کر دیا۔

یہ میں نے اس لئے ظاہر کیا کہ آپ کے استفسار سے بھی اسی قسم کی شرعی بہانہ جوئی کی جھلک ظاہر ہوتی ہے۔ آپ کا یہ فرمانا بالکل درست ہے کہ حکومت کی طرف سے جو ٹیکس آپ پر عاید ہوتے ہیں وہ زکوٰۃ کی اس رقم سے زیادہ ہوتے ہیں جو شرعاً آپ کو ادا کرنا چاہئے لیکن چونکہ زکوٰۃ کا اصل مقصود اس سے پورا نہیں ہوتا اس لئے آپ اُسے زکوٰۃ میں محسوب نہیں کر سکتے اور نہ اصولاً کرنا چاہئے۔

حکومت جو ٹیکس آپ سے وصول کرتی ہے وہ معاوضہ ہے اس بات کا کہ آپ کے موٹروں کے لئے وہ صاف ستھری سڑکیں تیار کرتی ہے۔ آپ کے بقائے صحت کے لئے شہر کی صفائی کا اہتمام کرتی ہے اور آپ کی سیر و تفریح کے لئے نزہت گاہیں قائم کرتی ہے اور اگر آج بجائے برطانیہ کے آپ ہی کی حکومت یہاں ہوتی تو کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ زکوٰۃ کے وہ احکام جو ساڑھے تیرہ سو سال قبل نافذ کئے گئے تھے اس وقت بھی مناسب سمجھے جاتے اور اگر زکوٰۃ کے متعلق وہی احکام قائم رہتے تو کیا ان تمام عمرانی ضروریات کے لئے جو ترقی زمانے کے ساتھ ساتھ سامنے آتی ہیں کوئی اور ٹیکس آپ پر عائد نہ کیا جاتا۔

پھر اس کو بھی جانے دیجئے میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ وہ لوگ جو حکومت کو ٹیکس ادا کرتے ہیں کیا اتنے غریب ہو جاتے ہیں کہ سوائے اسباب سد رمق کے ان کے پاس اور کچھ باقی نہیں رہتا۔ پھر اگر صورت حال یہ نہیں ہے تو ادائے زکوٰۃ کے باب میں ٹیکس کی ادائی کا بہانہ کیوں ڈھونڈا جائے۔

میں دیکھتا ہوں کہ ایک شخص ٹیکس ادا کرتا ہے لیکن اس کے موٹر کے پٹرول کا خرچ بھی وہی ہے اور سینما جانے کے مصارف بھی وہی ہیں وہ بدستور نفیس کپڑے پہنتا ہے اور لذیذ غذائیں کھاتا ہے پھر کس قدر افسوسناک ذہنیت ہے کہ ٹیکس کا بار ہمارے تعیشات زندگی میں تو کسی کمی کا باعث ہو نہیں اور ادائے زکوٰۃ کے باب میں ہم اس کا حیلہ ڈھونڈھیں۔

آج یہاں مسلمانوں کی حکومت ہو یا نہ ہو، شرع اسلام کا نفاذ ہو یا نہ ہو ٹیکس کا بار آپ کے لئے قابل برداشت ہو یا نہ ہو لیکن یاد رکھئے کہ زکوٰۃ کا بار آپ کے سر سے اس وقت تک ہلکا نہیں ہو سکتا جب تک قوم کا ایک فرد بھی محتاج و مفلس باقی ہے۔

آپ ٹیکس سے بچنے کے لئے جھوٹے رجسٹر بنا سکتے ہیں غلط اندراجات سے اپنی آمدنی کم دکھا سکتے ہیں رشوتیں دے دے کر یا سفارشیں پہونچا پہونچا کر اس بار کو ہلکا کر سکتے ہیں لیکن آپ اس حقیقت کو کیونکر نظرانداز کر سکتے ہیں کہ ٹھیک اس وقت جب آپ موٹر پر سوار ہو کر نکلتے ہیں آپ کا ایک بیمار و پاشکستہ عزیز جھونپڑے کے اندر پڑا کراہ رہا ہے۔ اور اسی لمحہ میں جب آپ کی میز لذیذ کھانوں کی وزنی قابوں سے جرجراتی ہوتی ہیں آپ کے محلے کے خدا جانے کتنے یتیم بچے اور کتنی ضعیف بیوائیں فاقہ کے عذاب میں مبتلا ہیں پھر اگر آپ اس حقیقت کو نظرانداز کر سکتے ہیں تو بیشک ادائے زکوٰۃ کے لئے ٹیکس کا بہانہ پیش کر کے آپ اس سے نجات حاصل کریں لیکن اگر ایسا ممکن نہیں ہے تو پھر ایسے شرعی حیلے تلاش کرنا صرف اسی

موّزیانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے جو شعائر مذہب کو رسم و رواج کی صورت توڑ سکتی ہے لیکن مذہب کی روح سے باخبر رہ کر اپنے کو ایثار و قربانی کے عذاب میں مبتلا نہیں کر سکتی ؎

خویش را صورت پرستاں ہرزہ رسوا کردہ اند
جلوہ می نامند و در معنی نقابے بیش نیست

علامہ مشرقی اور قبلہ کا رُخ

(جناب محمد سعید الرحمان صاحب، لاہور)

آپ نے غالباً علامہ مشرقی کا پمفلٹ نمبر۴ دیکھا ہوگا جس میں انھوں نے ملک محمد الدین صاحب کے ایک استفسار کا جواب دیتے ہوئے ظاہر کیا ہے کہ ہندوستان کی تمام نئی مسجدوں کا قبلہ غلط ہے یعنی مسجدوں کا رُخ صحیح نہیں ہر لاہور و امرتسر والوں کا قبلہ بیت المقدس ہے۔ راولپنڈی والوں کا بغداد و دمشق، پشاور والوں کا بیروت، دہلی والوں کا بوشہر، ملتان کا کوفہ کراچی والوں کا مدینہ، مدراس والوں کا عدن، بمبئی والوں کا بندرگاہ سواکن وغیرہ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ چونکہ ہندوستان کے مسلمانوں کی پچھلی کئی قرنوں کی نمازیں قبلہ کی طرف ادا نہیں ہوئیں اس لئے قبول نہیں ہوئیں اور یہ مولویوں کا اتنا بڑا جہل ہے کہ اگر مصطفےٰ کمال کی تلوار ہندوستان میں ہوتی

تو وہ ہندوستان کے تمام ملاؤں کو تہ تیغ کر دیتی۔
آپ کی اس مسئلہ میں کیا رائے ہے!

یہ پمفلٹ میری نگاہ سے گزرا ہے اور اس کے دیکھنے کے بعد میرے شبہات علامہ مشرقی کی طرف سے اور زیادہ بڑھ گئے ہیں پچھلے مہینے کے نگار میں آپ نے میری رائے خاکسار تحریک کے متعلق دیکھی ہوگی اور اب اس پمفلٹ کے مطالعہ کے بعد میں اس پر اور زیادہ راسخ و مستحکم ہو گیا ہوں۔

خاکسار تحریک کے آغاز سے بہت پہلے علامہ مشرقی سے میرا غائبانہ تعارف ان کی مشہور کتاب "تذکرہ" کے ذریعہ سے ہوا تھا اور میں نے ان کو ایک آزاد خیال شخص سمجھ کر اس کتاب پر ریویو کرتے ہوئے بعض مسائل میں ان کی تائید بھی کی تھی اس کے بعد ایک زمانہ گزر گیا اور مجھے نہیں معلوم کہ مصنف تذکرہ کہاں رہے اور کیا کرتے رہے۔ یہاں تک کہ دفعتہً اُن کی طرف سے خاکسار تحریک کا آغاز ہوا۔ اور رفتہ رفتہ اس نے اس قدر وسعت اختیار کی کہ میرے گوشۂ تنہائی میں بھی اس کی آواز پہونچی اور میں نے غور کرنا شروع کیا کہ اس تحریک کی غایت کیا ہو سکتی ہے اور جس نتیجہ پر پہونچا وہ آپ کو معلوم ہی ہو چکی ہے۔

جس وقت میں دیکھتا ہوں کہ پمفلٹ زیر بحث تذکرہ کے مصنف کا لکھا ہوا ہے تو میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ تذکرہ کا مشرقی ایک ایسا آزاد خیال انسان ہے جو ظاہری قیود شریعت سے بھی بیگانہ نظر آتا ہے اور وہ تمام شعائر اسلامی

پر ان کے مغز و روح کے لحاظ سے گفتگو کرتا ہے یہاں تک کہ وہ نماز و روزہ کو بھی بیکار سمجھتا ہے اگر اُن سے اجتماعیت و استعلاء پیدا کرنے کا کام نہ لیا جائے برخلاف اس کے پمفلٹ زیر بحث کا مصنف مشرقی ایک ایسا قدامت پرست تاریک ذہنیت رکھنے والا انسان ہے جو مذہب کے ظواہر پر اتنا زور دیتا ہے کہ اگر کسی مسجد کا رخ جغرافی و ہیئتی پیمایش کے لحاظ سے ٹھیک کعبہ کی طرف نہ ہو تو وہاں کی نمازیں بیکار رہیں اور ان کے بنانے والے اُس کے نزدیک قتل و قصاص کے مستوجب ہیں یعنی وہی انسان جس نے کسی وقت "اینما تولوا فثم وجہ اللہ" سے اسلام کے وسیع اصول عبادت و طاعت کو پیش کیا تھا آج وہی اتنا تنگ خیال نظر آتا ہے کہ جب تک مسجدوں کا رخ ٹھیک غلاف کعبہ کی طرف نہ ہو نہ نماز ادا ہو سکتی ہے اور نہ ان مسجدوں کا نمازی مسلمان کہلایا جا سکتا ہے۔

بے شک کلام مجید میں "فولوا وجوہکم شطر المسجد الحرام" کا حکم پایا جاتا ہے۔ لیکن شطر کے معنی "جہت و سمت" کے بھی ہیں اور کسی جہت کی طرف رخ کرنے کے معنی یہ نہیں ہوا کرتے کہ ریاضیات کی مدد سے اُسے متعین کیا جائے۔ اگر علامہ مشرقی کے مشورہ کے مطابق ہر مسجد کا رُخ غلاف کعبہ کے ٹھیک درمیانی حصہ کی سمت ہونا چاہئے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ایک ہی شہر کی ہر مسجد کا رخ دوسری سے مختلف ہونا چاہئے۔ چہ جائیکہ تمام ہندوستان کہ اس صورت میں تو یہ فرق بہت زیادہ نمایاں ہوگا۔

علامہ مشرقی کو معلوم ہونا چاہئے کہ کلام مجید نہ ہیئت و جغرافیہ کی کتاب ہے نہ فلسفہ و ریاضی کی، اس میں صرف اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے اور تمام انھیں آسانیوں

کے ساتھ جو عامۃ الناس کے لئے قابل قبول ہوں۔ کلام مجید میں اگر "شطر المسجد الحرام" منھ کرکے نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ پہلے ہیئت میں کمال حاصل کیا جائے اور پھر عبادت کی جائے بلکہ مقصود صرف اجتماعیت کی شان پیدا کرنا ہے اور اس غرض کے لئے صرف اس قدر ہدایت کافی تھی کہ کعبہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھو اگر ہیئت کے نقطۂ نظر سے مسجدوں کا رخ گز دو گز ادھر ادھر ہٹا ہوا ہے تو اس سے اصل مقصود فوت نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے اگر یہ کہا جائے کہ "شطر المسجد الحرام" کی شرط پوری ہو ہی نہیں سکتی جب تک ایک ایک دقیقہ وثانیہ کا حساب کرکے صحیح سمت متعین نہ کیا جائے تو اس سے اصل مقصود (طاعت وعبادت یا اجتماعیت) ضرور فوت ہو جائے گا اور رصدگاہیں قائم کرکے صرف ہیئت کا مطالعہ کرنا مدعا رہ جائے گا۔

اگر علامۂ مشرقی کلام مجید کی اس آیت میں اس قدر احتیاط تعمیل ضروری جانتے ہیں تو وہ ان آیات کی کیا تاویل کریں گے جو طبقات الارض اور ہیئت کے اکثر مسلمہ مسائل کے خلاف ہیں اور اگر وہ ان آیات کی تاویل کرکے کوئی ایسا مفہوم پیدا کرسکتے ہیں جو علوم جدیدہ کے منافی نہ ہو تو پھر "شطر المسجد الحرام" والی آیت کے متعلق کیوں اس قدر احتیاط وسختی برتی جاتی ہے

حقیقت یہ ہے کہ ایک اخلاقی مصلح عوام کو کبھی دماغی الجھن میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا وہ تو نہایت سیدھے سادے الفاظ میں انھیں کے روزانہ مشاہدات وتجربات کی بنا پر اعتبار وبصیرت کی تعلیم دیتا ہے وہ ہمیشہ یہی کہے گا۔ کہ "دیکھو سورج ڈوب

رہا ہے۔ اور وہ یہ کبھی نہ کہے گا کہ "وہ دیکھو زمین کا محدب حصہ ہمارے اور سورج کے درمیان آگیا ہے۔ وہ اگر زمین کو سطح کہتا ہے تو صرف اس لئے کہ وہ ایسی ہی نظر آتی ہے اور وہ اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ زمین مدور رہے یا غیر مدور اور اگر مدور ہے تو اس کی گولائی گنبد کی طرح ہے یا نارنگی کی طرح۔

پھر جب اس قسم کی چھان بین کلام مجید کی تعلیمات سے علیحدہ ہے تو مسجدوں کا رُخ متعین کرنے میں اتنی سختی برتنا کہ اگر ہمارا منہ غلاف کعبہ کی سمت سے ذرا بھی ہٹ گیا تو نماز درست نہ ہوگی، کہاں تک قرین انصاف ہو سکتا ہے

دیکھنا صرف یہ ہے کہ جس وقت مسلمان اپنی مسجدوں میں جا کر نمازیں ادا کرتے ہیں تو ان کے ذہن میں کعبہ کا رخ ہوتا ہے یا کسی اور جگہ کا، اگر ان کے دل و دماغ کی توجہ کعبہ اور مسجد الحرام کی طرف ہوتی ہے تو پھر کوئی مضائقہ نہیں۔ اگر مسجد کی جغرافی سمت کچھ بدلی ہوئی ہے اور اگر ان کی توجہ خانہ کعبہ سے ہٹی ہوئی ہے تو پھر مسجدوں کا صحیح رُخ بھی نمازوں میں کوئی معنویت پیدا نہیں کر سکتا۔ عبادت کا اصل مقصود توجہ الی اللہ ہے یہاں تک کہ "قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں" چہ جائیکہ مسجد یا سمت کو اصل مقصود قرار دینا کہ اس سے زیادہ گری ہوئی بات کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔

معلوم ہوتا ہے کہ علامہ مشرقی کا مقصود مسلمانوں میں اجتماعیت پیدا کرنا نہیں بلکہ ان میں افتراق پیدا کرنا اور ایک خاص جماعت ایسی بنا لینا ہے کہ جو ان کے مخصوص اغراض کی تکمیل میں ان کو مدد پہنچائے۔ مسلمانوں کی حالت چونکہ اسوقت

بالکل اس شعر کے مصداق ہے کہ

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اس لئے علامہ مشرقی سجدوں کا رخ بدل دیں، کعبہ ہٹا کر کسی دوسری جگہ لے جائیں۔ جو چاہیں کریں لیکن جب منزل حقیقتوں کے بے نقاب ہونے کی آئے گی اُس وقت مسلمانوں کو معلوم ہوگا کہ :۔

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

آتشِ نمرود

(جناب سید محمد صالح صاحب۔ مراد آباد)

"حضرت ابراہیم کے اس واقعہ کے متعلق کہ نمرود نے انھیں آگ میں پھینک دیا اور آگ نے کوئی اثر نہ کیا؟ آپ کا کیا خیال ہے۔ کلام مجید میں اس واقعہ کا بیان ہونا اس کا ثبوت ہے کہ یہ واقعہ سچا ہے کیونکہ یہ الہام خداوندی ہے اور الہام غلط نہیں ہو سکتا؟"

آپ نے یہ سوال اگر اس قدر سادگی سے نہ کیا ہوتا تو شاید میں جواب نہ دیتا۔ لیکن آپ کی معصومیت نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں جلد سے جلد آپ کو اپنی رائے

سے مطلع کردوں خواہ وہ آپ کی توقع کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

آپ کے اس استفسار نے بحث کے تین پہلو پیش کرئے ہیں ایک یہ کہ کلام مجید الہام خداوندی ہے یا نہیں، دوسرے یہ کہ قرآن میں اس واقعہ کا پایا جانا اس کی صداقت کا ثبوت ہو سکتا ہے یا نہیں، اور تیسرے یہ کہ نفس واقعہ کی تاریخی و علمی حیثیت کیا ہے؟

کلام مجید کو میں نہ کلام خداوندی سمجھتا ہوں نہ الہام ربانی، بلکہ ایک انسان کا کلام جانتا ہوں، اور اس مسئلہ پر میں اس سے قبل کئی بار مفصل گفتگو کر چکا ہوں کلام کا مفہوم اس وقت تک متعین نہیں ہو سکتا جب تک "نطق" اس سے متعلق نہ ہو، اور نطق نام ہے مخصوص عضلات کی حرکت کا اس لئے اگر ہم خدا سے کسی کلام کو منسوب کریں گے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے لئے نطق بھی لازم ہوگا جس کا تعلق یکسر ادیات سے ہے۔ علاوہ اس کے الہام خداوندی کو کسی ایک یا ایک سے زائد مخصوص زبانوں میں محدود کر دینا پڑیگا اور چونکہ صفات ربانی عین ذات ربانی ہیں اس لئے اس طرح گویا خدا کو محدود کر دینا ہوگا جو عقیدۂ اسلام کے بالکل منافی ہے۔

اسی کے ساتھ ایک اعتراض یہ بھی وارد ہوتا ہے کہ کیا خدا صرف عربی و عبرانی زبانوں ہی میں نطق کر سکتا تھا اور دوسری زبانوں میں نہیں اگر اس کا جواب یہ دیا جائے کہ وہ تمام زبانیں جانتا ہے تو مناسب یہ تھا کہ مختلف قوموں کی مختلف زبانوں میں وحی بھیجتا تاکہ ان کو سمجھنے میں آسانی ہوتی۔ صرف اہل عرب

کی زبان میں اپنا کلام نازل کرنا اور تمام دنیا کے انسانوں کو مجبور کرنا کہ اسے سمجھیں اور کلام ربانی قرار دیں کسی طرح قرین انصاف قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ بات مسلم ہے کہ دنیا کی تمام زبانیں انسان ہی کی بنائی ہوئی ہیں جو پہلے صرف اشارات یا خارجی صوت و صدا کی صورت رکھتی تھیں اور بعد کو آہستہ آہستہ ترقی کرکے جذبات کے اظہار کا ذریعہ قرار پائیں اس لئے بجائے اس کے ہم خدا کو تمام زبانوں کا ماہر قرار دیں یہ کیوں نہ کہیں کہ خدا نے انسان میں یہ قدرت ودیعت کر دی تھی کہ وہ خود جذبات کے اظہار کے لئے زبان وضع کرے اور اس طرح گویا فی المعنی وہی زبانوں کا بھی پیدا کرنے والا ہے

اس صورت میں الہام یا وحی سے مراد صرف وہ تاثرات ہوں گے جو ایک انسان یا رسول کے دل و دماغ میں پیدا ہوتے ہیں اور جنہیں وہ مروجہ زبان میں نہایت کامیابی و خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کر دیتا ہے۔ اس امر کا ثبوت کہ وحی کا تعلق کسی مخصوص زبان سے نہیں ہے خود کلام مجید میں بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے "ثم اوحی ربک الی النحل" ظاہر ہے کہ شہد کی مکھی پر عربی یا عبرانی میں تو وحی نازل ہوئی نہ ہوگی۔ بلکہ اس سے مراد مکھی کی وہ فہم و ذکاوت ہوگی جس کے زیر اثر وہ پھولوں کا رس جا کر چوستی ہے۔ کلام مجید کو بھی وحی کہتے ہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اس کو بھی رسول کی فہم و فراست سے تعبیر نہ کیا جائے اور خواہ مخواہ الفاظ یا کلمات سے متعلق سمجھا جائے جن کا تعلق مادی دنیا سے ہے بہرحال میں قرآن کی کسی حکایت کو محض اس بنا پر کہ اسے

الہام خدا وندی سمجھا جاتا ہے صحیح یا وہ نہیں کرسکتا کیونکہ الہام کا تعلق الفاظ سے مطلق نہیں ہے لیکن چونکہ میں رسول اللہ کو بڑے بلند اخلاق کا آدمی سمجھتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے تھے اس لئے قرآن میں واقعۂ ابراہیم کا پایا جانا اس امر کی دلیل تو ضرور ہے کہ رسول اللہ نے اُسے جھوٹ بیان نہیں کیا یعنی اپنی طرف سے گھڑ کے بیان نہیں کیا۔لیکن اس کا اثر نفس واقعہ کی صحت یا عدم صحت پر بالکل نہیں پڑتا۔

کلام مجید میں اسرائیلیات کا حصہ کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتا اور نہ اسے کلام مجید میں درج ہونے کی وجہ سے صحیح کہا جاسکتا ہے۔عہد نبوی میں اس قسم کی روایتیں توریت وانجیل کے حوالے سے لوگوں کو بہکانے اور ڈرانے کے لئے یہود و نصاریٰ کی طرف سے عام طور پر بیان کی جاتی تھیں اور چونکہ توریت وانجیل کے الہامی ہونے کا غلط خیال پہلے ہی سے قائم تھا اس لئے رسول اللہ نے بھی ان کو محض اعتبار وابصیرت کے لئے بیان کردیا اور اس سے کوئی بحث نہیں کی کہ وہ صحیح ہیں یا غلط۔

اس طرح کی حکایتیں دنیا کے تمام مذاہب بلکہ مذاہب کے وجود سے قبل انسان کے عہد وحشت میں بھی جہل وکم علمی کی وجہ سے رواج پاچکی تھیں جن کو قرآن نے بھی "اساطیر الاولین" یا اصنامی روایتوں سے تعبیر کیا ہے۔

اب آپ آتش نمرود کے واقعہ کو لیجئے تو معلوم ہوگا کہ کلام مجید میں بھی تقریباً وہی بیان کیا گیا ہے جو یہودیوں کی کتاب (MIRBASH RABBA) میں پایا جاتا ہے

پہلے آپ اسلامی روایت مختصراً سن لیجئے۔

"ابراہیم کی پرورش ایک غار میں ہوئی تھی اور انھیں سچے خدا کا کوئی علم نہ تھا۔ پہلے انھوں نے چمکتے تاروں کو خدا سمجھا۔ پھر چاند کو اور اس کے بعد آفتاب کو لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ یہ سب ڈوب جاتے ہیں تو وہ اس شرک سے منھ موڑ کر خدائے واحد پر ایمان لے آئے۔

ان کے باپ آذر بت تراش تھے اور بت بنا بنا کر ابراہیم کو دیا کرتے تھے کہ بازار جا کر بیچ لائیں۔ لیکن چونکہ وہ بت پرستی چھوڑ چکے تھے اس لئے وہ ان کو فروخت نہ کر سکتے تھے نہ ان کے منھ سے بتوں کی برائیاں سن سن کر ان سے کوئی خریدتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم ان کی طرف مائل ہو چلی۔ اور انھوں نے اپنے باپ آذر کو بھی اپنا دین قبول کرنے کی دعوت دی "یا ابت لم تعبد ما لا یسمع و لا یبصر و لا یغنی عنک شیئاً (اے باپ تم کیوں اس کی پرستش کرتے ہو جو نہ سنتا ہے نہ دیکھتا ہے نہ تمہارے کسی کام آسکتا ہے)۔

آذر نے ابراہیم کی اس دلیل کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اور رفتہ رفتہ یہ بات نمرود کے کانوں تک پہونچی۔ نمرود نے ابراہیم کو بلا کر پوچھا کہ "تیرا خدا کیا ہے" انھوں نے جواب دیا کہ "میرا خدا وہ ہے جو زندہ رکھتا ہے اور مار ڈالتا ہے"۔ نمرود نے کہا "یہ تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ واجب القتل لوگوں میں سے جن کو چاہوں مار ڈالوں اور جس کو چاہوں نہ ماروں"۔ یہ سن کر ابراہیم نے کہا کہ "میرا خدا آفتاب کو مشرق کی طرف سے نکالتا ہے تو اُسے مغرب کی طرف سے طلوع کر کے دکھلا"۔ کہا جاتا ہے کہ

یہ جواب سن کر نمرود گھبرا گیا حالانکہ اگر وہ بھی الٹ کر یہی کہہ دیتا کہ میں آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہوں تو اپنے خدا سے کہہ کہ وہ مغرب سے نکالے تو شاید ابراہیمؑ کے پاس کوئی جواب نہ رہ جاتا۔

ابراہیمؑ کی قوم ہر سال ایک عظیم الشان تہوار منایا کرتی تھی جس میں کھانے تیار کر کے لوگ شہر سے باہر لے جاتے اور بتوں کے سامنے رکھ دیتے۔ ابراہیمؑ نے بتوں کے سامنے کھانا رکھا ہوا دیکھ کر ان سے طنزاً کہا کیا تم نہیں کھاؤ گے اور پھر ان بتوں کو توڑ کر کلہاڑی بڑے بت کے شانہ یا گردن میں لٹکا دی جس سے یہ ظاہر ہو کہ اسی بت نے دوسرے چھوٹے بتوں کو توڑا ہے۔

اس واقعہ پر بڑا ہنگامہ برپا ہوا اور آخر کار جب ابراہیمؑ سے سوال و جواب میں لوگ نہ جیتے تو لوگوں نے ان کو آگ میں ڈال کر جلا دینے کا مطالبہ کیا۔ میں اس جگہ ان روایات کو نظر انداز کرتا ہوں جو آگ کی تیاری کے سلسلے میں بیان کی جاتی ہیں اور جن کا تعلق قرآن کے بیان کردہ واقعات سے نہیں ہے۔ الغرض ابراہیمؑ آگ میں ڈال دیے گئے لیکن خدا نے آگ کو حکم دیا کہ "کونی برداً وسلاماً علی ابراہیم" (ابراہیم کے لیے تو ٹھنڈک اور سلامتی میں تبدیل ہو جا) اور اس طرح حضرت ابراہیمؑ بچ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر خدا صرف بَرداً کہہ کر خاموش ہو جاتا اور سلاماً کا حکم نہ دیتا تو وہ آگ اتنی سرد ہو جاتی کہ ابراہیمؑ بجائے آگ کی گرمی کے اس کی سردی سے فنا ہو جاتے، یہ ہے خلاصہ اسلامی روایت کا۔

اب یہودیوں کی کتاب "مدراش ربا" کے بیان کو سنیئے۔

تیرآہ یا زیرآہ (TERAH) ایک بت ساز تھا۔ ایک بار وہ کہیں باہر گیا
اور دوکان پر ابراہیم کو بٹھا گیا جب کوئی شخص بت خریدنے آتا تو ابراہیم اس
سے پوچھتے تیری عمر کیا ہے وہ کہتا پچاس یا ساٹھ سال، ابراہیم کہتے افسوس ہے
کہ تیری عمر پچاس ساٹھ سال کی ہوگئی اور تو ایسی چیز کو پرستش کرتا ہے جو ابھی
بنائی گئی ہے۔ ایک مرتبہ کوئی عورت آئی جس کے ہاتھ میں آٹے کی تھالی تھی اس
نے ابراہیم سے کہا یہ لو اور بتوں کے آگے رکھدو۔ وہ اٹھے اور ڈنڈا لے کر سب
بتوں کو توڑ دیا اور پھر ڈنڈا بڑے بت کے ہاتھ میں دیدیا۔ جب ان کا باپ واپس
آیا اور یہ حال دیکھا تو ابراہیم نے کہا کہ بڑے بت نے چھوٹے بتوں کو توڑ ڈالا ہے
یہ سن کر تیرآہ ابراہیم کو نمرود کے پاس لے گئے، نمرود نے ابراہیم سے کہا آؤ آگ
کی پرستش کریں۔ ابراہیم نے جواب دیا پانی کی پوجا کیوں نہ کریں جو آگ کو بجھا
دیتا ہے۔ نمرود نے کہا اچھا آؤ پانی ہی کی پرستش کریں۔ اس پر ابراہیم نے کہا اگر
ایسا ہی ہے تو پھر بادل کی پوجا کیوں نہ کریں جس سے پانی برستا ہے، نمرود نے
کہا اچھا آؤ بادل ہی کی پرستش کریں۔ ابراہیم نے جواب دیا کہ اگر ایسا ہی ہے تو
پھر ہوا کی پوجا کیوں نہ کریں جو بادلوں کو ہنکاتی پھرتی ہے۔ نمرود نے کہا اچھا آؤ
ہوا ہی کی پوجا کریں۔ اس پر ابراہیم نے کہا کہ پھر انسان ہی کی پوجا کیوں نہ کریں
جو ہوا کو روک لیتا ہے۔

یہ سن کر نمرود بگڑ گیا اور بولا بس خاموش رہ۔ میں کسی چیز کی پرستش نہیں
کرتا صرف آگ کو پوجتا ہوں، دیکھ میں تجھے آگ میں ڈالے دیتا ہوں، دیکھوں

ہرا خدا تجھے کیوں کر بچاتا ہے"۔ چنانچہ ابراہیم کو نمرود نے آگ میں ڈلوا دیا لیکن آگ نے انھیں نہ جلایا۔

"مدراش رَبّا" کی اس روایت اور روایتِ اسلامی کا پس منظر بالکل ایک ہے اور تھوڑا سا اختلاف جو تفصیل جزئیات میں پایا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے ۔ جس طرح ہر زمانہ میں ایک ہی روایت مختلف طریقوں سے بیان کی جاتی ہے اسی رح یہ روایت بھی رسول اللہ کے زمانہ میں کچھ اختلاف کے ساتھ بیان کی جاتی وگی اور رسول اللہ نے اس بیان کو زیادہ قرین قیاس و مناسب سمجھا جو کلام مجید بں پایا جاتا ہے۔

قرآن میں ابراہیم کے باپ کا نام آذر بتایا گیا ہے اور "مدراش رَبّا" کی روایت بں تیراہ ہے لیکن چونکہ بعض یہودی بجائے تیراہ کے زراہ (ZARAH) بھی کہتے تھے س لئے ہو سکتا ہے کہ آذر اسی کی بگڑی ہوئی صورت ہو۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں یہ واقعہ صرف یہودی روایتوں سے لیا گیا ہے جس کی صدیق توریت و ناموسِ موسیٰ سے بھی ہوتی ہے بلکہ توریت کی کتاب پیدائش سے تو معلوم ہوتا ہے کہ نمرود ابراہیم سے صدیوں پہلے پایا جاتا تھا بعض محققین کا بیان ہے ، اس قصہ کی ساری بنیاد ایک یہودی کی جاہلانہ غلطی ہے۔ اس یہودی کا نام جوناتھن فا اس کی تفصیل سننے کے قابل ہے۔ توریت سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے ابراہیم کالڈیا یں رہتے تھے اور پھر خدا نے انھیں کنعان میں جا کر رہنے کا حکم دیا اس کو توریت میں س طرح بیان کیا ہے "میں وہ خدا ہوں جس نے تجھے کالڈیا کے اُور سے باہر نکالا"

اور قدیم بابلی زبان میں شہر کو کہتے تھے جیسے اور وشلم یعنی "دارالسلام" لیکن اسی لفظ کے معنی آرامی زبان میں آگ کے ہیں چونکہ یہ یہودی بابلی زبان نہ جانتا تھا اس لئے اور کے معنی آگ سمجھ کر توریت کی اس آیت کا مفہوم اس نے یہ بیان کیا کہ "میں وہ خدا ہوں جس نے تجھے کالڈیا کی آگ سے باہر نکالا" اور اس طرح ایک یہودی کی غلطی سے ابراہیم کے آگ سے نکالے جانے کی روایت وجود میں آئی جس میں بعد کو لوگوں نے زیب داستان کے لئے وہ سب کچھ اضافہ کرلیا جو مرداش ربا اور کلام مجید کی روایت میں پایا جاتا ہے۔

میں آخر میں پھر عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ قرآن میں جتنے قصے بیان کئے گئے ہیں ان کو تاریخی حقیقت وصداقت کی حیثیت سے بیان نہیں کیا گیا بلکہ صرف اعتبار وبصیرت کے لئے بیان کیا گیا ہے۔ اس لئے ان حکایات وقصص سے اس کے الہامی یا غیر الہامی ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

قرآن وحدیث کی زبان کا فرق

(جناب عبدالمجید صاحب حیرت بی اے۔ نئی دہلی)

"قرآن کا کلام خدا ہونا کیا معنی رکھتا ہے" تازہ نگار دیکھا اور وہ بھی جس سے جولائی میں اس بحث کا آغاز ہوا۔ اس سلسلہ میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کی زبان اور ہے اور حدیث مستند کی زبان اور۔ آپ

اس کی توجیہہ کیونکر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آیات ایک خاص کیفیت رکھتی ہیں
جسے وحی کہئے اور اقوال دوسری نوعیت۔"

آپ نے جس بحث کو پیش کیا ہے وہ میرے سامنے اس وقت بھی تھی جب جولائی کا پرچہ شائع ہوا ہے اور اگست کی ان تاریخوں میں بھی، جب ملاحظات لکھ رہا تھا لیکن چونکہ قرآن مجید کو "منطوق خداوندی" تسلیم کرنے کے سلسلے میں شبہات و واعتراضات میں خود ہی پیش کر رہا تھا اس لئے کوئی موقع اس مسئلہ پر گفتگو کرنے کا نہ تھا
میں خوش ہوا کہ آپ نے یہ ذکر چھیڑ کر مجھے اظہار خیال کا موقع دیا۔ جس وقت میں طالب علم تھا اسی وقت سے یہ بات میرے کانوں میں پڑی ہوئی ہے کہ قرآن اور حدیث دونوں میں نمایاں ادبی فرق پایا جاتا ہے گویا اس سے مدعا یہ ظاہر کرنا ہے۔ کہ "قرآن" رسول کا کلام نہیں ورنہ وہ بھی "احادیث" کی طرح ہوتا لیکن میں نے کبھی اس کو اہمیت نہیں دی۔ کیونکہ یہ دلیل قرآن مجید کو خدا کا کلام ثابت کرنے کے لئے بالکل ناکافی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن اپنی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے بہت بلند چیز ہے اور یقیناً اس زمانہ کے عربی لٹریچر میں نثر کی اتنی بڑی کتاب ایسا اعلیٰ انداز خطابت رکھنے والی کوئی موجود نہ تھی لیکن یہ دعویٰ کرنا کہ اس قسم کا انداز بیان عربی لٹریچر میں مفقود تھا درست نہیں۔ اُس وقت کے تمام کاہنوں اور بڑے بڑے شعراء و ادربار کے کلام میں اسی قسم کا زور پایا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے اُس وقت اہل عرب کی دھوم تھی اور "سوق عکاظ" کی ادبی صحبتوں اور

قصائد معلقہ کی فصاحت و بلاغت نے لوگوں کو حیران کر رکھا تھا۔

اسی کے ساتھ آپ کو غالباً یہ بھی معلوم ہوگا کہ رسول اللہ قریش کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جو اپنی زباندانی اور فصاحت لسانی کے لحاظ سے بے مثل مانا جاتا تھا اس لئے اگر آپ کی زبان غیر معمولی ادبی محاسن سے مالا مال تھی تو تعجب کی بات نہیں لیکن یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن بھی رسول ہی کا کلام ہے تو اسکی زبان کیوں احادیث کی زبان سے ممیز ہے اس کا جواب زیادہ مشکل نہیں۔

آپ نے اگر نفسیات کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہوگا تو یہ بات آپ کو معلوم ہوگی کہ الفاظ کا تعلق جذبات انسانی سے کس قدر شدید ہے یعنی ہمارے جذبات کی جو نوعیت ہوگی وہ الفاظ اور انداز بیان سے ضرور مترشح ہوگی۔

ہمارا روز کا تجربہ ہے کہ ہمارے جذبات محبت و عداوت اور کیفیات مسرت و غم کی شدت و خفت کے ساتھ ساتھ ہماری زبان بھی بدلتی رہتی ہے۔ ہم اگر ملازم سے کسی معمولی غلطی پر خفا ہوتے ہیں تو اس کو صرف بدتمیز و بیہودہ کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں لیکن اگر غلطی سخت ہوتی ہے تو پھر ہم اپنی برہمی کی شدت کے لحاظ سے دوسرے سخت الفاظ تلاش کرتے ہیں یہاں تک کہ گالی دینے لگتے ہیں اور کبھی کبھی مار بھی بیٹھتے ہیں۔ یہی حال اور تمام جذبات کا ہے

آپ نے اگر کسی بیوہ کو اپنے مرنے والے شوہر یا کسی بڑھیا ماں کو اپنے جوان بیٹے کی میت پر بین کرتے سنا ہے تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جذبات کی شدت زبان میں کس قیامت کا اثر پیدا کر دیتی ہے۔ اس حالت میں جو الفاظ اس بیوہ یا ضعیف

مان کی زبان سے نکلتے ہیں وہ تیر و نشتر ہوتے ہیں جو قیامت تک ان کے منہ سے نہ نکلتے اگر خود ان پر یہ مصیبت نازل نہ ہوتی۔

اب آپ شاعری کی دنیا میں آئیے جس کے ایک فرد آپ بھی ہیں، اور غور کیجئے کہ ہم کیوں ایک ہی شاعر کے کلام میں بعض اشعار پست اور بعض بلند پاتے ہیں میرؔ خدائے تغزل ہے لیکن کیا اس کے تمام اشعار اسی معیار کے ہیں، انیسؔ مرثیہ کا بادشاہ ہے لیکن صرف ذکر بزم و رثار کی حد تک، رزم میں وہ بالکل ناکام نظر آتے ہیں۔ آپ فارسی، عربی اور تمام زبانوں کے شاعروں کے کلام کا مطالعہ کریں گے تو پست و بلند سب طرح کے اشعار پائیں گے۔ پست وہ جو کسی خاص کیفیت کے تحت نہیں لکھے گئے اور بلند وہ جو کسی شدید جذبہ و کیفیت کا نتیجہ ہیں، آپ خود اپنے کلام کو دیکھئے کہ آپ کے بہترین اشعار کون کون سے ہیں اور پھر غور کیجئے کہ کیا ان کے بہتر ہونے کا سبب یہ نہ تھا کہ وہ ایک خاص کیفیت کے زیر اثر لکھے نہیں گئے بلکہ از خود ہوگئے ہیں چنانچہ مشہور ہے کہ اچھا شعر "ہو جاتا ہے" اور بعض ایسے اشعار جو پورے کے پورے بغیر کسی کاوش کے ذہن میں آجاتے ہیں۔ انھیں شاعروں کی زبان میں بھی الہامی کہتے ہیں۔

اب آپ دیکھئے کہ قرآن کی ابتدا کن حالات میں ہوتی ہے۔ قبیلہ قریش میں ایک، نہایت ہی پاکیزہ خصائل و صفات کا انسان پیدا ہوتا ہے اور ہوش سنبھالتے ہی اپنی قوم کو، اپنے عزیزوں کو نہایت مکروہ افعال میں مبتلا دیکھتا ہے۔ اس کا دل بہت کڑھتا ہے لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ وہ کیا کرے، وہ رات کی تنہائیوں

ہیں، ساری دنیا سے کٹ کر پہاڑ کے غاروں میں چھپ چھپ کر اس مسئلہ پر غور کرتا ہے یہاں تک کہ ایک قرن سے زیادہ اسی حال میں گزر جاتا ہے۔ اس نے اپنی زندگی کا تنہا مقصود صرف یہ قرار دے لیا ہے کہ وہ اپنی قوم کی اصلاح کرے گا ان کی بری عادتوں کو ان سے ترک کرائے گا اور جب سوچتے سوچتے اس کے جذبات میں انتہائی شدت پیدا ہو جاتی ہے تو بے اختیار وہ اپنا پیام سنانے لگتا ہے۔

پھر اس پیام کے الفاظ یقیناً اسی شخص کے ہیں اور اسی زبان کے ہیں جو اس وقت وہاں رائج تھی لیکن اس کا بدیع اسلوب بیان، اس کا بڑھا ہوا جوش اور اس کا اثر نتیجہ ہے اس کیفیت کا جو اس کے دل و دماغ میں سالہا سال سے موجیں مار رہی تھیں اور بالآخر ایک چشمہ کی طرح پھوٹ نکلی اسی کا نام وحی ہے، اسی کو الہام کہتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جس نے قرآن کی عبارت کو احادیث کی عبارت سے ممیز کر دیا ہے۔

احادیث کا اکثر حصہ تو ایسا ہے جو یکسر موضوع ہے اور تھوڑا سا حصہ جسے موضوع نہیں کہہ سکتے اس کی حالت بھی یہ ہے کہ اس میں وہ احادیث زیادہ ہیں جو بالمعنٰی روایت کی گئی ہیں، جن میں رسول اللہ کے الفاظ من و عن نقل نہیں کئے گئے صرف چند احادیث ایسی ہیں جن میں ہم رسول اللہ کے الفاظ کی جھلک پاتے ہیں سو ان کی فصاحت و بلاغت کا عالم دیکھئے کیا ہے لیکن چونکہ وہ زیادہ شدید کیفیت کا نتیجہ نہیں ہیں اس لئے آیات قرآنی کی سی خصوصیات

ان میں البتہ نہیں پائی جاتیں۔ قرآن دفعتاً نازل نہیں ہوا ہے بلکہ نجماً نجماً نازل ہوا ہے یعنی جب کبھی رسول اللہ پر اس کیفیت کا غلبہ ہو جاتا تھا تو چند آیات آپ کی زبان سے نکل جاتی تھیں یہاں تک کہ رفتہ رفتہ پوری ایک کتاب مرتب ہو گئی جسے اب ہم قرآن مجید کے اصطلاحی نام سے موسوم کرتے ہیں۔

اسلام اور کنیزیں

(جناب وحید بخش صاحب بی اے، رمضان پور۔ بدایوں)

کیا اسلام مال غنیمت میں ہاتھ آئی ہوئی کنیزوں کے ساتھ بغیر نکاح ہم بستری کی اجازت دیتا ہے، اگر ایسا ہے تو کیا یہ فعل اسلام جیسے مذہب کے شایان شان ہے۔ میرے نزدیک یہ حرکت مذہبی نقطۂ نظر کے علاوہ انسانیت کے نزدیک انتہائی مذموم شمار کئے جانے کے قابل ہے

وان خفتم الا تقسطوا فی الیتامیٰ فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ وثلٰث وربٰع، فان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ او ما ملکت ایمانکم

اگر تم ڈرتے ہو کہ یتیموں کے باب میں (تم اپنی اولاد کی طرح) مساوات نہ برت سکو گے تو تم اپنی پسند کی ہوئی عورتوں (یعنی ان یتیموں کی ماؤں اور شہیدوں کی بیواؤں) میں سے دو دو تین تین چار چار تک شادی کر لو۔ لیکن اگر تم ان کے درمیان عدل نہ قائم رکھ سکو تو پھر ایک ہی عورت سے شادی کر و۔

آپ نے دیکھا کہ اس آیت میں مال غنیمت کی حیثیت سے حاصل کی ہوئی کنیزوں کے ساتھ نکاح کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی سورہ نساء میں آگے چل کر بتایا گیا ہے کہ کن کن

ورتوں سے نکاح ناجائز ہے اور یہ فہرست اس آیت پر ختم ہوتی ہے۔

والمحصنات من النساء الا ما ملکت ایمانکم

یعنی فلاں فلاں عورتوں کے سلسلے میں شادی شدہ عورتیں تم پر حرام ہیں مگر وہ عورتیں جن کو تم نے مال غنیمت کے طور پر حاصل کیا ہے۔

اس حکم کے نازل ہونے کا سبب یہ تھا کہ جنگ میں بہت سی ایسی عورتیں بھی ہاتھ آتی تھیں جو شادی شدہ ہوتی تھیں چونکہ شادی شدہ عورتوں سے عام طور پر نکاح کی اجازت نہ تھی اس لئے خیال ہوا کہ غنیمت میں آئی ہوئی منکوحہ عورتوں سے بھی نکاح نہ کرنا چاہئے لیکن اس آیت سے ان کو محصنات کے زمرہ سے خارج کر دیا گیا اور ان سے شادی کی اجازت دے دی گئی۔

آپ نے دیکھا کہ یہاں بھی جنگ میں حاصل کی ہوئی عورتوں سے نکاح کا ذکر پایا جاتا ہے۔

سورۂ نور میں ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

"وانکحوا الایامیٰ منکم والصالحین من عبادکم وامائکم"

(جہاں تک ممکن ہو) ان سے نکاح کرو جو تنہا ہیں (یعنی جن کی شادی نہیں ہوئی ہے یا جن کے بیوی یا شوہر نہیں) اور ان لونڈی غلاموں سے نکاح کرو جو موزوں ہوں۔

اس آیت میں عام لونڈی غلاموں سے بھی نکاح کی اجازت دی گئی ہے چہ جائیکہ قیدی عورتیں جو ان سے مرتبہ میں کہیں بلند ہیں۔

سورۂ مومنون کی بعض ابتدائی آیتیں ایسی ہیں جن سے ممکن ہے بعض کو یہ خیال پیدا ہو کہ قیدی عورتوں سے بغیر نکاح مقاربت جائز ہے۔ آیات یہ ہیں:۔

قد افلح المومنون، الذین ہم فی صلاتہم خاشعون، والذین ہم عن اللغو معرضون، والذین ہم للزکوٰۃ فاعلون، وہم لفروجہم حافظون، الا علیٰ ازواجہم او ما ملکت ایمانہم۔

یعنی وہ لوگ واقعی اچھے مسلمان ہیں جو خشوع وخضوع کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں جو لغو باتوں سے بچتے ہیں جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور جو اپنی شرمگاہوں کی اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے علاوہ غیر عورتوں سے حفاظت کرتے ہیں۔

یہ آیتیں مکہ میں نازل ہوئی تھیں اور ان میں لونڈیوں سے مقاربت کی اجازت دی گئی ہے لیکن اس شرط کے ساتھ جو سورۂ نسآء کی مدنی آیتوں میں مذکور ہے اور اگر سورۂ نسآ اور سورۂ مومنون کی آیتوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ سمجھا جائے تو بھی سورۂ مومنون کی موخرالذکر آیتوں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ لونڈیوں سے بغیر نکاح کے مقاربت کی اجازت دی گئی ہے۔

بہرحال میری رائے میں اسلام نے کبھی کنیزوں کے ساتھ بغیر نکاح کے ہم بستری کی اجازت نہیں دی۔

تمام شد

مطبوعہ مختار پرنٹنگ ورکس لکھنؤ
۱۹۴۹ء